عورت

اسلامی معاشرے میں

مولانا سیّد جلال الدین عمری

عورت ـــ اسلامی معاشرے میں

فہرست مضامین



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

عورت نصف انسانیت ہے۔ مرد انسانیت کے ایک حصہ کی ترجمانی کرتا ہے تو دوسرے حصہ کی ترجمانی عورت کرتی ہے۔ عورت کو نظر انداز کر کے نوعِ انسانی کے لیے جو بھی پروگرام بنے گا وہ ناقص اور ادھورا ہوگا۔ ہم ایسی کسی سوسائٹی کا تصور نہیں کر سکتے جو تنہا مردوں پر مشتمل ہو اور جس میں عورت کی ضرورت نہ ہو۔ دونوں ایک دوسرے کے یکساں محتاج ہیں۔ نہ عورت، مرد سے مستغنی ہوسکتی ہے اور نہ مرد، عورت سے بے نیاز۔ ان کے احتیاج کی نوعیت سماجی و معاشرتی بھی ہے اور جنسی ونفسیاتی بھی۔ ایک طرف اجتماعی زندگی ان سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ قدم سے قدم اور شانہ سے شانہ ملا کر کام کریں، دوسری طرف جنسی تقاضے ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے دامن میں سکون اور اطمینان تلاش کریں۔

اجتماعی زندگی اس وقت ترقی کی منزلیں طے کرتی ہے، جب کہ مرد اور عورت دونوں کا سیاسی وسماجی رشتہ بھی ٹھیک ہو اور جنسی تعلق بھی صحیح ہو۔ مرد کی سعی و جہد میں جو خلا رہ جائے اس کو عورت پُر کرے اور عورت کی دوڑ دھوپ میں جو نقص اور کمی ہو مرد اس کو پورا کرے۔ اسی طرح جنسی تعلق کو اپنے فطری حد میں رہنے دیا جائے اور لذت کوشی کا ذریعہ نہ سمجھ لیا جائے۔

مرد اور عورت کے سماجی و معاشرتی رشتوں میں عدم توازن اور جنسی تعلقات میں بے اعتدالی ہو تو معاشرہ زوال اور انحطاط کی طرف بڑھنے لگتا ہے۔ سماجی رشتوں

میں توازن نہ ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اجتماعی زندگی کے بعض گوشے خالی اور ویران ہونے لگتے ہیں اور بعض گوشوں پر ضرورت سے زیادہ قوت اور توانائی صرف ہوتی رہتی ہے۔ یہ دونوں ہی باتیں معاشرہ کے لیے تباہ کن ہوتی ہیں۔اسی طرح جنسی تعلق میں بے اعتدالی سے سوسائٹی یا تو بے راہ روی کا شکار ہوگی یا تجرد کی طرف مائل ہوگی۔ اب تک کی تاریخ بتاتی ہے کہ جن قوموں میں جنسی آوارگی عام ہوئی وہ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکیں اور تجرد پسندی نے تو کسی تہذیب کو وجود ہی میں آنے نہیں دیا۔

موجودہ تہذیب، عورت اور مرد کے درمیان سماجی روابط قائم کرنے میں بھی ناکام ہے اور جنسی مسئلہ حل کرنے میں بھی۔ اس نے عورت اور مرد کا سماجی رشتہ متعین کرنے میں غلطی یہ کی کہ عورت کو اس کے حقیقی مقام سے ہٹا کر مرد کی صف میں کھڑا کردیا۔ چناں چہ وہ مرد کے دائرے میں تو تگ و دو کرتی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اس میدان سے غائب ہے جس کے لیے فطرت نے اس کی تخلیق کی تھی۔ جنسی جذبات کو موجودہ تہذیب نے اس قدر اُبھارا ہے کہ انسان کے دل و دماغ پر ان کا مکمل غلبہ ہوگیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ٹھوس کاموں سے وہ دلچسپی اور توجہ نہیں رہی جو فی الواقع ہونی چاہیے۔ اس کی جگہ لذت پسندی کا رجحان فروغ پا رہا ہے۔

موجودہ تمدنی و معاشرتی حالات پر غور وفکر کرنے والا ہر انسان اس حقیقت کے اعتراف پر مجبور ہے کہ عورت اور مرد کے غلط رشتہ نے موجودہ تہذیب کی بنیادیں ہلا دی ہیں، اور انسان کو ایک ایسے مقام پر کھڑا کر دیا ہے جہاں عیش وعشرت کے ہزار سامان کے باوجود وہ سکون اور چین سے محروم ہے۔

یہ حالات ہیں، جن میں اسلامی معاشرہ میں عورت کا تعارف کرایا گیا ہے۔ یہ وقت کے سماجی نقشہ میں کوئی پیوند کاری نہیں ہے، بلکہ یہ اس دور کے لیے ایک نیا اور مختلف نقشہ ہے۔ چاہے دنیا اس کو قبول کرے یا نہ کرے، لیکن ہمارا یقین ہے کہ صرف اسلامی معاشرہ نے عورت اور مرد کے سماجی و جنسی تعلقات کے لیے صحیح بنیادیں فراہم کی

ہیں۔ ان بنیادوں پر جو تعلقات استوار کیے جائیں گے وہ کامیاب ہوں گے۔ ان کے علاوہ جس اساس پر بھی یہ تعلقات قائم ہوں گے ان کی ناکامی یقینی ہے۔

جو شخص اسلامی معاشرہ میں عورت کی سیاسی وتمدنی اور تہذیبی و معاشرتی حیثیت سمجھنا چاہے، ان شاء اللہ وہ کتاب میں قابل اطمینان حد تک مواد پائے گا۔ کوشش کی گئی ہے کہ جو بات بھی کہی جائے قرآن و حدیث کی روشنی میں کہی جائے اور تحقیق و استناد کے ساتھ کہی جائے۔ کتاب میں بعض مباحث ایسے بھی ہیں، جن میں قرآن و حدیث کے منصوص احکام اور واضح اور قطعی تعلیمات نہیں ہیں۔ ان مباحث میں فقہ و کلام سے مدد لی گئی ہے، کیوں کہ یہ اس امت کے ان بہترین دماغوں کا حاصل ہے، جن کی زندگیاں کتاب و سنت کے رموز و اسرار سمجھنے کے لیے وقف تھیں۔ اس لیے بلا مبالغہ یہ علمی سرمایہ اس قابل ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے۔ لیکن اس کا مرتبہ کتاب وسنت کے بعد ہی ہوگا۔ چناں چہ جو رائے یا خیال قرآن و حدیث کی اصولی تعلیمات اور ان کی روح کے منافی محسوس ہوئے ہم نے پوری سنجیدگی کے ساتھ اس سے اختلاف کیا ہے اور اپنی رائے، دلائل کے ساتھ پیش کردی ہے، لیکن خود ہماری رائے پر جرح و تنقید کی بہرحال گنجائش ہے۔ قلم سے یہ الفاظ نکل رہے ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ دل ہر علمی تنقید کے استقبال کے لیے کھلا ہوا ہے۔

جلال الدین

۳۰؍جنوری ۱۹۶۰ء

طبعِ جدید

نصف صدی سے بھی زیادہ عرصہ گزرا جب اس عاجز نے ۱۹۵۶ء میں عورت سے متعلق اسلام کی تعلیم کا مطالعہ شروع کیا، تو ہماری زبان میں اس موضوع پر کوئی قابل ذکر کتاب نہیں تھی یا میرے علم میں نہیں تھی۔ عربی میں بعض نئے اصحابِ علم نے اس موضوع کو اپنایا اور ان کی تحریریں موجود تھیں، لیکن وسائل کی کمی کے باعث ان تک میری رسائی نہیں تھی۔ اس کا ایک طرح سے فائدہ ہی ہوا۔ میں نے براہِ راست قرآن مجید اور حدیث شریف کی روشنی میں اس کی طرف توجہ کی اور اس سے متعلق اسلامیات کا جو قدیم علمی ذخیرہ میسر تھا وہ بھی پیش نظر رہا۔ اس کا آغاز میں نے ۱۹۵۶ء میں کیا اور اس سلسلے کے مضامین ماہ نامہ زندگی رام پور میں ۱۹۵۷ء–۱۹۵۸ء میں شائع ہونے شروع ہوئے۔ دسمبر ۱۹۶۰ء میں اس کی تکمیل ہوئی۔

اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو بڑی پذیرائی عطا فرمائی۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے اصحاب نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔ مرکزی مکتبہ اسلامی اور مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز سے اس کے اب تک تیرہ ایڈیشن نکل چکے ہیں۔ پاکستان میں اس کی اشاعت اس سے بھی بڑے پیمانہ پر ہوئی ہے اور اس سے زیادہ ایڈیشن سامنے آچکے ہیں۔ اس کتاب کا بنگلہ دیش سے بنگلہ زبان میں ترجمہ شائع ہوا ہے۔ ایک صاحب نے کتاب کے بعض حصوں کو حذف کرکے اپنے نام سے اس کا انگریزی ترجمہ

شائع کر دیا۔ اس سرقہ کی کس سے شکایت کی جائے؟ ایک اور صاحب نے تلگو میں اس کا خلاصہ اپنے نام سے بڑے اطمینان سے شائع کیا اور اس میں کوئی قباحت بھی نہیں محسوس کی۔ ان حضرات کے حق میں دعا ہی کی جاسکتی ہے۔

اس پوری مدت میں کتاب پر نظر ثانی کی نوبت نہیں آئی۔ اب پچاس برس بعد، اللہ تعالیٰ نے یہ موقع عنایت فرمایا ہے۔ میں نے پوری کتاب پر نظر ڈالی ہے۔ اس کے مباحث کو بہتر انداز میں مرتب کیا ہے، اس موضوع سے متعلق بعض تحریریں رسائل میں چھپ چکی تھیں ان کا اضافہ کیا ہے، زبان و بیان کے لحاظ سے بھی اسے بہتر بنانے کی کوشش کی ہے۔

نظر ثانی میں ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ جس وقت یہ کتاب زیر ترتیب تھی اس کے مآخذ کے قدیم ایڈیشن میرے پیش نظر تھے۔ اب وہ اعلیٰ معیار اور نئی تحقیق کے ساتھ طبع ہو چکے ہیں۔ اس وقت ان میں سے جو نئے ایڈیشن دست یاب ہو سکے حوالے ان کے مطابق دیے جائیں۔ یہ ایک محنت طلب کام تھا۔ میں برادرم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی اور عزیزم سراج احمد فلاحی کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس کے لیے خاصی زحمت برداشت کی۔ اس کے باوجود بعض مآخذ کے نئے ایڈیشن نہیں مل سکے، اس لیے قدیم حوالے باقی رکھے گئے ہیں۔ پروف ریڈنگ میں بھی ان حضرات سے بڑی مدد ملی۔ برادرم ڈاکٹر محمد رضی الاسلام ندوی نے اس کی کتابیات بھی الگ سے مرتب کی ہے، جو سابقہ ایڈیشنوں میں نہیں تھی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ دونوں عزیزوں کو اس خدمت اور تعاون کا بہترین اجر عطا فرمائے۔

اس موضوع پر میری ایک دوسری کتاب '**عورت اور اسلام**' کے عنوان سے کافی پہلے سے شائع ہو رہی ہے۔ اس میں اسلام میں عورت کی حیثیت اور اس کی خدمات کے بعض گوشوں کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں ان

کو حذف یا مختصر کر دیا گیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں ایک دوسرے کی تکمیل کرتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان کوششوں کو قبول فرمائے، اس کے بندوں کو ان سے زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے۔ اور اس عاجز کے لیے ذخیرۂ آخرت بنائے۔

جلال الدین
۲۱/ دسمبر ۲۰۱۰

حرفِ چند

مرد اور عورت کے تعلق اور ان کے حقوق و فرائض کا مسئلہ سماج کا بہت ہی نازک اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ اس کے متوازن حل ہی پر معاشرہ کی صحیح خطوط پر تعمیر ہوسکتی ہے، لیکن اس کے حل کرنے میں ہمیشہ بڑی بے اعتدالیاں ہوتی رہی ہیں اور سماج کو اس کا نقصان برداشت کرنا پڑا ہے۔

مرد کو عام طور پر تمام حقوق و اختیارات حاصل رہے ہیں۔ وہ 'مالک الکل' تھا۔ گھر اور خاندان سے لے کر حکومت اور ریاست تک ہر شعبۂ حیات پر اسی کا قبضہ تھا۔ عورت اس کی اطاعت اور فرماں برداری کرتی تھی۔ اس کا الگ سے کوئی وجود نہیں تھا۔ سماج میں ہر طرف اس کے فرائض اور ذمے داریوں کا ذکر ہوتا، اس کی یاد دہانی ہوتی رہتی اور ان کی خلاف ورزی پر اس کا مواخذہ بھی ہوتا۔ بسا اوقات اس کے ساتھ فطری ہم دردی بھی دیکھی جاتی، لیکن اس کے تسلیم شدہ حقوق نہیں تھے، اس لیے وہ ان کا مطالبہ نہیں کرسکتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس کی حیثیت ایک 'تابع مہمل' کی ہوکر رہ گئی، اس کی صلاحیتیں فروغ نہ پاسکیں اور وہ سماج میں اپنا کردار ادا کرنے کے قابل نہیں رہی۔

اسلام کے نزدیک مرد اور عورت دونوں اپنا مستقل اور الگ وجود رکھتے ہیں۔ عورت کی شخصیت مرد کی شخصیت میں کسی بھی مرحلہ میں گم نہیں ہو جاتی۔ وہ باپ دادا یا شوہر یا نرینہ اولاد کا ضمیمہ نہیں ہے، بلکہ اس کی اپنی ذمے داریاں ہیں اور وہ اس کے

ساتھ حقوق و اختیارات بھی رکھتی ہے۔ وہ مرد کی طرح قانونِ شریعت اور حدودِ اخلاق کی پابند ہے اور کل قیامت کے روز اپنے اعمال کی جواب دہ ہے۔ مرد اور عورت دونوں کے لیے اس کا ایک ہی ضابطہ ہے، اسی کو اللہ کے پیغمبر اپنی تعلیمات کے ذریعے پیش کرتے رہے ہیں۔

اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰىۙ وَ اِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰىٓۙ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰىۙ وَ اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰىۙ وَ اَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰىۙ (النجم:۳۶-۴۱)

کیا اس کو اس کی خبر نہیں جو موسیٰ کے صحیفوں میں بیان ہوئی ہے۔ اور ابراہیم کے صحیفوں میں بھی، جس نے احکامِ الٰہی پوری طرح بجا لائے، کہ کوئی شخص کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور انسان کو وہی ملے گا، جس کے لیے اس نے سعی کی اور اس کی سعی و جہد جلد ہی سامنے آئے گی اور پھر پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

موجودہ دور میں انسانی حقوق، فرد کی آزادی، عدل و انصاف اور مساوات کا ہر طرف چرچا ہے۔ اس پہلو سے مرد کی ظلم و زیادتی اور عورت کی مظلومیت کو نمایاں کیا جاتا ہے۔ عورت کو مرد کی قید و بند سے آزاد کرنے، اس کی چیرہ دستی سے اسے بچانے اور مساوی حقوق فراہم کرنے کے لیے قوانین وضع ہوتے ہیں اور سماجی سطح پر مختلف قسم کی کوششیں بھی ہوتی ہیں، لیکن اس کے پیچھے مرد کے رویہ کے خلاف ایک طرح کا ردّعمل پایا جاتا ہے۔ جب بھی کسی مسئلہ کو ایک فریق کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے گا تو اعتدال اور توازن ختم ہوجائے گا۔ آدمی اس کا وکیل اور فریق ثانی کا حریف بن جائے گا۔ مرد اور عورت ایک دوسرے کے حریف نہیں بلکہ معاون اور مددگار ہیں۔ ان کے مسائل پر اسی پہلو سے غور ہونا چاہیے۔

وقت کے غالب نظریات سے ہر ایک متاثر ہوتا ہے۔ بہت کم لوگ اس سے اوپر اٹھ کر سوچ پاتے ہیں۔ بعض حضرات کے دل و دماغ پر اس قدر مرعوبیت چھا جاتی ہے کہ وہ انھیں مسلمہ حقائق کا درجہ دینے لگتے ہیں۔ ان کو اساس مان کر ہر مسئلہ پر غور

کرتے ہیں۔ اس ذہن کے اسلامی مفکرین کی بھی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اسلام کو موجودہ دور کے نظریات سے ہم آہنگ کرکے دکھائیں۔ جن مسائل میں یہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے ان میں مساواتِ مرد و زن کا مغربی تصور بھی ہے۔ اسلام بھی مساوات کا قائل ہے، لیکن اسلام اور مغرب کے تصورِ مساوات میں فرق ہے۔ وہ اسے فراموش کردیتے ہیں۔ اسی طرح مغرب عورت کے لیے جس سیاسی و تمدنی آزادی کا دعوے دار ہے وہ اس آزادی سے مختلف ہے جو اسلام نے عطا کی ہے۔ اسلام عورت کو جس سمت میں لے جانا چاہتا ہے مغرب بالکل اس کی مخالف سمت میں اس کی راہ نمائی کرتا ہے۔ اسلام گھر کو اس کی سعی و جہد کا مرکز قرار دیتا ہے اور یہ اس کو گھر سے بغاوت پر آمادہ کرتے ہیں۔ اسلام نے عورت کے لیے جو نظامِ عمل تجویز کیا ہے وہ مغرب کی نگاہ میں اس کی توہین اور ذلت کا وثیقہ ہے۔ اس طرح عورت کے متعلق اسلام اور مغربی فکر میں بڑا تضاد ہے۔

اس ذہن کے افراد جب دیکھتے ہیں کہ کسی مسئلہ میں اسلام کی واضح تعلیمات ان کا ساتھ نہیں دے رہی ہیں تو انھیں اس بات کی تلاش ہوتی ہے کہ قرآن و حدیث کا کوئی اشارہ یا اسلامی تاریخ کا کوئی واقعہ ہی مل جائے، جس سے وہ اسلام اور مغرب کی ہم آہنگی ثابت کرسکیں، حالاں کہ قرآن و حدیث کے اشاروں کو ان کی عام تعلیمات ہی کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے اور اسلامی تاریخ کے کسی واقعہ کی ایسی توجیہ ہونی چاہیے جو معاشرے کے عمومی رویہ سے مطابقت رکھتی ہو۔ اسے ایک مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے جنگ جمل میں شرکت کی۔ ان حضرات کے نزدیک یہ اس بات کی دلیل ہے کہ سیاست میں مرد کی طرح عورت بھی حصہ لے سکتی ہے۔ اور اس میدان میں قیادت کا بھی اسے حق حاصل ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ بات اسلام کی دوسری تعلیمات سے مطابقت رکھتی ہے، کیا اسلامی تاریخ اس کی تائید کرتی ہے، کیا دورِ اوّل میں خواتین کا یہ کردار رہا ہے؟ یہ وہ بنیادی سوالات ہیں جو اس واقعہ کے سلسلے میں پیدا

ہوتے ہیں۔ انھیں نظر انداز کر کے اس سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا۔

اس طرح کی اور بھی مثالیں موجود ہیں جن میں انفرادی واقعات کو عمومی شکل دے دی جاتی ہے اور اسے اسلام کا موقف قرار دیا جاتا ہے، جب کہ اسلامی معاشرے کا مجموعی طرزِ عمل اس سے مختلف تصویر پیش کرتا ہے۔

اس کتاب میں یہ کوشش رہی ہے کہ اسلام نے عورت کو جو مستقل بالذات تشخص اور انفرادیت عطا کی ہے، اسے سعی و جہد اور حرکت وعمل کی جو آزادی فراہم کی ہے، گھر اور اس سے باہر اس کی جو سرگرمیاں رہی ہیں، اس نے جو علمی اور عملی خدمات انجام دی ہیں اور ان تمام امور میں وہ جس طرح اسلامی حدود کی پابند رہی ہے اس کو تفصیل سے پیش کیا جائے۔ جو واقعات انفرادی نوعیت کے ہیں اور جو بہ ظاہر اسلامی معاشرے اور اس کے مزاج سے ہم آہنگ نہیں ہیں ان کا پس منظر واضح ہوجائے۔

اسلام میں عورت کی حیثیت اور مرتبہ و مقام کے متعلق بڑی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔ امید ہے اس کتاب سے وہ کسی حد تک رفع ہوں گی اور اسلام کا موقف زیادہ وضاحت اور تعین کے ساتھ سامنے آسکے گا۔ اللہ تعالیٰ قبول فرمائے۔



عورت

دورِ قدیم اور عہدِ جدید میں

☆ عورت ـــــ دورِ قدیم میں

☆ عورت اور جدید نظریات

عورت ــــــ دورِ قدیم میں

اس وقت روئے زمین کے مختلف حصوں پر تقریباً تین ارب انسان پائے جاتے ہیں[1] اُن کی صدہا زبانیں ہیں،ان کے رہنے سہنے، کھانے پینے، شادی بیاہ اور خوشی اور غم کے بے شمار طریقے ہیں۔سائنس دانوں کے اندازے کے مطابق نوعِ انسانی کی عمر دو لاکھ سال سے زائد ہے۔اس لمبی مدت میں انسان کو کن حالات و مسائل کا سامنا کرنا پڑا، موجودہ حالت تک کن مراحل سے گزر کر اس نے رسائی حاصل کی، کہاں کہاں اس کی آبادیاں تھیں، وہ کتنی قوموں اور قبیلوں میں بٹا ہوا تھا، اس نے کب کس قسم کی صنعت ایجاد کی، کیا اس نے وحشت و بربریت سے تہذیب وتمدن کی طرف ترقی کی یا اس سے پہلے بھی وہ ترقی کے ادوار دیکھ چکا ہے؟ یہ اور اس طرح کے جتنے سوالات ہیں، ان کے بارے میں کوئی قطعی رائے نہیں دی جاسکتی، کیوں کہ انسان اپنے ماضی سے بہت کم واقف ہے، اتنا جتنا کہ کوئی سترّ سالہ بوڑھا اپنی زندگی کے صرف ایک سال کو جانے۔لیکن اس کے باوجود اتنی بات پورے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ انسان کے سفرِ حیات کا آغاز عورت اور مرد کے اتحاد سے ہوا۔اسی سے اس کی نسل بھی پھیلی اور علم و فن، صنعت وحرفت اور تہذیب وتمدن میں بھی ارتقا ہوا۔

عورت اور مرد کے اتحاد کے علاوہ انسانوں کے درمیان جتنے رشتے اور تعلقات ہیں وہ یا تو اسی اتحاد کا نتیجہ ہیں یا خارجی اسباب و حالات نے ان کو پیدا کیا ہے۔اگر یہ

---

[1] یہ کتاب کی تصنیف کے وقت کا ذکر ہے۔اب انسانی آبادی سات ارب تک پہنچ چکی ہے۔

اسباب و حالات مفقود ہوں تو یہ تعلقات بھی وجود میں نہیں آ سکتے۔

ایک ہمسایہ دوسرے ہمسایہ سے محبت کرتا ہے، ایک ساتھی دوسرے ساتھی کو گلے سے لگاتا ہے، ایک مسافر دوسرے مسافر کا ہم خیال ہوتا ہے۔ اسی طرح ایک طالب علم دوسرے طالب علم سے، ایک تاجر دوسرے تاجر سے، ایک پیشہ والا دوسرے ہم پیشہ شخص سے قرب اور یگانگت محسوس کرتا ہے، لیکن جب دونوں کی حیثیت بدل جاتی ہے تو اُن میں دوری اور اجنبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس عورت اور مرد کے اتحاد کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ سماجی تقاضوں یا تمدنی ضروریات کی بنا پر وہ ایک ساتھ رہنے اور مل جل کر کام کرنے لگے ہوں، بلکہ ان کا تعلق اس فطری جذب و کشش کا ظہور ہے جو ان کو جڑے رہنے پر مجبور کرتی ہے۔ اس لیے وہ بغیر کسی خارجی محرک کے ایک دوسرے کی طرف بڑھتے ہیں، حالاں کہ بڑی حد تک ان کی دلچسپیاں مختلف اور ان کے کام کے دائرے ایک دوسرے سے جدا ہیں۔

عورت اپنے خون کے ذریعے نسلِ انسانی کی پرورش تو کرسکتی ہے لیکن ہل چلا کر اپنی معاش فراہم کرنا اور تیر و تفنگ سے دشمن کا مقابلہ کرنا اس کے لیے دشوار ہے، کیوں کہ قدرت نے اس کو آہنی پنجہ اور قوی بازو نہیں عطا کیے ہیں، البتہ وہ اپنے سینہ میں مہر و الفت اور ہم دردی و ایثار کے جذبات رکھتی ہے۔ چناں چہ ہمیشہ بچوں کی دیکھ بھال، گھر کا انتظام، کھانے اور کپڑے کی تیاری عورت کے فرائض رہے ہیں اور جانوروں کا شکار، زراعت، تجارت اور دشمن کی مدافعت مرد نے کی ہے اس لیے کہ وہ طبعاً جفاکش اور محنتی ہے اور مضبوط دست و بازو رکھتا ہے۔

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ عورت اور مرد کی قوتوں اور صلاحیتوں کا یہ فرق تاریخ کے بیشتر ادوار میں عزت اور ذلت کا معیار بن گیا۔ مرد زور اور قوت رکھتا ہے اور ایسے کام بہ آسانی کر گزرتا ہے، جن کو عورت اپنی حدِ استطاعت سے باہر سمجھتی ہے، اس لیے اس کو ارفع و اعلیٰ سمجھ لیا گیا اور اس کے مقابلہ میں عورت کی حیثیت فروتر قرار

پائی۔ کیوں کہ وہ کم زور ہے اور بہت سے معاملات میں مرد کی دست نگر ہے۔ چناں چہ جو ممالک اپنے عدل و انصاف میں مشہور تھے، جہاں شب و روز اخلاق کے درس دیے جاتے تھے اور انسانی حقوق کی تعلیم ہوتی تھی وہاں بھی مرد کی برتری ایک مسلمہ حقیقت تھی اور عورت کو ذلت وحقارت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس کو جانوروں کی طرح خریدا اور بیچا جاتا تھا۔ حتی کہ بعض اوقات اس کو ان حقوق سے بھی محروم رکھا گیا جن سے اس زمین پر سانس لینے والا ہر متنفس بہرہ مند ہے۔

یونان و روم اور عورت

قدیم تاریخ کے متعلق کسی قدر تفصیلی معلومات ہمیں یونانیوں اور رومیوں کے عہد سے ملتی ہیں۔ انھوں نے تہذیب وتمدن اور علوم وفنون میں اس قدر ترقی کی کہ اس سے دوسری تہذیبیں متاثر ہوئیں اور بعض نئے علوم وجود میں آئے، لیکن بایں ہمہ ترقی، ان کے ہاں عورت کا مقام بہت ہی پست تھا۔ وہ اس کو انسانیت پر بار سمجھتے تھے۔ ان کا مقصد ان کے نزدیک سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ خادمہ کی طرح گھر والوں کی خدمت کرتی رہے۔

اہل یونان اپنی معقولیت پسندی کے باوجود عورت کے بارے میں ایسے ایسے تصورات رکھتے تھے جن کو سن کر ہنسی آتی ہے، لیکن ان سے اس بات کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ ان کی نگاہ میں عورت کی کیا قدر و قیمت تھی اور وہ اپنے درمیان اس کو کیا حیثیت دیتے تھے۔ ان کا قول تھا ”آگ سے جل جانے اور سانپ کے ڈسنے کا علاج ممکن ہے، لیکن عورت کے شر کا مداوا محال ہے۔“ نیڈورا نامی ایک عورت کی بابت ان کا عام اعتقاد تھا کہ وہی تمام دنیوی آفات ومصائب کی جڑ ہے۔ ایک یونانی ادیب کہتا ہے:

> ”دو مواقع پر عورت، مرد کے لیے باعث مسرت ہوتی ہے۔ ایک تو شادی کے دن، دوسرے اس کے انتقال کے دن۔“

لیکی نے اپنی کتاب ’تاریخ اخلاق یورپ‘ میں لکھا ہے:

''بہ حیثیت مجموعی، باعصمت یونانی بیوی کا مرتبہ بہ غایت پست تھا۔ اس کی زندگی مدت العمر غلامی میں بسر ہوتی تھی۔ لڑکپن میں اپنے والدین کی، جوانی میں اپنے شوہر کی، بیوگی میں اپنے فرزندوں کی، وراثت میں اس کے مقابلے میں اس کے مرد اعزہ کا حق ہمیشہ راجح سمجھا جاتا تھا۔ طلاق کا حق اسے قانوناً ضرور حاصل تھا تاہم عملاً وہ اس سے بھی کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتی تھی، کیوں کہ عدالت میں اس کا اظہار یونانی ناموسِ حیا کے منافی تھا۔ افلاطون نے بے شبہ مرد اور عورت کی مساوات کا دعویٰ کیا تھا، لیکن یہ تعلیم محض زبانی تھی۔ عملی زندگی اس سے بالکل غیر متاثر رہی۔ ازدواج کا مقصد خالص سیاسی رکھا گیا یعنی یہ کہ اس سے طاقت ور اولاد پیدا ہو جو حفاظتِ ملک کے کام آئے اور اسپارٹا کے قانون میں یہ تصریح موجود تھی کہ مُسن، ضعیف القویٰ شوہروں کو اپنی کمسن بیویاں کسی نوجوان کے حبالۂ عقد میں دے دینا چاہئیں تا کہ فوج میں قوی سپاہیوں کی تعداد میں اضافہ ہو۔''

ــــ اسی مصنف کی زبان سے رومی عورت کا حال سنیے:

''عورت کا مرتبہ رومی قانون نے ایک عرصۂ دراز تک نہایت پست رکھا۔ افسر خاندان جو باپ ہوتا یا شوہر، اسے اپنے بیوی بچوں پر پورا اختیار حاصل تھا اور وہ عورت کو جب چاہے گھر سے نکال سکتا تھا، جہیز یا دلہن کے والد کو نذرانہ دینے کی رسم کچھ بھی نہ تھی اور باپ کو اس قدر اختیار حاصل تھا کہ جہاں چاہے اپنی لڑکی کو بیاہ دے، بلکہ بعض دفعہ تو وہ کی کرائی شادی کو توڑ سکتا تھا۔ زمانۂ مابعد یعنی دورِ تاریخی میں یہ حق باپ کی طرف سے شوہر کی طرف منتقل ہوگیا اور اب اس کے اختیارات یہاں تک وسیع ہوگئے کہ وہ چاہے تو بیوی کو قتل کر سکتا ہے۔ پانچ سو بیس (۵۲۰) سال تک طلاق کا کسی نے نام بھی نہ سنا۔''

غلاموں کی طرح عورت کا مقصد بھی خدمت اور چاکری سمجھا جاتا تھا۔ مرد اسی غرض سے شادی کرتا تھا کہ وہ بیوی سے فائدہ اٹھا سکے گا، وہ کسی عہدہ کی اہل نہیں سمجھی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ کسی معاملہ میں اس کی گواہی تک کا اعتبار نہ تھا۔ رومی سلطنت میں اس کو قانونی طور پر کوئی حق حاصل نہیں تھا البتہ اس کی طبعی کمزوریوں کی بنا پر اس کو بعض

سہولتیں دی گئی تھیں۔

اس میں شک نہیں کہ بعد کے ادوار میں رومیوں نے اس کو حقوق بھی دیے، لیکن اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کو مرد کے مساوی درجہ کبھی نہیں ملا[1]

یورپ اور عورت

یورپ اس وقت مساواتِ مرد و زن کا سب سے بڑا دعوے دار ہے۔ لیکن اسی یورپ میں انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب سے پہلے تک عورت، مرد کے ظلم و ستم کا نشانہ بنی ہوئی تھی اور کوئی ایسا مضبوط قانون نہیں تھا جو مرد کی زیادتیوں کو روکتا۔

انگلستان کے قانون کی رو سے یہ بات طے تھی کہ شادی کے بعد مرد کی طبیعت میں تو کوئی تبدیلی نہیں آتی، البتہ عورت کی شخصیت مرد کی شخصیت کا ایک جز بن جاتی ہے۔ چناں چہ اسی بنا پر یہ اصول تھا کہ شادی سے پہلے عورت کے ذمّہ جو قرض ہوگا وہ مرد ادا کرے گا اور عورت کی جو مال و دولت یا جائداد ہوگی وہ مرد کی ہوجائے گی۔ الّا یہ کہ اپنی جائداد کے سلسلہ میں عورت شادی سے پہلے کوئی معاہدہ کرلے۔

نان نفقہ کا بھی کوئی مناسب قانون نہیں تھا اور نہ عورت کو مرد کے خلاف مقدمہ دائر کرنے کا حق تھا۔ مرد چاہتا تو عورت کو حق وراثت سے محروم کرسکتا تھا، لیکن بیوی کی جائداد کا وہ جائز حق دار سمجھا جاتا تھا۔

عورت کسی بھی قسم کا معاملہ کرنے میں آزاد نہیں تھی۔ وہ اپنے اختیار سے کوئی معاہدہ نہیں کرسکتی تھی، حتیٰ کہ اس کو اس کی بھی اجازت نہیں تھی کہ خود کما کر اپنی ذات پر خرچ کرے اور اپنی پسند سے شادی کرے۔

لڑکیاں ماں باپ کی ملک سمجھی جاتی تھیں وہ جس سے چاہتے شادی کرتے۔ شادی ایک تجارت تھی، جس کے ذریعہ والدین اپنی لڑکیاں لڑکوں کو فروخت کرتے تھے۔

آزادیِ نسواں کا مشہور علم بردار مل (MILL) اپنی کتاب 'محکومیت نسواں' میں لکھتا ہے:

---

[1] روم کے مختلف ادوار میں عورت کے سماجی اور معاشرتی حالات کیا تھے اور ان میں بتدریج کیسے اصلاح ہوئی۔ اس کی تفصیل انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا میں دیکھی جائے۔

> ”تاریخِ یورپ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ باپ اپنی بیٹی کو جہاں چاہتا بیچ ڈالتا تھا اور اس کی مرضی کی کچھ پروا نہ کرتا تھا۔“

دین مسیح کے پھیلنے سے پیشتر مرد مالک الکل کی حیثیت رکھتا تھا۔ عورت کے مقابلہ میں مرد کے لیے نہ کوئی تعزیر تھی نہ کوئی قانون۔ مرد جب چاہتا عورت کو چھوڑ دیتا، لیکن عورت کو کسی حالت میں مرد سے علیحدگی کا اختیار نہ تھا۔ انگلستان کے پرانے قوانین میں مرد کو عورت کا مالک کہا جاتا تھا، بلکہ حقیقتاً وہ اس کا بادشاہ مانا جاتا تھا، یہاں تک کہ شوہر کے قتل کا اقدام قانونی اصطلاح میں بغاوتِ ادنیٰ کہلاتا تھا اور عورت اس کا ارتکاب کرے تو اس کی پاداش میں اس کو جلا دینے کا حکم تھا جو بغاوت کی سزا سے بھی زیادہ ہے۔ اور اب تک انگریزی قوانین میں بہت سے معاملات ایسے ہیں، جن میں عورت گویا مرد کی زرخرید مانی جاتی ہے۔ اب بھی گرجا میں نکاح کے وقت اس سے تمام عمر شوہر کی اطاعت کا عہد لیا جاتا ہے اور عمر بھر قانون کی رو سے وہ اپنا عہد پورا کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ شوہر کی مرضی کے بغیر وہ کچھ نہیں کرسکتی۔ اگر چاہے بھی تو اپنے لیے کوئی جائداد پیدا نہیں کرسکتی اور اگر پیدا کرتی ہے تو وہ سب خود بخود شوہر کی ہوجاتی ہے۔ اس بارے میں انگلستان کا قانون، عورت کی حیثیت اتنی بھی نہیں باقی رہنے دیتا جو اکثر ممالک میں غلاموں کی تھی۔

عرب اور عورت

تہذیب وتمدن کے مراکز میں جب اس صنف نازک کا یہ حال تھا تو اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ تمدن ناآشنا عرب میں وہ کس درجہ بے کس و بے بس رہی ہوگی۔ عورت کے وجود ہی کو عرب باعثِ عار سمجھتے تھے۔ وہ باپ یا شوہر یا نرینہ اولاد کے رحم و کرم پر زندہ رہتی تھی۔ اسے قانوناً کوئی حق حاصل نہ تھا۔[1]

---

[1] اس کی تفصیل ’عورت - اسلامی معاشرے میں‘ کے تحت آرہی ہے۔ ملاحظہ ہو عورت — عرب کے دورِ جاہلیت میں

عورت مذہب کی نظر میں

یونان ہو یا روم، عرب ہو یا عجم، یورپ ہو یا ایشیا ہر جگہ عورت مظلوم ہی رہی ہے۔ اس کی پوری تاریخ مظلومیت کی داستان ہے۔ حد یہ ہے کہ مختلف زمانوں میں خدا کی طرف سے نیکی و شرافت، سیرت و کردار اور عفت و عصمت کی جو تعلیم آتی رہی ہے رفتہ رفتہ اس کا مطلب بھی یہ سمجھا جانے لگا کہ عورت سے تعلق نہ رکھا جائے۔ اس سے کنارہ کشی اور دوری اختیار کی جائے کیوں کہ اس سے ربط و تعلق انسان کو معصیت اور گناہ سے قریب کرتا ہے۔

زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے یہ تصور بڑھتا گیا عورت سے نفرت اور بیزاری میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اس کو شیطان کی ایجنٹ اور معصیت کا دروازہ کہا گیا۔ اس سے تعلق کو منافیِ تقویٰ اور اس سے احتراز کو خدا ترسی کی دلیل سمجھ لیا گیا۔

ان تصورات کا اثر لازماً عورت کی اجتماعی و معاشرتی زندگی پر بھی پڑا۔ اس کو سوسائٹی میں مرد کی طرح عزت و احترام کا مقام حاصل نہ تھا۔ اس کے وہ حقوق نہیں تھے جو مرد کے تھے۔ اس کی حیثیت ایک ایسے گناہ گار اور مجرم کی تھی جسے حقارت اور ذلت سے دیکھا جاتا ہے۔

یہودیت اور عورت

یہودیت کا شمار دنیا کے ان مذاہب میں ہوتا ہے، جنھوں نے صرف چند عقائد و نظریات ہی نہیں پیش کیے، بلکہ ان کی بنیاد پر زندگی کے عملی مسائل سے بھی تفصیلی بحث کی ہے۔ اس سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ عورت کے بارے میں حقیقت پسندانہ موقف اختیار کرے گا، لیکن وہ ہمارے سامنے مرد اور عورت کے درمیان زبردست فرق کے ساتھ آتا ہے۔ وہ یہ تصور دیتا ہے کہ مرد نیک سرشت اور نیک کردار ہے اور عورت بدطینت اور مکاّر۔ نسلِ انسانی کے پہلے فرد حضرت آدم علیہ السلام جنت میں عیش و

راحت کی زندگی گزار رہے تھے، اس لیے کہ وہ خدا کے فرماں بردار تھے، لیکن ان کی بیوی حوّا نے انھیں سب سے پہلے خدا کی نافرمانی پر اکسایا اور ان کو ایک ایسا پھل کھلایا جس کے کھانے سے خدا نے انھیں روکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی نعمتوں سے محروم کردیے گئے اور ان کو مشقت اور تکلیف کی زندگی بسر کرنی پڑی۔

اس کی دو سزائیں حوا کو دی گئیں۔ ایک یہ کہ حمل اور ولادت کی تکلیف میں مبتلا کیا گیا۔ اب وہ اس کے بعد ہی بچہ پیدا کرسکے گی۔ دوسری سزا یہ دی گئی کہ ہمیشہ کے لیے مرد کا اقتدار اس پر قائم کردیا گیا (پیدائش: باب ۳)۔

اس فلسفہ کا نتیجہ ہے کہ یہودی شریعت میں مرد کا اقتدار و تصرف اس حد تک بڑھا ہوا ہے کہ اگر کوئی عورت خداوند کی منّت مانے اور اپنی نوجوانی کے دنوں میں اپنے باپ کے گھر ہوتے ہوئے اپنے اوپر کوئی فرض ٹھہرائے اور اس کا باپ جس دن یہ سنے اسی دن اسے منع کرے تو اس کی کوئی منّت یا کوئی فرض جو اس نے اپنے اوپر ٹھہرایا ہے، قائم نہیں رہے گا اور خداوند اس عورت کو معذور رکھے گا، کیوں کہ اس کے باپ نے اسے اجازت نہیں دی اور اگر کسی آدمی سے اس کی نسبت ہوجائے جب کہ اس کی منّتیں یا منہ کی نکلی ہوئی بات جو اس نے اپنے اوپر فرض ٹھہرائی ہے، اب تک پوری نہ ہوئی ہو اور اس کا آدمی یہ حال سن کر اس دن اس سے کچھ نہ کہے تو اس کی منّتیں قائم رہیں گی۔ لیکن اس کا آدمی جس دن یہ سب سنے اسی دن اسے منع کرے تو اس نے گویا اس عورت کی منت کو اور اس کے منہ کی نکلی ہوئی بات کو جو اس نے اپنے اوپر فرض ٹھہرائی تھی توڑ دیا اور خداوند اس عورت کو معذور رکھے گا۔ اگر اس نے اپنے شوہر کے گھر ہوتے ہوئے کچھ منّت مانی یا قسم کھا کر اپنے اوپر فرض ٹھہرایا اور اس کے شوہر نے جس دن یہ سب سنا اسی دن سے اسے باطل ٹھہرایا ہو تو جو کچھ اس عورت کے منہ سے اس کی منتوں اور ٹھہرائے ہوئے فرضوں کے بارے میں نکلا ہے وہ قائم نہیں رہے گا۔ اس کے شوہر نے ان کو توڑ ڈالا ہے اور خداوند اس عورت کو معذور رکھے گا۔ اس کی ہر منت کو اور اپنی جان کو رکھ دینے

کی ہر قسم کو اس کا شوہر چاہے تو قائم رکھے گا یا اگر چاہے تو باطل ٹھہرائے ــ شوہر اور بیوی کے درمیان اور باپ بیٹی کے درمیان جب بیٹی جوانی کے ایام میں باپ کے گھر ہو، اِن ہی آئین کا حکم خداوند نے موسیٰ کو دیا" (گنتی، باب:۳۰)۔

حتّٰی کہ یہودی قانون کی رو سے مرد وارث کی موجودگی میں عورت وراثت سے محروم ہو جاتی تھی۔ اس طرح عورت کو دوسری شادی کا بھی حق نہیں تھا (انسائیکلو پیڈیا آف برٹانیکا)۔

عیسائیت اور عورت

عورت کے ساتھ عیسائیت کی روش تو اور بھی زیادہ ناپسندیدہ رہی ہے۔ اس نے اس مظلوم صنف کو جس قدر پستی میں پھینکا جاسکتا تھا، پھینک دیا۔ عورت کے بارے میں عیسائیت کے جذبات کا اندازہ طرطولین کے ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے:

"عورتو! تم نہیں جانتیں کہ تم میں سے ہر ایک حوّا ہے۔ خدا کا فتویٰ جو تمھاری جنس پر تھا وہ اب بھی تم میں موجود، تو پھر جرم بھی تم میں موجود ہوگا۔ تم تو شیطان کا دروازہ ہو۔ تم ہی نے آسانی سے خدا کی تصویر یعنی مرد کو ضائع کیا۔"

سینٹ پال اپنے ایک خط میں لکھتا ہے:

"عورت کو چپ چاپ کمال تابعداری سے سیکھنا چاہیے۔ اور میں اجازت نہیں دیتا کہ عورت سکھائے یا مرد پر حکم چلائے بلکہ چپ چاپ رہے، کیوں کہ پہلے آدم بنایا گیا اس کے بعد حوّا اور آدم نے فریب نہیں کھایا بلکہ عورت فریب کھا کر گناہ میں پڑگئی۔" (تیمتھیُس کے نام پولس کا پہلا خط باب ۲)

ایک دوسرے خط میں لکھا ہے:

"پس میں تمھیں آگاہ کرنا چاہتا ہوں کہ ہر مرد کا سر مسیح اور عورت کا سر مرد اور مسیح کا سر خدا ہے۔ وہ (مرد) خدا کی صورت اور اس کا جلال ہے، مگر عورت، مرد کا جلال ہے، اس لیے کہ مرد عورت سے نہیں بلکہ عورت مرد سے ہے اور

مرد عورت کے لیے نہیں بلکہ عورت مرد کے لیے پیدا ہوئی۔ پس فرشتوں کے سبب سے عورت کو چاہیے کہ اپنے سر پر محکوم ہونے کی علامت رکھے۔"
(پولس رسول کا پہلا خط کرنتھیوں کے نام باب ۱۱)

ہندومت اور عورت[۱]

ہندستان ایک مذہبی ملک سمجھا جاتا ہے کیوں کہ اس کی مذہبی حیثیت ہمیشہ دوسری حیثیتوں پر غالب رہی ہے۔ یہاں بھی عورت کو غلامی اور محکومی کی زندگی سے نجات نہیں ملی۔ ہندوستان کے مشہور مقنّن منوراج نے عورت کے بارے میں کہا ہے کہ:

"عورت لڑکپن میں اپنے باپ کے اختیار میں رہے اور جوانی میں شوہر کے اختیار میں اور بیوہ ہونے کے بعد اپنے بیٹوں کے اختیار میں رہے، خود مختار ہوکر کبھی نہ رہے۔" منوسمرتی ۵/۷/۱۴

"عورت خواہ نا بالغ ہو خواہ جوان ہو خواہ بوڑھی ہو، گھر میں کوئی کام خود مختاری سے نہ کرے۔" منوسمرتی ۵/۷/۱۴

"عورت کے لیے قربانی اور برت کرنا گناہ ہے، صرف شوہر کی خدمت کرنا چاہیے، عورت کو چاہیے کہ اپنے شوہر کے مرنے کے بعد دوسرے شوہر کا نام بھی نہ لیوے، کم خوراکی کے ساتھ اپنی زندگی کے دن پورے کرے۔"
(۱۵۵، ۱۵۷، ب ۵)

"جھوٹ بولنا عورتوں کا ذاتی خاصہ ہے۔" (ب ۹/۱۷)

چانکیہ برہمن جس نے منو جی مہاراج کی منوسمرتی کو حشو وزائد سے پاک کیا اور جس کی تعلیمات ایک عرصہ تک حکومت کا دستور العمل رہیں، وہ عورت کے متعلق حسبِ ذیل خیالات کا اظہار کرتا ہے۔

"دریا، مسلح سپاہی، پنجے اور سینگ رکھنے والے جانور، بادشاہ اور عورت پر

---

[۱] ہندو مذہب کے بارے میں یہ معلومات مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی کی کتاب 'نظامِ سلطنت' سے ماخوذ ہیں۔

بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔" (چانکیہ نیتی ب ۱/ ۱۵)

"جھوٹ بولنا، بغیر سوچے کام کرنا، فریب، حماقت، طمع، ناپاکی، بے رحمی یہ عورت کے جبلی عیب ہیں۔" (ب ۲)

"شہزادوں سے تہذیب اخلاق، عالموں سے شیریں کلامی، قمار بازوں سے دروغ گوئی اور عورتوں سے مکاری سیکھنی چاہیے۔" (ب ۸/ ۱۲)

"آگ، پانی، جاہل مطلق، سانپ، خاندانِ شاہی اور عورت۔ یہ سب موجب ہلاکت ہوتے ہیں، ان سے ہمیشہ ہوشیار رہنا چاہیے۔" (ب ۱۴/ ۱۲)

"دوست، خدمت گار اور عورت مفلس آدمی کو چھوڑ دیتے ہیں اور جب وہ دولت مند ہو جاتا ہے تو پھر اس کے پاس آجاتے ہیں۔" (ب ۵/ ۱۵)

ہندوستان میں ستی کا رواج خود اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہاں عورت کا کوئی مستقل وجود نہیں سمجھا جاتا تھا اور خاوند کی موت کے ساتھ وہ بھی زندگی کے حق سے محروم ہو جاتی تھی۔

ہندومت، یہودیت، عیسائیت اور دیگر نمایاں مذاہب کے مرکز دنیا کے وہ علاقے رہے ہیں جو تہذیب و تمدن کے لحاظ سے ترقی یافتہ سمجھے جاتے رہے ہیں۔ ان تمام علاقوں میں اقتدار ہمیشہ مرد کے ہاتھ میں رہا ہے۔ اس نے عورت کو زیردست اور محکوم سمجھا اور اسے اس کے فطری حقوق سے محروم رکھا۔ جہاں تک مذاہب کا تعلق ہے ہمارا خیال ہے کہ ان میں ایسی تحریفات کی گئیں کہ عورت کے ساتھ ہر طرح کی چیرہ دستی جائز ہو جائے اور مرد کے ہر ظلم و زیادتی کے لیے خدائی سند فراہم ہو جائے ورنہ خدائے تعالیٰ عدل و انصاف کا سرچشمہ ہے۔ اس کے بارے میں یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کبھی ظلم اور ناانصافی کا حکم دے سکتا ہے۔



عورت اور جدید نظریات

عورت پر ظلم کا ردِ عمل

ظلم کا نتیجہ کبھی اچھا نہیں ہوتا۔ عورت ایک طویل عرصہ سے مظلوم چلی آ رہی تھی۔ جب اس کی مظلومیت اپنی انتہا کو پہنچ گئی تو اس کے نتائج بھی انتہائی گھناونی شکل میں نمودار ہونے لگے۔ دورِ جدید میں جہاں زندگی کے بہت سے میدانوں میں انقلاب آیا وہاں عورت کی سماجی حیثیت بھی بدل گئی۔ کل تک اس کو ذلیل و خوار سمجھا جاتا تھا لیکن آج وہ عزت و سربلندی کی دعوے دار ہے۔ ایک وقت تھا جب کہ مرد اس کو اس کا صحیح مقام دینے تک کے لیے تیار نہ تھا لیکن جیسے ہی موقع ملا وہ اپنی اصل پوزیشن سے آگے بڑھ گئی اور مزید بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ اس پر زندگی کے وہ دن بھی گزرے جب کہ وہ گھر کے چھوٹے سے دائرہ میں آزاد نہیں تھی اور آج اس کا ہاتھ پکڑنے والا نہ کوئی گھر کے اندر ہے اور نہ گھر کے باہر۔

صنعتی انقلاب کے اثرات

عورت کو آزادی کے اس مرحلے تک پہنچانے میں تاریخی طور پر وقت کے حالات نے بھی ساتھ دیا۔ جس وقت وہ مرد کے پنجۂ ستم سے رہائی کے لیے کوشاں تھی اس وقت مغرب میں بڑی تیزی سے صنعتی انقلاب آ رہا تھا۔ اس انقلاب نے عورت کی جدوجہد آزادی کو کامیابی کی راہ پر لگا دیا۔ وہ اس سے پہلے گھر (جو اس کا دائرۂ کار سمجھا

جاتا تھا) سے بغاوت کرنا چاہتی بھی تو اسے نہیں معلوم تھا کہ گھر سے باہر وہ کیا کرے گی اور زندگی کے کس نقشے کو اختیار کرے گی۔ اس انقلاب نے اس کے سامنے گھر سے باہر کے لیے ایک ایسا نقشہ پیش کیا جو خانگی زندگی سے زیادہ حسین تھا اور جس کے ذریعے وہ غلامی کی زنجیر کو توڑ سکتی تھی۔ اس نئے نقشے کو پاکر وہ جو کبھی ماں باپ اور شوہر کے خلاف سوچ بھی نہیں سکتی تھی، ان سے بغاوت پر آمادہ ہوگئی، کیوں کہ اب وہ کسی معاملے میں ان کی دست نگر نہیں تھی اور اس کے لیے ہر طرف معاش کے دروازے کھلے ہوئے تھے۔

اس بغاوت کے پیچھے عورت کے اندر اپنی حالت کی اصلاح سے زیادہ مرد کی بندشوں سے آزادی اور اس سے انتقام کا جذبہ کارفرما تھا۔ اس لیے اس نے سب سے پہلے اس نظام کو توڑنا شروع کیا جو اس کو، مرد کے تابع اور ماتحت رکھتا تھا، حالاں کہ یہ نظام بالکلیہ قابل رد نہیں تھا، اس میں گو بعض خامیاں در آئی تھیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنے اندر بہت سے صالح اور مفید اجزا رکھتا تھا۔ لہٰذا اس نظام کی شکست و ریخت کی نہیں بلکہ اصلاح کی ضرورت تھی۔ لیکن کسی نظریہ اور طریقۂ حیات کے خلاف ردعمل ہمیشہ اپنی انتہا کو پہنچ کر رہتا ہے۔ چناں چہ مرد کی چیرہ دستی اور ظلم کے خلاف نفرت اور غم وغصہ کے شدید جذبات نے آزادیِ نسواں کی تحریک کو بھی اپنی حد کے اندر رہنے نہیں دیا اور اس نے عورت کو وہاں پہنچا دیا جہاں عورت، عورت نہیں رہتی بلکہ مرد کا روپ دھار لیتی ہے، حالاں کہ یہ ایک مصنوعی لبادہ ہے جو اس نے اوڑھ رکھا ہے۔

مرد اور عورت کا طبعی فرق

حقیقت یہ ہے کہ نہ عورت مرد بن سکتی ہے اور نہ مرد کو عورت کے سانچے میں ڈھالا جاسکتا ہے۔ دونوں کی قوتوں اور صلاحیتوں میں نمایاں فرق پایا جاتا ہے۔ ایک ہی مقام، ایک ہی آب و ہوا اور ایک ہی ماحول میں پرورش پانے والے مرد اور عورت طبعی اور نفسیاتی طور پر باہم اس قدر مختلف ہوتے ہیں کہ مشرق ومغرب کے دو ہم جنس افراد

اتنے مختلف نہیں ہوتے۔ دو مردوں کے درمیان مزاج اور رجحانِ طبع کے ہزار اختلاف کے باوجود اتنی متحد اور مماثل خصوصیات بھی ہوں گی کہ ان کا تناسب متضاد رجحانات سے کہیں زیادہ ہوگا۔ یہ تناسب کسی بھی مرد اور عورت کے درمیان نہیں پایا جاتا۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قدرت کی نگاہ میں رنگ ونسل، آب و ہوا اور جغرافیہ و زبان کے اختلاف سے زیادہ صنفی اختلاف کی اہمیت ہے۔ اس لیے وہ صلاحیتوں کے عطا کرنے میں ملک ونسل، سیاہ و سپید، پست قد اور بلند قامت کے درمیان اتنا فرق نہیں کرتی جتنا اختلاف صنف کی بنیاد پر کرتی ہے یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ صنفی اختلاف معمولی اور جزوی اختلاف نہیں، بلکہ بنیادی اختلاف ہے۔ اس فرق و اختلاف کو تعلیم و تربیت اور ماحول کے ذریعے مٹایا نہیں جاسکتا، کیوں کہ آدمی اپنے اندر ان ہی قوتوں کو نشو ونما دے سکتا ہے جو فی نفسہٖ اس میں موجود ہوں۔ کسی ایسی قوت کا پیدا کرنا اس کے لیے ممکن نہیں جس کا مادہ قدرت نے اس کے اندر نہ رکھا ہو۔ عورت ہو یا مرد۔ کسب و محنت سے قدرت کی طرف سے عطا کردہ صلاحیتوں کو جلا تو دے سکتے ہیں، کوئی نئی صلاحیت پیدا نہیں کرسکتے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس کا ثبوت ہر دور کی تاریخ فراہم کرچکی ہے اور آج تک کوئی علمی تحقیق اس کی تردید نہیں کرسکی۔ ایک فرانسیسی مصنف الگزس کیرل، جس کو نوبل پرائز ملا تھا، اپنی کتاب Man the unknown میں لکھتا ہے:

> ''مردوں اور عورتوں کے درمیان جو اختلافات پائے جاتے ہیں وہ بنیادی نوعیت کے ہیں۔ یہ اختلافات ان کے جسم کی رگوں اور ریشوں کی ساخت کے مختلف ہونے سے پیدا ہوتے ہیں۔ عورت کے بیضہ دان سے جو کیمیاوی مادّے خارج ہوتے ہیں ان کا اثر صنف نازک کے ہر حصے پر پڑتا ہے۔ مردوں اور عورتوں کے طبعی اور نفسیاتی اختلافات کا سبب بھی یہی ہے۔''

ڈاکٹر لیمبر وس گنا، اپنی کتاب 'روحِ نسوانیت' میں تحریر کرتی ہے کہ ''عورتیں اور مرد صرف طول و قامت، ہڈیوں کی ساخت اور عضلاتی بناوٹ کے اعتبار سے ہی مختلف نہیں، بلکہ اس اعتبار سے بھی مختلف ہیں کہ وہ ہوا اور غذا کی ایک ہی مقدار جذب نہیں

کرتے۔ ان کے امراض کی نوعیت مختلف ہوتی ہے۔ ان کے ذہن اور اخلاقی رجحانات میں بھی فرق پایا جاتا ہے۔"

یہ وہی خیالات ہیں، جن کا اظہار ایک صدی قبل (جب کہ آزادیِ نسواں کا پودا پورا برگ و بار نہیں لایا تھا) علمی حلقوں میں کیا گیا تھا۔ چناں چہ انیسویں صدی کی انسائیکلو پیڈیا میں لکھا ہے:

> "مرد و عورت میں اعضائے تناسل کی ترکیب وصورت کا اختلاف اگر چہ ایک بڑا اختلاف نظر آتا ہے۔ لیکن صرف یہی ایک اختلاف نہیں ہے بلکہ عورت کے اور تمام اعضاء سر سے پیر تک مرد کے اعضاء سے مختلف ہیں۔ یہاں تک کہ وہ اعضاء بھی جو بظاہر آخر الذکر سے بے حد مشابہ نظر آتے ہیں۔"

مرد اور عورت کی ذمے داریاں ایک نہیں ہوسکتیں

دونوں صنفوں کا یہ اختلاف متقاضی ہے کہ جس صنف میں جس نوعیت کی قوت وصلاحیت ہے اس سے اسی نوعیت کا کام لیا جائے۔ زندگی کے بیشتر معاملات میں عمل بھی اسی پر کیا جاتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ کسی انجینئر کو کاشت کاری میں لگا دیا جائے یا کسی تعلیم سے دلچسپی رکھنے والے کو فوج میں منتقل کر دیا جائے۔ ایک ہی صنف کے دو افراد کے درمیان صلاحیت، رجحانِ طبع، ذوق اور مناسبت کی بنا پر فرق کیا جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ دو مختلف صنفوں کے مابین اس فرق کو نظر انداز کر دیا جائے، جب کہ دونوں کی جسمانی ساخت، پیدائش سے موت تک کے طبعی مراحل، اسی طرح سے ان کے جذبات و احساسات صاف بتاتے ہیں کہ ان کی تخلیق بالکل جدا گانہ ڈھنگ پر ہوئی ہے اور قدرت ان سے دو مختلف نوعیت کے کام لینا چاہتی ہے۔

لیکن جدید فکر کی غلط اندیشی نے دونوں کو ایک ہی میدان میں اتار دیا ہے اور ایک ہی میدان میں ترقی کے مواقع بھی فراہم کیے ہیں۔ حالاں کہ اس کے پاس اس بات کا کوئی طبعی اور نفسیاتی ثبوت نہیں ہے کہ عورت اور مرد کی صلاحیتیں اور قوتیں ایک نوعیت کی ہیں اور جو کام مرد انجام دیتا ہے وہ عورت بھی انجام دے سکتی ہے۔

الگزس کیرل مردوں اور عورتوں کے طبعی اور نفسیاتی اختلافات پر بحث کرتے ہوئے لکھتا ہے:

''ان بنیادی حقائق کو (جو عورت اور مرد کے طبعی فرق پر دلالت کرتے ہیں) نظر انداز کردینے کی وجہ سے نسوانی آزادی کے علم برداروں نے یہ دعویٰ کیا کہ مردوں اور عورتوں کی ذمے داریاں اور حقوق بالکل یکساں اور مساوی ہونے چاہئیں، حالاں کہ فی الحقیقت مردوں اور عورتوں کے درمیان بے حد اختلافات پائے جاتے ہیں۔ عورت کے جسم کے ہر خلیے پر اس کی نسوانیت کے نقوش مرتسم ہوتے ہیں۔ یہی بات اس کے اعضاء کے متعلق بھی صحیح ہے اور بالخصوص اس کے نظامِ عصبی کے متعلق۔ عورتوں کو اپنی فطرت کے مطابق اپنے رجحانات کی تشکیل کرنی چاہیے بغیر اس کے کہ وہ مردوں کی تقلید کریں۔ تہذیب کے ارتقاء میں عورتوں کا بہ نسبت مردوں کے زیادہ حصہ ہے۔ اس لیے انھیں اپنے خصوصی فرائض سے پہلو تہی نہیں کرنا چاہیے۔''

ڈاکٹر لیمبر وس گنا، رقم طراز ہے:

''ترقی اور ارتقاء صرف اسی طرح ممکن ہے کہ مردوں اور عورتوں کے معاشرتی حقوق و فرائض کا تعین کرنے میں ان کے فروق و اختلافات کو مدنظر رکھا جائے۔''

فلسفۂ مساوات اور اس کی کم زوری

حقیقت یہ ہے کہ مغرب نے مساواتِ مرد وزن کا تصور اس لیے نہیں قبول کیا ہے کہ اس نے دونوں کے طبعی فرق کو غلط ثابت کردیا یا تبدیل کرکے رکھ دیا ہے، بلکہ اس کی نگاہ میں یہ تصور، عورت کی مظلومیت کا واحد حل ہے۔ اس کے نزدیک عورت کی مظلومیت کی وجہ یہ ہے کہ سوسائٹی میں مرد کو ظلم و زیادتی کے مواقع حاصل ہیں اور عورت ان حقوق و اختیارات سے محروم ہے، جن سے کسی کی جان، مال اور عزت و آبرو محفوظ رہتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ عورت کو بھی وہ تمام سماجی و سیاسی حقوق حاصل ہوں

جو مرد کو حاصل ہیں اور جن اسباب و وسائل کے ذریعے سوسائٹی میں عزت و سربلندی حاصل کی جاتی ہے وہ کسی ایک صنف کے ساتھ مخصوص نہ سمجھ لیے جائیں، تاکہ مردوں کی طرح عورت بھی اونچے سے اونچے منصب تک رسائی حاصل کر سکے اور بہتر سے بہتر صنعت اور اعلیٰ سے اعلیٰ پیشہ اختیار کر سکے۔ ورنہ کسی ایک صنف کو ترقی کے مواقع فراہم کرنے اور دوسری کو اس سے محروم رکھنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ ہم سماج میں اسے مستقل ذلیل اور پست رکھنا چاہتے ہیں اور اس کی ترقی کے خواہاں نہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی طبقہ سماجی حیثیت سے پست ہوگا تو وہ برتر طبقہ کے جور و ستم کا لازماً نشانہ بنا رہے گا، بااقتدار گروہ کو ظلم اور چیرہ دستی سے دنیا کی کوئی قوت باز نہیں رکھ سکتی۔

اس پوری بحث میں عورت کے سماجی حقوق اور اس کی سماجی ذمہ داریوں کو ایک کر دیا گیا ہے۔ حالاں کہ ان میں بنیادی فرق ہے۔ کسی فرد کے ساتھ عدل و انصاف اور مساوات کا سلوک ایک الگ چیز ہے اور اس کو کسی متعین سماجی کام میں لگا دینا ایک دوسری چیز ہے۔ ان دونوں کو ایک قرار دینا یا ایک کو دوسرے پر منحصر سمجھنا خطرناک غلطی ہے۔ کیوں کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ جو شخص بعض متعین کام انجام نہ دے وہ سماجی حقوق سے بھی محروم رہے۔ اگر عورت پر ظلم و زیادتی ہوتی ہے اور وہ اپنے حقوق سے محروم ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست اور سماج اپنی ذمے داری سے غفلت برت رہے ہیں۔ ان کا فرض ہے کہ اس کو معاشی و معاشرتی، تعلیمی و تمدنی سہولتیں بہم پہنچائیں تاکہ وہ ایک آزاد اور پرامن شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کر سکے۔ جو ریاست اپنے اس فرض کو صحیح طور سے انجام نہیں دیتی وہ اپنے وجود کی نفی کرتی ہے کیوں کہ فرد ریاستی اور اجتماعی زندگی کو اسی لیے اختیار کرتا ہے کہ زندگی کے جن اہم مقاصد کو وہ اپنے محدود ذرائع و وسائل کی بنا پر پورا نہیں کر سکتا، ریاست کے وسیع اور قوی ذرائع سے ان کی تکمیل ہو۔ اس لیے ریاست کو نہ تو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ کسی شہری کو اس کی بنیادی ضروریات سے محروم کر دے اور نہ اس کو یہ حق حاصل ہے کہ کسی مخصوص طبقے کے ساتھ امتیازی برتاؤ

کرے اور دوسرے طبقے کو عدل و انصاف سے محروم رکھے۔ دنیا کی کوئی بھی ریاست اس امتیاز کے لیے وجہ جواز نہیں رکھتی۔

کسی ریاست کا شہری ہونا اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ ہر قسم کی ریاستی ذمے داری بھی اس پر ڈال دی جائے۔ کیوں کہ ذمے داری اہلیت کی بنا پر سونپی جاتی ہے اور ضروری نہیں کہ ہر شخص میں ہر کام کرنے کی اہلیت ہو۔ اس لیے حقیقت پسندی کا تقاضا یہ ہے کہ عورت پر وہی ذمے داریاں عائد کی جائیں جن کی وہ متحمل ہو اور جن کو پورا کرنے کی اس میں صلاحیت ہو۔

مغرب نے اپنے استدلال میں اسی حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اس نے ترقی اور عزت کو چند مخصوص پیشوں اور صنعتوں کے ساتھ وابستہ کر دیا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عزت و ذلت کا ایک خود ساختہ پیمانہ ایجاد کیا ہے۔ یہ وہ پیمانہ ہے جس کے بنانے میں مرد کی قوتوں اور صلاحیتوں کو تو سامنے رکھا گیا ہے لیکن عورت کے مزاج اور فطرت کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور پھر اس کو دعوت دی گئی ہے کہ وہ عزت اور سربلندی کی خواہاں ہے تو اس پیمانے پر پوری اترے۔ حالاں کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ فطرت نے جس صنفِ انسانی میں جس نوعیت کی صلاحیت رکھی ہے اسی نوعیت کا کام اس کے لیے کامیابی و کامرانی کا ذریعہ تصور کیا جاتا۔ اس طرح ہر صنف، فطری طور پر معاشرے میں اپنا مقام پیدا کرتی اور عزت حاصل کرنے کے لیے اس کو غیر فطری جدوجہد نہ کرنی پڑتی۔

کہا جاتا ہے کہ جس چیز کو عورت کی فطرت کہا جاتا ہے، وہ دراصل ایک مصنوعی حالت ہے جو مرد کے مسلسل ظلم کی وجہ سے اس پر طاری ہوگئی ہے۔ عورت کو چوں کہ ایک زمانۂ دراز سے کچلا اور دبایا جارہا تھا اس لیے اس کی فکری و عملی قوتیں ٹھٹھر کر رہ گئیں، اس لیے کہ جب تک صلاحیتوں کو ابھرنے کے مواقع نہیں حاصل ہوتے وہ دبی پڑی رہتی ہیں۔ عورت کو اگر جدوجہد اور عمل کی آزادی ہوتی تو وہ ان میدانوں میں بھی

بہترین کردار ادا کرسکتی تھی، جو مرد کے لیے مخصوص سمجھے جاتے ہیں۔

جہاں تک عقل و استدلال کا تعلق ہے، اس دعوے کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیوں کہ جس طرح اس بات کا امکان ہے کہ عورت آزادیِ عمل پا کر ہر پہلو سے مرد کی برابری کا ثبوت دے اسی طرح بالکل اس کے مساوی اس بات کا بھی امکان ہے کہ آزادی کے بعد وہ وہیں رہے جہاں پہلے تھی۔ جب یہ دونوں امکانات ایک ہی درجے میں پائے جاتے ہیں تو کس دلیل کی بنا پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے اندر خالص مردانہ ذمے داریوں کے انجام دینے کی بھی صلاحیت ہے۔ خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ اس کی موجودہ نفسیات اور صلاحیتیں گواہی دیتی ہیں کہ زندگی کی جدوجہد میں اس کا دائرہ اور مرد کا دائرہ بالکل الگ الگ ہونا چاہیے۔

پھر یہ بات بھی حقیقت واقعہ کے خلاف ہے کہ مرد ہمیشہ ظالم رہا اور اس کے جور وستم نے عورت کے جذبات اور عزائم کو ظہور پذیر ہونے نہیں دیا، کیوں کہ اگر مرد کو جبر وظلم کی قوت حاصل ہے تو عورت کے پاس اس کے حسن و دل ربائی کا افسوں ہے، جس سے وہ سنگ دل اور بے رحم انسانوں کو موم بنا سکتی ہے۔ چناں چہ تاریخ میں جہاں مردوں کی چیرہ دستی کی مثالیں ملتی ہیں، وہاں اس قسم کے واقعات کی بھی کمی نہیں ہے کہ وقت کی ایسی ایسی شخصیتیں عورت پر جان و دل سے نثار رہی ہیں، جن کے کسی طرف جھک جانے کے معنی یہ تھے کہ سارا ماحول اس کے تابع ہوگیا۔ بسا اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ عورت بڑے بڑے تخت وتاج کی بلا شرکتِ غیرے مالک رہی ہے لیکن اس کے باوجود معاشرتی نفسیات کے محققین کی رائے ہے کہ عورت نے اپنے دائرے سے باہر کوئی اہم کارنامہ انجام نہیں دیا۔

ہیولاک ایلس جو اس زمانے میں جنسی نفسیات کا سب سے بڑا ماہر خیال کیا جاتا ہے اپنی کتاب 'مرد وعورت' میں لکھتا ہے:

"عورت دوسروں کی ہم دردی کے لیے تڑپتی ہے اور اس میں خود مختاری کا

جذبہ ویسا پرزور نہیں ہوتا جیسا مردوں میں ہوتا ہے۔''

اس دعوے کے ثبوت میں 'ایلس' ان چند عورتوں کی مثال پیش کرتا ہے جنھوں نے بہ ظاہر بڑے بڑے عملی کام کیے ہیں، ان میں ایک عورت بھی ایسی نہیں جس نے اپنا بہترین کام مردوں سے الگ رہ کر انجام دیا ہو۔ چناں چہ میڈم کیوری نے اپنے شوہر کیوری کے ساتھ سائنس میں، مسز براؤ ننگ نے اپنے رفیق حیات براؤ ننگ کے ساتھ شاعری میں اور جارج ایلیٹ نے مسٹر لیوس کے ساتھ ناول نویسی کے میدان میں جو کارہائے نمایاں کیے وہ مردوں کی معیت اور رفاقت کی وجہ سے معرضِ وجود میں آئے۔

جن خواتین نے مواقع حاصل ہونے کے باوجود مرد کے میدان میں کوئی کارنامہ انجام نہیں دیا ان کے متعلق ممکن ہے یہ توجیہ کردی جائے کہ گو ان خواتین کو انفرادی طور پر آزادی میسر تھی، لیکن طبقۂ نسوانیت کے طویل ذہنی و عملی انحطاط نے ان کے جذبات فکر و عمل کو ٹھنڈا کر دیا تھا۔ وہ مرد کے سہارے کے بغیر کسی اہم اقدام کی جرأت نہیں کرتی تھی، ان کے اندر یہ حوصلہ نہیں تھا کہ آزادانہ رائے قائم کریں اور اپنے بل بوتے پر کوئی کام کریں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک طویل عرصہ تک وہ حریت اور آزادی کا ماحول انھیں فراہم کیا جائے، اس کے بعد یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ ان کے اندر عزم و حوصلہ اور خود اعتمادی کی روح بیدار ہوگی۔

یہ توجیہ گو حسین ہے لیکن واقعات سے مطابقت نہیں رکھتی، تاریخ میں ایسے دور بھی گزر چکے ہیں جب کہ عورت کو مرد کے برابر جدوجہد کے مواقع حاصل تھے اور آج بھی بہت سے قبائل اور غیر مہذب قومیں ہیں جن میں عورت کسی ایک دائرے میں بند ہوکر نہیں رہ گئی ہے بلکہ زندگی کے تمام مسائل سے مرد کی طرح براہِ راست نبٹنے کی کوشش کرتی ہے لیکن اس کے باوجود فطرت نے عورت اور مرد کے درمیان جو طبعی فرق رکھا ہے وہ بہر طور باقی ہے۔

خود موجودہ تہذیب نے تقریباً دو صدی سے آزادی میں مرد کے ساتھ عورت کو

بھی شریک کر رکھا ہے۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس آزادی نے مزاجِ نسوانیت میں تبدیلی پیدا کردی؟

پروفیسر ووفارینی لکھتا ہے:

''جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی قویٰ کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے، بعینہٖ اسی طرح امریکہ کی وحشی ترین اقوام میں بھی پایا جاتا ہے۔''

یہی مصنف مزید لکھتا ہے:

''تمدن کے بڑھنے کے ساتھ ہی قدرتی اختلاف کی وضاحت بھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ چناں چہ گوری رنگت کے مردوں اور عورتوں میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ سیاہ فام رنگت کے وحشی مردوں اور عورتوں کے باہمی اختلاف سے کئی درجہ بڑھا ہوا ہے۔''

تمدن کی ترقی میں عورت کی شرکت

عورت کے اپنے فطری دائرے سے خروج کو برحق ثابت کرنے کے لیے ایک اور دلیل بھی دی جاتی ہے۔ وہ یہ کہ اگر عورت سماجی وتمدنی سرگرمیوں سے کنارہ کش ہوجائے تو تہذیب وتمدن کی رفتار گھٹ کر آدھی ہوجائے گی اور پچاس سال کے عرصہ میں تہذیب، ترقی کے جن منازل تک پہنچ سکتی ہے، ان تک سو سال میں پہنچے گی۔

اس دلیل کا بالفاظِ دیگر مطلب یہ ہے کہ عورت کی خانگی مصروفیت اور جدوجہد سے سماج کو فائدہ نہیں پہنچ رہا ہے، اس لیے اس کو ایسے کام کرنے چاہئیں، جن سے سماج کی تعمیر وترقی ہوسکے۔

یہ دلیل انتہائی غلط اور غیر علمی ہے کیوں کہ سماج کوئی مخصوص فنّی نوعیت کا ادارہ نہیں کہ صرف اس فن کی ترقی کو سماج کی ترقی سمجھا جائے، بلکہ یہ زندگی کے مختلف شعبوں کی تنظیم وترکیب سے وجود میں آتا ہے۔ ان ہی میں وہ شعبہ بھی ہے، جس کو عورت سنبھالے ہوئے ہے۔ اگر یہ شعبے ختم ہوجائیں تو سماج بھی فنا ہوجائے۔ اس لیے

سماجی ارتقاء کے معنی یہ ہیں کہ اس کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ ترقی کریں اور بحیثیت مجموعی زندگی کا معیار بلند ہو۔ مزدور کو اپنی مزدوری میں آسانیاں فراہم ہوں اور خوش حالی نصیب ہو۔ صنعت کار کو صنعت کی ترقی میں کوئی رکاوٹ نہ ہو اور تاجر کو تجارت کی آزادی ہو۔ اسی طرح سماجی ترقی کے لیے ناگزیر ہے کہ عورت کو بھی اس کے اپنے دائرے میں کام کے پورے مواقع حاصل ہوں اور اس پر کسی قسم کی غیر ضروری قدغن نہ عائد کی جائے۔ نہ یہ کہ سماج کی فلاح و بہبود کے نام پر اس کو اس کے حقیقی دائرۂ عمل سے باہر کھینچ لایا جائے۔ اس کا جواز صرف اس صورت میں نکل سکتا ہے جب کہ ہم یہ ثابت کردیں کہ عورت سماج کی جو خدمت انجام دے رہی ہے وہ سماج کے لیے نقصان دہ یا کم از کم غیر مفید ہے۔ ورنہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیوں نہ مزدور اپنا کارخانہ چھوڑ دے، صحافی اپنا اخبار بند کردیں اور پڑھنے اور پڑھانے والے تعلیم گاہوں سے باہر نکل آئیں۔ ظاہر ہے، کوئی اس کو درست نہیں قرار دے سکتا۔

کہا جاتا ہے، بلاشبہ عورت سماج ہی کے فائدے کے کام کر رہی ہے لیکن اس کو بالکل معمولی اور حقیر کاموں کے لیے مخصوص سمجھ لیا گیا ہے اور اگر وہ معاشرے کی کوئی اہم خدمت انجام دینا بھی چاہے تو اس کو اس کی اجازت نہیں دی جاتی۔ حالاں کہ ہر پیشے والے کو یہ حق حاصل ہے کہ جب چاہے اپنا پیشہ بدل دے اور جس صنعت کو چاہے اختیار کرے۔

اس کے جواب میں عرض ہے کہ عورت کو جو قوتیں اور صلاحیتیں حاصل ہیں، عقل کا صریح تقاضا ہے کہ ان ہی کے مطابق اس کے لیے نقشۂ عمل تجویز کیا جائے اور اگر یہ نقشہ کسی کو ناقص نظر آتا ہے تو اسے فطرت سے سوال کرنا چاہیے کہ کیوں کہ اس نے ایک صنف کو حصولِ کمال کی سعادت سے مستقلاً محروم رکھا؟ یا کم از کم اس کو عورت کی صلاحیتوں میں ایسی تبدیلی لانی چاہیے، جس سے وہ اس کے تجویز کردہ نقشے کے مطابق کام کرسکے۔

موجودہ تمدنی ترقی کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے اس نظریے کی تردید کردی ہے کہ عورت ایک مخصوص دائرے ہی میں کام کرسکتی ہے کیوں کہ تمدن نے جس شعبے میں بھی ترقی کی ہے، اس میں مرد کے ساتھ عورت بھی شریک رہی ہے۔ اگر عورت نے ساتھ نہ دیا ہوتا تو ترقی کی رفتار گھٹ جاتی۔

یہ تجزیہ حقیقت کے بالکل خلاف ہے کیوں کہ موجودہ تمدن کی ترقی کا سبب وہ طبعی و مادی علوم ہیں، جن کا آغاز اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپ میں ہوا، جن کی مدد سے انسان بہت سے ایسے مادّی حقائق کے دریافت کرنے میں کامیاب ہوا جن کو وہ اپنی دست رس سے باہر خیال کر رہا تھا۔ یہی حقائق و انکشافات ہیں جو موجودہ تمدن کا سرچشمہ ہیں۔ ان علوم کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ تحقیقات مرد کی سعی و کاوش کا نتیجہ ہیں۔ اس میں عورت کا حصہ بہت کم رہا ہے۔ اس نے اس میدان میں ایسا کوئی مستقل کارنامہ نہیں انجام دیا ہے، جس کا تمدن پر کوئی گہرا اثر ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سائنس کے کسی بھی شعبے میں آج تک اس کو امامت کا درجہ حاصل نہیں ہوسکا ہے۔

ایسا کیوں ہے؟ اس لیے کہ یہ اس کا حقیقی دائرہ عمل نہیں ہے۔ وہ اگر اس طرف رُخ کرتی ہے تو اس کی حیثیت ایک اجنبی کی سی ہوتی ہے۔ اس میدان میں کام کے خواہ کتنے ہی مواقع اس کو کیوں نہ حاصل ہوں، وہ مرد کی رفتار کا کبھی مقابلہ نہیں کرسکتی۔ چناں چہ خود مغربی مفکرین کو اعتراف ہے کہ عورت تمام سہولتوں کے باوجود ان شعبوں میں اتنی کار آمد ثابت نہیں ہو رہی ہے جتنی کہ اس سے توقع کی جاتی ہے اور ایک کم تعلیم یافتہ مرد سے سوسائٹی کو ایک تعلیم یافتہ عورت سے زیادہ فائدہ پہنچ رہا ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ کام تو کرنا چاہتی ہے مردوں کا، لیکن اس کی نسوانیت اس کو اس کی اجازت نہیں دیتی۔ موجودہ رجحانات اس کو جس طرف لے جا رہے ہیں اس کی طبعی صلاحیتیں اس طرف چلنے سے انکار کر رہی ہیں۔ اس کشمکش نے اس کو ایک عذاب میں مبتلا کر دیا ہے جس سے خود مغرب پریشان ہے۔

پروفیسر آرنلڈ ٹائن بی، اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پچھلے دنوں ہم نے خالص مادّی پہلو سے اپنی مشکلوں کا حل سوچنے کی جو کوشش بھی کی وہ ناکام رہی اور ہمارے تمام منصوبے تمسخر بن کر رہ گئے۔ ہم سوچتے ہیں کہ ہم نے ایسی مشینیں ایجاد کرکے جن سے ہزاروں آدمیوں کو مشقت سے بچایا جاسکتا ہے، کتنی ''عظیم الشان'' ترقی کی ہے، بے شک یہ صحیح ہے لیکن اس کا یہ ایک عجیب نتیجہ نکلا کہ عورت غریب آج اتنی محنت کر رہی ہے جتنی اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں کی تھی۔ مثلاً: امریکی عورت ہی کو لیجیے۔ وہ گھریلو کام کاج کے لیے بیرونی مدد لینے سے محروم ہے اور خود اس کے حالات اسے اس بات کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ محض خانہ داری کی دیکھ بھال کے لیے ہی اپنا سارا وقت دے سکے۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے چاری دوہری مشقت میں پسی جا رہی ہے۔ گھر پر وہ بیوی اور ماں ہے اور باہر وہ کسی دفتر یا کارخانے میں ملازمہ ہے۔ جنگ کے دنوں میں انگلستان میں عورت کی یہ حیثیت تقریباً ملک گیر تھی۔ حالات کا یہ رُخ کسی طرح حوصلہ افزا نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارا تجربہ بتاتا ہے کہ دنیا میں تنزل کے دور عام طور پر وہی رہے ہیں، جب عورت گھر کی چار دیواری کو چھوڑ کر باہر نکلی ہے۔ قدیم تاریخ میں پانچویں صدی قبل مسیح کا یونان ترقی کی معراج پر پہنچا ہوا تھا لیکن اس دور میں عورت گھر کی زینت تھی۔ مگر اسکندر کے بعد جس زمانے میں شہری ریاستیں رو بہ زوال تھیں تو جب بھی ایک ایسی ہی نسوانی تحریک شروع ہوئی تھی جیسی آج ہمارے زمانے میں پائی جاتی ہے۔''

عورت کا گھر کی چہار دیواری کو چھوڑنا دو اسباب کی بنا پر زوال کا باعث ہوتا ہے۔ ایک تو یہ کہ اس سے زندگی کا بہت بڑا دائرہ معطل ہو جاتا ہے اور اس کے بے شمار مسائل لاینحل رہ جاتے ہیں کیوں کہ ان مسائل کو عورت ہی کا ناخنِ تدبیر حل کرسکتا ہے۔ مرد کے بس میں نہیں کہ ان کو حل کردے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اس اقدام سے عورت اور مرد کے تعلقات اور دونوں کی سرگرمیوں کا رُخ وہ ہوتا ہے، جس کے بارے میں تاریخ کا فیصلہ ہے کہ اس پر چلنے والا کبھی کامیاب نہیں ہوا۔

اسلام کا نقطۂ نظر

حقیقت یہ ہے کہ سوسائٹی میں عورت اور مرد کا صحیح مقام اور دونوں کے تعلق کو متعین کرنے میں نہ قدیم تصورات کو کامیابی حاصل ہوئی ہے اور نہ جدید فکر ہی اس کو حل کرسکا ہے۔

ہمارے نزدیک صرف اسلام نے دونوں کی نفسیات، طبعی رجحانات اور فکری و عملی قوتوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیا ہے۔ اس لیے نظامِ تمدن میں دونوں کی حیثیت متعین کرنے میں بھی وہ پوری طرح کامیاب ہے۔

سب سے پہلے وہ یہ حقیقت ہمارے سامنے لاتا ہے کہ فطرت، وجود و حیات کا سلسلہ دو مقابل صنفوں کی مدد سے باقی رکھے ہوئے ہے۔ اس مقصد کے لیے وہ جس صنف سے جس نوعیت کا کام لینا چاہتی ہے اس کو اسی نوعیت کی صلاحیتیں بھی دی ہیں۔ لہٰذا ہر صنف کا کمال یہ ہے کہ اس کی طبعی صلاحیتیں منشائے قدرت کی تکمیل میں صرف ہوں۔ اس نظریے کے تحت معاشرے میں مرد و زن کے حدودِ عمل گو ایک دوسرے سے لازماً الگ قرار پائیں گے لیکن کسی صنف کو محض اس بنا پر کوئی تفوق حاصل نہ ہوگا کہ وہ مخصوص اوصاف اور قوتوں کی حامل ہے جو دوسری صنف میں نہیں ہیں اور نہ کوئی صنف اپنی تگ و دو کو ذلت آمیز اور باعث توہین خیال کرنے پر مجبور ہوگی۔ اس کے برعکس جو افراد، فطرت کے بتائے ہوئے راستہ پر گامزن ہوں گے معاشرے میں ان کی پذیرائی ہوگی اور وہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے اور جو کوششیں شاہراہ فطرت سے ہٹی ہوئی ہوں گی وہ حقارت اور ندامت کی مستحق قرار پائیں گی۔ ساتھ ہی اس کا عملی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر صنف کو اس کے اپنے دائرے میں تو سبقت و اقدام کے پورے مواقع فراہم ہوں گے۔ لیکن اس دائرے سے باہر اس کی سرگرمیوں کو کم سے کم کیا جائے گا۔

ایک شخص یہ کہہ کر اس نظریہ کی قدر و قیمت کم کرسکتا ہے کہ عمل کی دنیا میں انسان اعلیٰ نظریات کا پابند نہیں ہوتا بلکہ عموماً وہ ایسے عوامل و محرکات کے پیچھے دوڑ پڑتا ہے جن

سے اس کے جذبات کی تسکین ہوتی ہے اور جو اس کے لیے زیادہ پر لطف اور حسین ہوتے ہیں۔ اس لیے اسلامی نظریات پر ایمان رکھنے کے باوجود یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ مرد عورت کے ساتھ مساویانہ سلوک کرے گا، کیوں کہ انسان کا قوی ترین داعیہ یہ ہے کہ اس کو دوسروں پر اقتدار اور غلبہ حاصل رہے۔ یہ داعیہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے سے کم زور مخلوق کو کم زور ہی رکھے اور اس کو اُبھرنے اور مساوی حیثیت میں آنے کا موقع نہ دے۔

یہ بات دنیا کے اور نظریات کے متعلق ممکن ہے صحیح ہو، لیکن اسلامی تصورات کو ان پر قیاس کرنا غلط ہوگا، کیوں کہ ان کے پیچھے ایک زبردست ہستی کا زندہ و محکم یقین اور اس کا بے پناہ خوف کارفرما ہوتا ہے۔ اس یقین کے منافی کسی حرکت کا صدور ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص جانتے بوجھتے اپنی تباہی کو دعوت دے اور ہلاکت کے غار میں گر پڑے۔

اس کے باوجود اسلام نے عورت کی قسمت کو مرد کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا ہے کہ اگر خدا کا خوف اس کو ظلم و زیادتی سے روکے تو رُک جائے اور اگر یہ خوف دھندلا ہوگیا ہے تو ہر طرح کی تعدی کی گنجائش نکل آئے، بلکہ اس نے قانوناً بھی عورت کی پوزیشن اتنی مضبوط کردی ہے کہ وہ اپنی طبعی کم زوریوں کے باوجود سماج میں نہ تو مظلوم و بے بس رہے گی اور نہ فقر و فاقہ پر مجبور ہوگی۔ اس کو ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق ہوگا۔ وہ ریاست کے تمام ذرائع و وسائل اور سہولتوں سے اسی طرح فائدہ اٹھا سکے گی جس طرح مرد فائدہ اٹھاتا ہے۔ اس کے ساتھ عدل و انصاف میں کوئی فرق نہیں کیا جائے گا۔ اس کی جان، مال اور عفت و عصمت پر دست درازی کا حق ریاست کے کسی بھی فرد کو نہیں ہوگا۔ حتی کہ ماں باپ، شوہر اور حاکمِ وقت بھی اس سے کسی غیر قانونی مطالبہ کا مجاز نہ ہوگا۔

قانون کی اس شدت کے ساتھ اسلام مرد کے اندر لطف و محبت کے جذبات کو

اُبھارتا ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ عورت ایک نسبتاً کمزور مخلوق ہے، اس لیے ہم دردی اور مہر و الفت کی مستحق ہے نہ کہ سختی اور تشدد کی۔ اقتدار و بالادستی خدا کی صفت ہے۔ اگر مرد کو عورت کے مقابلے میں خدا کی اس صفت کا کچھ زیادہ حصہ ملا ہے تو اس کو محبت اور ہم دردی میں بھی آگے ہونا چاہیے کیوں کہ خدا جتنا بڑا صاحبِ اقتدار ہے اتنا ہی بڑا رحیم و کریم بھی ہے۔ وہ شخص انتہائی کم ظرف ہے جس کے اندر اقتدار کا نشہ درندوں اور بھیڑیوں کی صفات پیدا کردے۔ ان جذبات میں اتنی قوت ہے کہ یہ صحیح معنی میں پیدا ہوجائیں تو عورت کو ظلم و زیادتی نہ برداشت کرنی پڑے گی اور وہ مرد کے لطف و محبت سے ہم کنار رہے گی۔



عورت
اسلامی معاشرے میں

☆ ابتدائیہ (عورت ــــ عرب کے دورِ جاہلیت میں)

☆ اساسی تصورات

☆ عورت کا حقیقی دائرۂ کار

ابتدائیہ

عورت

عرب کے دورِ جاہلیت میں

نوعِ انسانی کی تاریخ عورت کی مظلومی اور محرومی کی تاریخ ہے۔ پوری دنیا میں یہاں تک کہ تہذیب وتمدن کے مراکز میں اور مذاہب کی تعلیمات میں اسے ایک کم تر مخلوق ہی سمجھا گیا اور اسے اس کے فطری حقوق کبھی حاصل نہیں رہے۔ اس سے تصور کیا جاسکتا ہے کہ تمدن ناآشنا عرب میں اس کی کیا حالت رہی ہوگی اور کس بے کسی و بے بسی کے ساتھ اس کا سفرِ حیات طے ہورہا ہوگا۔

اسلام کا آفتاب عرب کے اُفق سے جس وقت طلوع ہوا، اس وقت عورت جن نازک حالات سے گزر رہی تھی، یہاں بہت اختصار سے اس کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ اس سے عورت کے بارے میں اسلام کے موقف اور اس کے کردار کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

اہلِ عرب عورت کے وجود کو موجبِ ذلت و عار سمجھتے تھے۔ لڑکی کی پیدائش ان کے لیے غم و اندوہ کا پیام تھی۔ وہ نرینہ اولاد پر اتراتے اور فخر کرتے، لیکن لڑکیوں کا وجود ان کے سرِ عظمت کو جھکا دیتا۔ قرآن مجید نے ان کے ان جذبات کی کتنی صحیح تصویر کشی کی ہے:

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُھُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ — جب ان میں سے کسی کو لڑکی کی خبر دی جاتی

وَجۡهُهٗ مُسۡوَدًّا وَّ هُوَ كَظِيۡمٌ۝ يَتَوَارٰى مِنَ الۡقَوۡمِ مِنۡ سُوۡۤءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمۡسِكُهٗ عَلٰى هُوۡنٍ اَمۡ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ
(النحل:۵۸،۵۹)

ہے تو اس کا چہرہ سیاہ پڑ جاتا ہے اور وہ غم سے گھٹنے لگتا ہے۔ اس خبر کو وہ اس حد تک برا سمجھتا ہے کہ اپنے آپ کو اپنی قوم سے چھپائے پھرتا ہے (اور سوچ میں پڑ جاتا ہے) کہ آیا ذلت برداشت کرتے ہوئے اس کو باقی رکھے یا زیرِ زمین دفن کردے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

وَ اللّٰه ان کنّا فی الجاھلیة ما نعد للنساء امرا حتی انزل اللّٰه فیھن ما انزل و قسم لھن ما قسم[۱]

قسم بخدا، ہم دورِ جاہلیت میں عورتوں کو کوئی حیثیت ہی نہیں دیتے تھے یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں اپنی ہدایات نازل کیں اور ان کے لیے جو کچھ حصہ مقرر کرنا تھا مقرر کیا۔

عورت سے نفرت اور بیزاری اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ ایک شخص کے گھر لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے اس گھر ہی کو منحوس سمجھ کر چھوڑ دیا۔[۲]

انسان کے اندر محبت و شفقت اور رحم کا فطری جذبہ ہے۔ عورت کے معاملہ میں یہ فطری جذبہ بھی بعض اوقات اہلِ عرب میں سرد پڑ جاتا تھا اور ظلم و زیادتی کے گھناؤنے مظاہرے ہوتے تھے۔ چناں چہ ان میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے واقعات بھی پیش آتے رہتے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس شقاوتِ قلب کا مظاہرہ ان افراد کی طرف سے ہوتا تھا، جن کو شفقت و محبت کا سرچشمہ خیال کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں

۱۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق، باب فی الایلاء و اعتزال النساء وتخییر ھن۔

۲۔ اس پر اس کی مظلوم بیوی نے شعر میں فریاد کی اور عدم اختیار کا اظہار کیا۔ اشعار کا ترجمہ یہ ہے: ابوحمزہ (شوہر کی کنیت) ہمارے پاس نہیں آرہے ہیں۔ قریب کے گھر میں رہنے لگے ہیں۔ کیا وہ اس بات پر خفا ہیں کہ ہم نے لڑکے کیوں نہیں پیدا کیے۔ یہ تو ہمارے بس میں نہیں ہے۔ جو ہمیں ملتا ہے وہ ہم لیتے ہیں۔ ان اشعار کے سلسلے میں ایک روایت تھوڑی سی مختلف ہے۔ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہماری حیثیت زمین کی ہے۔ جو بویا گیا وہی ہم پیدا کریں گے۔ رازی، التفسیر الکبیر، جلد ۱۴، جزء ۲۷، ص ۱۷۳، دار الکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۰ء۔

بعض ایسے اندوہ ناک واقعات منقول ہیں کہ انھیں سن کر ہی دل کانپ جاتا ہے۔

ایک شخص نے نبی ﷺ سے اپنے جاہلیت کے زمانہ کا واقعہ سنایا کہ ''میرے ایک بچی تھی اور وہ مجھ سے بہت مانوس بھی تھی۔ جب کبھی میں اسے بلاتا تو بڑی ہی مسرت سے میرے پاس آجاتی۔ چناں چہ ایک دن میں نے اسے آواز دی تو وہ میرے پیچھے پیچھے دوڑی چلی آئی۔ میں اسے اپنے ساتھ لے گیا اور قریب کے ایک کنویں میں جھونک دیا۔ وہ اس وقت بھی ابّا جان ابّا جان کہتی رہی۔'' واقعہ کو سن کر رسول اللہ ﷺ کی آنکھیں اشک بار ہوگئیں۔ یہاں تک کہ ریش مبارک تر ہوگئی[1]

اس سے زیادہ اس کی مظلومیت اور کیا ہوسکتی ہے کہ باپ کا دستِ شفقت اس کے حق میں بھیڑیے کا پنجہ ثابت ہو۔

قیس بن عاصم نے جاہلیت میں آٹھ دس لڑکیاں دفن کی تھیں[2]

اس مظلوم صنف کو وہ زندہ رکھتے بھی تو اس سے حقوقِ حیات سلب کرلیتے تھے۔ شادی کی کوئی حد نہیں تھی، جتنی عورتوں کو چاہتے اپنے نکاح میں رکھتے۔ وہب اسدیؓ نے جس وقت اسلام قبول کیا، ان کے عقد میں دس بیویاں تھیں[3]

غیلان ثقفی مسلمان ہوئے تو ان کے پاس دس بیویاں تھیں[4]

اسی طرح طلاق پر بھی کوئی پابندی نہیں تھی۔ مرد جب چاہتا اور جتنی مرتبہ چاہتا طلاق دیتا اور عدت ختم کرنے سے پہلے رجوع کرلیتا[5] اس طرح وہ زندگی بھر اپنی بیوی کو

---

[1] سنن دارمی، باب ما کان علیہ الناس قبل بعثۃ النبیؐ الخ۔ قرطبیؒ نے اسی طرح کا واقعہ زیادہ تفصیل سے نقل کیا ہے کہ یہ سن کر رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرامؓ رونے لگے۔ آپ نے اس شخص سے فرمایا کہ جاہلیت کے اعمال پر کسی کو سزا دینے کا مجھے حکم ہوتا تو میں اس کی سزا تمھیں ضرور دیتا۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۴، جزء ۷، ص ۶۴۔ ہوسکتا ہے یہ کوئی دوسرا واقعہ ہو۔

[2] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۸ / ۳۰۴

[3] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی من اسلم وعندہ نساء اکثر من اربع

[4] ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی الرجل یسلم وعندہ عشرۃ نسوۃ

[5] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی نسخ المراجعۃ بعد التطلیقات الثلاث

دق کر سکتا تھا۔ایک شخص کے متعلق روایت آتی ہے کہ اس نے اپنی بیوی کو پریشان کرنا چاہا تو اس سے کہا کہ میں نہ تجھے اپنے ساتھ رکھوں گا اور نہ جدا کروں گا، بیوی نے دریافت کیا: وہ کیسے؟ کہا: اس طرح کہ طلاق دوں گا اور جب عدت ختم ہونے لگے گی، رجوع کرلوں گا۔ پھر دوبارہ طلاق دوں گا اور پھر عدت کا زمانہ پورا ہونے سے پہلے رجوع کرلوں گا[1]

خاوند کی زندگی میں عورت اس کے ماتحت رہتی، خاوند کے انتقال کے بعد اس کے ورثاء کا اس پر مکمل حق ہوتا۔ چاہتے تو خود ہی اس سے شادی کر لیتے اور چاہتے تو کسی دوسرے سے شادی کردیتے اور وہ اس میں بھی آزاد تھے کہ اس کی شادی ہی نہ ہونے دیں[2]

بیوہ کے مال پر قبضہ کرنے کے لیے اسے دوبارہ ازدواجی زندگی ہی سے محروم کردیتے، بعض اوقات کسی کمسن لڑکی کے بڑے ہونے تک اس کا نکاح روکے رکھتے تاکہ وہ اس سے شادی کرسکیں[3]

سوتیلی ماں تک سے شادی کرنا ان کے نزدیک معیوب نہیں تھا۔ علامہ ابو بکر جصاصؒ لکھتے ہیں:

و قد كان نكاح امرأة الأب مستفيضاً شائعاً فى الجاهلية[4] — سوتیلی ماں سے نکاح جاہلیت میں عام تھا۔

---

[1] المستدرک، الحاکم، جلد ۲/ ۳۰۷۔ حدیث کے راوی یعقوب بن حمید کے بارے میں امام ذہبیؒ فرماتے ہیں ''ضعّفہ غیرواحد'' لیکن حافظ ابن حجرؒ نے کہا ہے کہ ان سے امام بخاری نے اپنی کتاب ''افاعل العباد'' میں احادیث لی ہیں اور ابن ماجہ اور دیگر محدثین نے بھی ان کی روایات کو قبول کیا ہے۔ لسان المیزان جلد ۶، ص ۷

[2] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النساء، باب قولہ لاتحل لکم ان ترثوا النساء کرہا۔ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب قولہ لاتحل لکم ان ترثوا النساء۔

[3] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۲/ ۲۶۶-۲۶۷، دار الحدیث القاہرہ، ۲۰۰۵ء

[4] جصاص، احکام القرآن: ۲/ ۱۵۳، ۱۵۴۔ دار الکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۹۴ء۔ اس کی بعض مثالیں بھی ملتی ہیں۔ معروف سیرت نگار سہیلی کہتے ہیں کہ اہل عرب میں یہ ایک عام بات تھی۔ اسی وجہ سے قرآن نے کہا ''الا ما قد سلف'' یعنی جو ہو چکا وہ معاف ہے۔ ۳/ ۲۷۲

اگر اتفاق سے کوئی حسین اور صاحبِ ثروت یتیم لڑکی کسی شخص کی سرپرستی میں آجاتی تو خود ہی اس سے نکاح کرلیتا اور مہر ٹھیک سے ادا نہ کرتا[1]

مرد وراثت کے حق دار ہوتے۔ عورت کا اس میں کوئی حصہ نہیں تھا۔[2]

جنگِ احد کے بعد کا واقعہ ہے کہ ثابت بن قیسؓ کی بیوی نے نبی ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر شکایت کی کہ جنگ احد میں ثابت شہید ہوگئے، ان کی دو بچیاں ہیں، لیکن ثابت کے بھائی نے ان کے پورے مال پر قبضہ کرلیا ہے اور ان بچیوں کے لیے ایک حبہ نہیں چھوڑا ہے، بتایئے کہ ان کی شادی کیسے ہو؟[3]

اسلام نے وراثت میں عورت کا حصہ متعین کیا تو اہلِ عرب کو بڑا تعجب ہوا اور انھوں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! کیا عورت آدھی میراث کی حق دار ہے جو نہ گھوڑے پر سوار ہوسکتی، نہ دفاع کرسکتی ہے۔[4]

یہ مختصر سی داستاں ہے عرب میں عورت کی مظلومی اور محرومی کی۔ اس ماحول میں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا اور مختصر سی مدت میں عورت کی قسمت بدل دی اور سرزمین عرب پر ایک نئی عورت وجود میں آگئی۔ اسلام نے دنیا کو خدا، رسول اور آخرت کے واضح تصور، انسان کی برتری، اعلیٰ اخلاق، انسانوں کے درمیان مساوات اور عدل و انصاف پر مبنی نظام دیا۔ اس میں عورت کا احترام تھا، عدل و انصاف تھا، ظلم سے حفاظت تھی، اس کے حقوق اور ذمہ داریاں متعین تھیں اور وہ پورے اطمینان سے کاروبارِ حیات میں اپنا کردار ادا کر رہی تھی۔ آئندہ صفحات میں اس کی تفصیل ملے گی۔



---

[1] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النساء، باب و ان خفتم ان لّا تقسطوا فی الیتامیٰ

[2] بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ النساء، باب ولکم نصف ما ترک ازواجکم، مع فتح الباری، ۹/ ۱۱۷

[3] ترمذی، کتاب الفرائض، باب ماجاء فی میراث البنات۔ ابوداؤد، کتاب الفرائض، باب ماجاء فی میراث الصلب [4] ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۲/ ۲۵

اساسی تصورات

دنیا کا ہر نظام بعض نظریات کے تابع ہوتا ہے۔ ان ہی کی اساس پر اس کی تشکیل ہوتی ہے۔ افراد کے ساتھ سلوک کیا جاتا ہے، اجتماعی رویہ متعین ہوتا ہے، قانون اور ضابطے وضع کیے جاتے ہیں، معاشرتی، تمدنی اور سیاسی حقوق متعین ہوتے ہیں۔ ان ہی کی روشنی میں پورے نظام کا نقشۂ کار اور عملی ڈھانچہ تیار ہوتا ہے۔ اس لیے کسی بھی نظام کو یا اس کے کسی شعبہ کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان نظریات سے واقفیت ضروری ہے، جن پر وہ قائم ہے۔ اس کے بغیر اس کی تفصیلات کو سمجھنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اسلام نے جو نظامِ حیات عطا کیا ہے وہ بھی بعض فکری بنیادوں پر قائم ہے۔ اسلامی معاشرے میں عورت کی حیثیت، مرتبہ و مقام، اس کے حقوق و اختیارات اور فرائض و واجبات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے عورت کے بارے میں اسلام کے اصولی موقف سے واقفیت حاصل ہو، تاکہ اس کی روشنی میں تفصیلات کا مطالعہ کیا جاسکے۔

۱- قصہ آدم وحوّا

اللہ تعالیٰ نے اپنے دستِ خاص سے ایک مخلوق پیدا کی۔ اس میں اپنی روح پھونکی اور اسے اشیاء کا علم عطا کیا۔ یہ مخلوق تھی تو خاکی، لیکن فرشتوں کو حکم دیا گیا کہ اس کے سامنے سر جھکا دیں۔ اس کے لیے زمین و آسمان اور بحر و بر مسخر کر دیے گئے۔ اسے غیر معمولی قوتیں اور صلاحیتیں عطا کی گئیں۔ اور ساری مخلوقات میں اس کا تفوق اور برتری قائم کردی گئی۔ یہ تھے حضرت آدم علیہ السلام۔ لیکن ان کی شخصیت میں ایک خلا تھا، اس خلا کو پر کرنے کے لیے انھیں ایک جوڑے کی ضرورت تھی۔ ورنہ ان کی شخصیت ادھوری رہ جاتی۔ چناں چہ یہ جوڑا بھی فراہم کیا گیا۔ یہ جوڑا ان ہی سے نکالا گیا تھا۔ کیوں کہ کوئی دوسری نوع یا دوسری مخلوق جو ان کی ساخت اور فطرت سے مناسبت نہ رکھتی ہو ان کا جوڑا نہیں بن سکتی تھی۔ ہمیں نہیں معلوم کہ حضرت آدم علیہ السلام سے ان کا یہ جوڑا کیوں کر نکالا گیا؟ ہوسکتا ہے یہ قدرت کا کوئی غیر معمولی کرشمہ ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ یہ اس بات کی تعبیر ہو کہ جن اجزاء سے حضرت آدم علیہ السلام کا خمیر تیار ہوا تھا اور جن صفات اور خصوصیات کے وہ حامل تھے وہی اجزاء اور خصوصیات ان کے جوڑے میں بھی تھیں۔ بہر حال یہ جوڑا ایسا تھا جس سے حضرت آدم علیہ السلام کو سکون، چین اور راحت ملی۔ یہ حضرت حوّا تھیں۔

هُوَ الَّـذِیْ خَلَقَـكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِـدَةٍ وَّ جَعَـلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَـا لِيَسۡكُنَ اِلَيۡهَـا ۚ (الاعراف:۱۸۹)	وہ اللہ ہی ہے، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا تاکہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔

اب ان کی زندگی کا سفر ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جنت میں رکھا گیا۔ حوا بھی ساتھ تھیں۔ دونوں کو جنت کی نعمتوں سے پورا پورا فائدہ اٹھانے کی اجازت تھی۔ صرف ایک درخت تھا، جس کے قریب پھٹکنے سے بھی منع کیا گیا تھا۔ لیکن شیطان نے انھیں دھوکا دیا اور انھوں نے اس شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں اس لباس سے محروم ہوگئے، جو جنت میں عطا کیا گیا تھا۔ اور وہاں کے پتوں سے اپنے جسم کو چھپانے پر مجبور ہوگئے۔

فَلَمَّا ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفَانِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ؕ

پھر جب انھوں نے اس درخت کا مزا چکھا تو ان کے سامنے ان کی شرم گاہیں کھل گئیں اور وہ اپنے اوپر (ستر پوشی کے لیے) جنت کے پتے جوڑنے لگے۔

غلطی دونوں سے ہوئی تھی، لہٰذا سرزنش بھی دونوں ہی کو کی گئی۔

وَ نَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَ اَقُلْ لَّكُمَا اِنَّ الشَّيْطَانَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ○ (الاعراف:۲۲)

ان کے رب نے پکارا کہ کیا میں نے تم دونوں کو اس درخت سے نہ روکا تھا اور نہ کہا تھا کہ شیطان تم دونوں کا کھلا دشمن ہے۔

آدم اور حوا علیہما السلام دونوں ہی کو اپنی غلطی کا احساس ہوا اور وہ اللہ سے معافی کے طلب گار ہوئے۔

قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَ اِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ○ (الاعراف:۲۳)

دونوں نے کہا اے ہمارے رب ہم نے اپنے اوپر زیادتی کی، اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ فرمائے تو ہم ضرور خسارہ اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے۔

دونوں کی توبہ قبول ہوئی اور ان کو زمین پر بھیج دیا گیا اور یہ بتا دیا گیا کہ شیطان ان کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ وہ ان کا دشمن ہے اور انھیں اللہ کی عبادت سے پھیرنے کی

مسلسل کوشش کرے گا۔

قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَ لَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّ مَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ○ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَ مِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ○ (الاعراف: ۲۴، ۲۵)

اللہ نے فرمایا تم (یہاں سے زمین پر) اتر جاؤ۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو تمہارے لیے زمین ہی میں رہنے کی جگہ ہے اور ایک خاص وقت تک زندگی کا سامان ہے۔ فرمایا اسی میں تم زندہ رہوگے، اسی میں مروگے اور اسی سے نکالے جاؤ گے۔

اس کے ساتھ انھیں یہ بھی بتا دیا گیا کہ شیطان انھیں گم راہ کرنے کی کوشش تو کرے گا، لیکن اللہ تعالیٰ اِن کی ہدایت اور رہ نمائی بھی ضرور فرمائے گا۔ اس ہدایت کی پیروی کرنے والے انعام و اکرام کے مستحق ہوں گے اور جو اس کی خلاف ورزی کریں گے ان پر خدا کا عتاب نازل ہوگا۔ چناں چہ ارشاد ہے:

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ○ وَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (البقرۃ: ۳۸، ۳۹)

ہم نے انھیں حکم دیا۔ اتر جاؤ تم سب یہاں سے۔ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت پہنچے تو جو میری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے نہ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے اور جو اس کا انکار کریں گے اور ہماری آیتوں کی تکذیب کریں گے وہ آگ میں جانے والے ہیں۔ وہیں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

ان ہدایات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوّا کو زمین پر بھیج دیا۔ ان دونوں سے یہاں ان کی نسل پھیلی۔ ان جیسے بے شمار مرد اور عورتیں پیدا ہوئیں۔ ان کے درمیان رشتے اور تعلقات قائم ہوئے، مختلف قومیں اور قبیلے وجود میں آئے اور آدم و حوا کی اولاد پورے روئے زمین پر پھیل گئی۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ

اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے

مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَ بَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّ نِسَآءً ۚ وَ اتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَ لُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا۝ (النساء:۱)

اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلا دیے اور اللہ سے ڈرو، جس کے ذریعہ تم ایک دوسرے سے مدد طلب کرتے ہو اور رشتوں کا احترام کرو۔ بے شک اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

انسانِ اول اور اس کے جوڑے کی تخلیق، جنت میں ان کے قیام، ان کی غلطی، ان کی توبہ، شیطان کی ان سے عداوت، خدا کی طرف سے ان کی ہدایت کا انتظام، زمین پر ان کی آمد اور ان کی نسل کے پھیلنے کا قرآنِ مجید نے جس طرح ذکر کیا ہے اس میں کہیں سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ ان میں سے کون برتر اور کون کم تر ہے؟ کس کا درجہ اونچا اور کس کا مقام پست اور فروتر ہے۔ یہ پوری داستان آدم و حوا کے گرد اس طرح گھومتی ہے کہ وہ ایک حیثیت اور ایک درجہ کے معلوم ہوتے ہیں۔

بائبل میں بھی حضرت آدم و حوّا کا یہ واقعہ بیان ہوا ہے، لیکن اس سے حضرت حوّا کی بالکل ایک دوسری تصویر ہمارے سامنے آتی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ نسل انسانی کے پہلے فرد حضرت آدم علیہ السلام جنت میں عیش و راحت کی زندگی گزار رہے تھے، کیوں کہ وہ خدا کے فرماں بردار تھے، لیکن ان کی بیوی حوا نے انھیں سب سے پہلے خدا کی نافرمانی پر اکسایا اور ان کو ایک ایسا پھل کھلایا جس کے کھانے سے خدا نے انھیں روکا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خدا کی نعمتوں سے محروم کردیے گئے اور ان کو مشقت اور تکلیف کی زندگی نصیب ہوئی۔

عہد نامہ قدیم میں ہے کہ جب خدائے تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے دریافت کیا کہ ”کیا تو نے اس درخت کا پھل کھایا جس کی بابت میں نے تجھ کو حکم دیا تھا کہ اسے نہ کھانا؟“ تو آدم علیہ السلام نے جواب دیا کہ ”جس عورت کو تو نے میرے ساتھ کیا ہے اس نے مجھے اس درخت کا پھل دیا اور میں نے کھایا۔“

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حوّا سے کہا:

''میں تیرے دردِ حمل کو بہت بڑھاؤں گا، تو درد کے ساتھ بچے جنے گی اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔'' (پیدائش: باب۳)

دوسرے الفاظ میں حوّا نے آدم علیہ السلام کو گمراہ کر کے جس جرم کا ارتکاب کیا تھا خدا کی طرف سے اس جرم کی یہ سزا ملی کہ وہ حمل اور ولادت کی تکلیف میں مبتلا کی گئی اور ہمیشہ کے لیے اس پر مرد کا اقتدار اور غلبہ قائم کر دیا گیا۔ اب قیامت تک مرد، عورت پر حکومت کرتا رہے گا۔

قرآن مجید میں ایک اور جگہ اس واقعہ کا جس طرح ذکر کیا گیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم اور حوّا علیہما السلام زندگی کے سفر میں گو ساتھ تھے لیکن ذمے دار حضرت آدمؑ تھے۔ حضرت حوّا نے جو کچھ کیا ان کی اتباع میں کیا۔ اس سے خود بخود اس خیال کی تردید ہو جاتی ہے کہ حضرت حوّا نے حضرت آدم کو گمراہ کیا تھا۔ ارشاد ہے:

وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا۝ؑ وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى۝ فَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اِنَّ هٰذَا عَدُوٌّ لَّكَ وَ لِزَوْجِكَ فَلَا يُخْرِجَنَّكُمَا مِنَ الْجَنَّةِ فَتَشْقٰى۝ اِنَّ لَكَ اَلَّا تَجُوْعَ فِيْهَا وَ لَا تَعْرٰى۝ۙ وَ اَنَّكَ لَا تَظْمَؤُا فِيْهَا وَلَا تَضْحٰى۝ فَوَسْوَسَ اِلَيْهِ الشَّيْطٰنُ قَالَ يٰٓاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَ مُلْكٍ لَّا يَبْلٰى۝

ہم نے اس سے پہلے آدم کو تاکید کر دی تھی لیکن وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہیں پایا۔ اور جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم علیہ السلام کو سجدہ کرو تو وہ سجدے میں گر پڑے، مگر ابلیس نے انکار کر دیا۔ ہم نے کہا اے آدم! یہ تمھارا اور تمھاری بیوی کا دشمن ہے، کہیں یہ جنت سے تم دونوں کو نہ نکال دے اور تم مصیبت میں پڑ جاؤ۔ یہاں (تمھارے لیے ہر طرح کی آسائش ہے کہ) تمھیں نہ بھوک ستاتی ہے نہ تم برہنہ رہتے ہو، نہ پیاس لگتی ہے اور نہ گرمی پریشان کرتی ہے۔ شیطان نے اس کے دل میں وسوسہ ڈالا کہ اے آدم کیا میں تمہیں وہ درخت نہ بتاؤں کہ جس کے کھانے سے تم ہمیشہ زندہ رہو اور ایسی بادشاہی تمہیں ملے جو کبھی ختم نہ ہو (پس وہ

فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَ طَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ز وَ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى ۝ ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَ هَدٰى ۝ قَالَ اهْبِطَا مِنْهَا جَمِيْعًا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ج فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى ۵ فَمَنِ اتَّبَعَ هُدَايَ فَلَا يَضِلُّ وَ لَا يَشْقٰى ۝ وَ مَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّ نَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ۝ قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْۤ اَعْمٰى وَ قَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ۝ قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ج وَ كَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ۝ وَ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ اَسْرَفَ وَ لَمْ يُؤْمِنْ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ ط وَ لَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَشَدُّ وَ اَبْقٰى ۝

(طٰہٰ: ١١٥-١٢٧)

اس کے دھوکے میں آ گیا) اور وہ (اور اس کی بیوی) دونوں اس درخت کا پھل کھا گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوراً ان کی شرم گاہیں ان کے سامنے کھل گئیں اور وہ جنت کے پتوں سے انھیں چھپانے لگے (اس طرح) آدم (علیہ السلام) نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور راہِ راست سے بھٹک گیا۔ پھر اس کے رب نے اسے چن لیا اس کی توبہ قبول کی اور اسے راہ دکھائی۔ ارشاد ہوا اتر جاؤ تم سب یہاں سے۔ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ پھر اگر تمھارے پاس میری ہدایت پہنچے تو جو شخص میری ہدایت پر چلے گا وہ نہ گم راہ ہوگا اور نہ مصیبت میں پڑے گا اور جو میری نصیحت سے اعراض کرے گا، اس کے لیے تنگی کی زندگی ہوگی اور ہم اسے قیامت میں اندھا بنا کر اٹھائیں گے۔ وہ کہے گا اے رب تم نے مجھے اندھا بنا کر کیوں اٹھایا جب کہ میں دیکھنے والا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا۔ اسی طرح ہماری آیتیں تم تک پہنچی تھیں لیکن تم نے انھیں فراموش کر دیا۔ اسی طرح آج تم بھی بھلائے جا رہے ہو۔ اس طرح ہم بدلہ دیتے ہیں ہر اس شخص کو جو حد سے بڑھ جائے اور اپنے رب کی آیتوں پر ایمان نہ لائے اور آخرت کا عذاب زیادہ سخت اور باقی رہنے والا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے پہلے ہی روز کہہ دیا تھا کہ شیطان ان کا اور ان کی بیوی کا دشمن ہے، اس لیے انھیں ہوشیار رہنا چاہیے کہ کہیں وہ ان کو اور ان کی بیوی کو دھوکے میں نہ ڈال دے اور وہ جنت اور اس کی نعمتوں سے محروم نہ ہوجائیں۔ یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا۔ حضرت آدم علیہ السلام کو جس درخت کے قریب جانے سے منع کیا گیا تھا، اس کے بارے میں شیطان نے انھیں بتایا

کہ اس درخت میں کوئی خرابی نہیں ہے اس سے تو انسان کو حیاتِ جاوداں اور عیشِ دوام ملتا ہے۔ اسی وجہ سے اللہ نے اس سے منع بھی کیا ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام اس کے دھوکے میں آ گئے۔ شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ اس کے نتیجہ میں جنت سے نکال کر زمین پر بھیج دیے گئے۔ یہ واقعہ جس طرح بیان ہوا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا خطاب اصلاً حضرت آدم علیہ السلام ہی سے تھا اور شیطان نے بھی اصلاً حضرت آدم ہی کو ورغلایا اور دھوکے میں ڈالا، اور انھوں نے شجر ممنوعہ کا پھل کھا لیا۔ ان کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو انھوں نے فوراً توبہ کی۔

حضرت آدمؑ سے جو غلطی ہوئی تھی اس میں بلاشبہ حضرت حوّا بھی شریک تھیں اور توبہ بھی انھوں نے کی۔ قرآن مجید نے حضرت آدم علیہ السلام کی غلطی اور توبہ کا تو مستقل ذکر کیا ہے، لیکن حضرت حوا کی غلطی کا اس نے الگ سے ذکر تک نہیں کیا ہے۔ باقی رہا ان کا حضرت آدم علیہ السلام کو گم راہ کرنا تو اس کے ذکر کے کیا معنی، اس کی طرف قرآن نے کوئی اشارہ تک نہیں کیا ہے۔

ഇ ര

۲- انسان محترم ہے

اسلام انسان کی عظمت و سربلندی کا پیام بر ہے۔ وہ انسان کو ذلت اور پستی سے نکال کر رفعت و سربلندی عطا کرتا ہے۔ اس نے یہ حقیقت کھولی کہ انسان اپنی ظاہری شکل وصورت، قد و قامت اور فطری صلاحیتوں کے لحاظ سے قدرت کا شاہ کار ہے۔ اسے نطق و گویائی سے نوازا گیا ہے اور وہ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرسکتا ہے۔ اس کے لیے کرۂ ارض کو، یہاں کی فضاؤں اور سمندروں کو مسخر کیا گیا ہے، وہ ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اسے بہترین سامانِ زیست، عمدہ اور نفیس غذائیں فراہم کی گئی ہیں، تاکہ وہ آسانی سے خوش گوار زندگی گزار سکے۔[۱]

انسان اشرف المخلوقات ہے۔ دنیا کی کوئی مخلوق اس کے شرف کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ اسلام خدائے واحد کی بندگی کی طرف بھی اس لیے بلاتا ہے، تاکہ اس کے ایک در پر سر نیاز جھکا کر کائنات کی تمام مخلوقات کے مقابلہ میں سربلند ہوجائے۔

وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِىْٓ اٰدَمَ وَ حَمَلْنٰهُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَ رَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ فَضَّلْنٰهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ

ہم نے بنی آدم کو بزرگی بخشی اور انہیں خشکی و تری میں (قطعِ مسافت کے لیے) سواریاں عطا کیں اور صاف ستھری چیزوں کی روزی دی اور اپنی بہت سی مخلوقات پر

۱؎ اس کی کسی قدر تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيلًا۝ (بنی اسرائیل:۷۰) انہیں فضیلت دی[۱]

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہترین ساخت عطا کی ہے۔ عمدہ شکل وصورت، سروقد، حسنِ قامت، عقل وفہم، بھلے برے کی تمیز اور حکمت و دانائی سے نوازا ہے۔ ان صفات سے دوسری مخلوقات یا تو محروم ہیں یا ان کو اس کا بہت تھوڑا حصہ ملا ہے۔ انسان کے بارے میں فرمایا گیا:

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۝ (التین:۴) ہم نے انسان کی بہتر طریقہ پر تخلیق کی۔

انسان کی عظمت کی اس سے بڑی دلیل اور کیا ہوسکتی ہے کہ وہ مسجود ملائکہ ہے۔

اِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَةِ اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِيْنٍ۝ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ۝ فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ۝ اِلَّآ اِبْلِيْسَ اِسْتَكْبَرَ وَ كَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ۝ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ

تیرے رب نے جب فرشتوں سے کہا کہ میں مٹی سے ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں، پھر جب ٹھیک سے اسے بنالوں اور اس میں اپنی روح پھونک دوں تو تم اس کے آگے سجدہ میں گر پڑو۔ پس تمام کے تمام فرشتوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے، اس نے غرور کیا اور (واقعہ یہ ہے کہ) وہ نافرمانوں میں سے تھا، تو اللہ نے فرمایا:

---

[۱] یہاں ایک سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ کیا اللہ کی مخلوقات میں کوئی اور مخلوق انسان سے برتر اور فایق ہے؟ زمخشری اور بعض دوسرے حضرات کا خیال ہے کہ ملائکہ کو انسان پر فضیلت اور برتری حاصل ہے، اسی لیے آیت میں 'کثیر' کا لفظ آیا ہے۔ لیکن 'کثیر' کے معنی تمام کے بھی ہوسکتے ہیں جیسے 'قلیل' کہہ کر نفی مراد لی جاتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ دوسری مخلوقات انسان سے زیادہ ہیں اور ان سب پر اللہ نے اسے تفوق اور برتری عطا کی ہے۔ بہرحال آیت سے انسان پر ملائکہ کی برتری ثابت نہیں ہوتی۔ ملاحظہ ہو۔ الکشاف عن حقائق التنزیل مع حاشیہ احمد بن منیّر الاسکندری: ۲/ ۲۵۳-۲۵۵۔ نیز قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد۵، جزء ۱۰، ص۱۹۰، ۱۹۱۔ بیضاوی نے اوپر کی تشریح پر عدم اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ انوار التنزیل واسرار التاویل: ۱/ ۵۷۷

بِيَدَيَّ ۭ اَسۡتَكۡبَرۡتَ اَمۡ كُنۡتَ مِنَ الۡعَالِيۡنَ ○ (ص:۷۱-۷۵)

اے ابلیس! کس چیز نے تجھ کو روک دیا اس مخلوق کو سجدہ کرنے سے جسے میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا؟ تو نے گھمنڈ کیا یا تو بہت بڑے درجہ والا ہے؟

حضرت آدم علیہ السلام کے مقابلہ میں شیطان نے اپنی برتری کا اظہار کیا، استکبار کی روش اختیار کی، اللہ تعالیٰ کا حکم ماننے سے انکار کر دیا، اس لیے راندۂ درگاہ ہوا۔

فرشتوں کا حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنا نوعِ انسانی کی عظمت کی دلیل ہے۔ یہ عظمت اس کے دونوں اصناف، مرد اور عورت کو حاصل ہے۔ اس میں ایک صنف کو اس کا مستحق اور دوسری کو غیر مستحق قرار دینے اور ان کے درمیان عزت و ذلت کے جھوٹے معیارات قائم کرنے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

﴿﴾

۳-عورت کو حقِ حیات حاصل ہے

سرزمینِ عرب پر اسلام کی آمد سے قبل ظلمت کے جو بادل چھائے ہوئے تھے اس میں بعض اوقات لڑکیوں کو زندہ درگور کردیا جاتا تھا۔ کبھی تو ماں، جس کا سینہ مہر و محبت کا سرچشمہ ہوتا ہے، وضعِ حمل کے بعد جب دیکھتی کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے تو اسے موت کے آغوش میں پہنچا دیتی۔ بعض اوقات لڑکی چھ سال کی عمر کو پہنچ جاتی، اس کا باپ گڑھا کھود کر اس میں اسے پھینک دیتا اور مٹی سے پاٹ دیتا۔ جو معصوم جان اس درندگی سے بچ جاتی اسے بھیڑ کے اون سے بنا ہوا کپڑا پہنا کر اونٹ اور بکریاں چرانے میں لگا دیتے[1]

قیس بن عاصمؓ نے دورِ جاہلیت میں آٹھ لڑکیاں اور ایک روایت کے مطابق بارہ تیرہ لڑکیاں زندہ دفن کی تھیں۔ انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے فرمایا: ان کے بدلے اتنے ہی غلام آزاد کردو۔ انھوں نے اس پر عمل کیا۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کا سرمایہ اونٹ تھے۔ آپ کے حکم سے انھوں نے اتنے اونٹ ذبح کیے اور صدقہ کیا[2] (ہوسکتا ہے دونوں باتوں پر عمل کیا ہو)۔

اس ظلم کا بعض لوگوں کو احساس تھا۔ مشہور شاعر فرزدق کے دادا صعصعہ بن ناجیہ لوگوں کو اس ظلم و بربریت سے منع کرتے تھے۔ اسلام لانے کے بعد انھوں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا کہ میں نے ترسٹھ (۶۳) (ایک روایت میں ہے کہ تین سو ساٹھ (۳۶۰)۔ ہوسکتا

---

[1] زمخشری، الکشاف عن حقائق التنزیل: ۴ / ۶۹۴

[2] ابن الاثیر، اسد الغابہ: ۴ / ۴۱۲۔ ابن کثیر، تفسیر القرآن العظیم: ۸ / ۳۰۴

ہے اس میں مبالغہ ہو) لڑکیوں کو زندہ درگور ہونے سے بچایا ہے، ہر ایک کو دس ماہ کی دو گابھن اونٹنیوں اور ایک اونٹ کے عوض حاصل کرتا تھا۔ کیا اس کا اجر مجھے ملے گا؟ آپ نے فرمایا: یہ تمھارا حسن سلوک ہے۔ اس کے صلہ میں اللہ تعالیٰ نے تمھیں اسلام کی نعمت سے نوازا ہے[1]

یہ وحشیانہ حرکت انسان کی فطرت کے خلاف ہے، اس لیے اس طرح کی اور بھی انفرادی کوششیں شاید ہوتی رہی ہوں۔ اس سے یہ تو نہیں کہا جاسکتا کہ عرب میں قتل بنات عام تھا۔ اس سے ان کا وجود ہی آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ عرب میں لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے کے واقعات شاذ و نادر نہ تھے، بلکہ بہ کثرت ہوتے رہتے تھے۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ قبیلہ ربیعہ اور مضر میں ایسے لوگ تھے جو لڑکیوں کو دفن کرتے تھے۔ (کبھی) دو آدمیوں کے درمیان بات طے ہوتی تھی کہ وہ ایک لڑکی کو باقی رکھے گا اور دوسری کو ختم کردے گا۔ بغوی کہتے ہیں کہ اس کا رواج قبیلہ ربیعہ اور مضر اور بعض عربوں میں تھا، قبیلہ کنانہ میں اس پر عمل نہیں ہوتا تھا۔[2] قبیلہ کندہ کا بھی اس سلسلے میں ذکر آتا ہے، لیکن یہ کوئی عام روش نہ تھی۔ قاضی ابو محمد کہتے ہیں:

كان جمهور العرب لاَ يفعله[3] عام عرب یہ نہیں کرتے تھے۔

اسلام نے شروع ہی سے 'قتل اولاد' کو ایک اہم ایشو بنایا اور اس کے خلاف آواز بلند کی۔ اس کے نزدیک کسی ایک بے گناہ کا قتل نوعِ انسانی کا قتل ہے۔ اس کی بدترین صورت یہ ہے کہ انسان اپنی معصوم اولاد اور جگر گوشوں کو قتل کردے۔ اس دنیا میں جو بھی انسان پیدا ہوتا ہے حقِ زیست لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اسے لازماً یہ حق ملنا چاہیے۔ اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوسکتا ہے کہ ماں باپ کا دست شفقت جلّاد کا ہاتھ ثابت ہو، وہ اپنے جگر گوشوں کا حق حیات سلب کرلیں اور انھیں موت کی نیند سلادیں۔

---

[1] ابن الاثیر، اسد الغابہ فی معرفۃ الصحابۃ: ۳/ ۲۲، ۲۳۔ زمخشری، الکشاف مع حاشیۃ الشیخ محمد علیان: ۴/ ۷۹۵
[2] خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، مع معالم التنزیل، البغوی۔ ۲/ ۴۵۳
[3] ابن عطیۃ الاندلسی، المحرر الوجیز فی تفسیر الکتاب العزیز: ۳/ ۴۷۴، طبع دولۃ قطر

قتل اولاد کے محرکات

قتل اولاد کے مختلف محرکات تھے۔ بڑا محرک تو غربت و افلاس یا اس کا اندیشہ تھا۔ خاص لڑکیوں کو ختم کرنے کے کچھ اور اسباب بھی تھے۔

قبائل عرب کے درمیان جنگ عام تھی۔ کسی بھی وقت کوئی قبیلہ دوسرے پر حملہ کردیتا۔ وہ سوچتے تھے کہ عورتیں اپنا دفاع نہیں کرسکتیں، وہ آسانی سے گرفتار ہوجائیں گی اور باندی بنالی جائیں گی۔ اس سے بہتر ہے کہ ان کا وجود نہ رہے۔

یہ غلط عقیدہ بھی ان میں تھا کہ فرشتے، اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں۔ اگر ہم اپنی لڑکیوں کو ختم کریں گے تو وہ ان ہی سے مل جائیں گی۔ اس لیے یہ کوئی غلط عمل نہیں ہے۔

وہ اسے اپنی توہین سمجھتے تھے کہ ان کی لڑکی دوسرے قبیلہ کے کسی فرد کے نکاح میں جائے اور ان پر اس قبیلہ کی برتری قائم ہوجائے۔

لڑکوں کے سلسلے میں یہ بھی ہوتا تھا کہ کبھی ایک شخص نذر مان لیتا کہ اگر مجھے اتنے لڑکے ہوں گے تو ایک لڑکے کو قربان کردوں گا۔ مشہور واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جد امجد عبد المطلب نے نذر مانی تھی کہ اگر ان کے دس لڑکے ہوں گے اور وہ ان کی دفاع اور حمایت کے قابل ہوجائیں گے تو وہ ان میں سے ایک کو اللہ کی راہ میں کعبہ کے پاس قربان کردیں گے۔ جب سب بچے اس عمر کو پہنچے تو انھوں نے اپنی نذر پوری کرنے کا ارادہ کیا۔ بچے بھی تیار ہوگئے۔ اس کے لیے قرعہ اندازی ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کے والد ماجد عبد اللہ کا نام نکلا۔ عبد المطّلب نے ان کی قربانی کا ارادہ کیا تو قریش نے منت سماجت کی کہ وہ اس اقدام سے باز آجائیں۔ پھر ایک کاہن کے مشورے سے فدیہ میں سو اونٹ ذبح کیے اور عبد اللہ کی قربانی کے ارادے سے باز رہے۔[۱]

اس طرح قتل اولاد کے پیچھے مختلف سماجی، معاشی اور مذہبی محرکات تھے۔ قرآن مجید

۱۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل ابن ہشام کی السیرۃ النبویۃ: ۱/ ۱۸۸، ۱۸۹ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نے اس کے ایک ایک پہلو پر تنقید کی، ان کے اوہام وخرافات کی تردید کی اور ان کی نامعقولیت واضح کی، غلط تصورات کی اصلاح کی اور صحیح تصور پیش کیا۔

مشرکین عرب کے فکر و عمل پر شرک کا جس طرح غلبہ تھا اس کا سورۂ انعام میں تفصیل سے ذکر ہے۔ اسی سلسلے میں فرمایا کہ وہ اپنی کھیتی باڑی اور مویشی میں ایک حصہ خدا کا اور ایک حصہ اپنے مزعومہ خدا کے شریکوں کا رکھتے ہیں۔ ان کے یہ شریک انہیں اتنے عزیز ہیں یا ان پر ان کا اتنا خوف طاری ہے کہ اللہ کا حصہ تو ان شریکوں کے حصے میں چلا جاتا ہے، لیکن شریکوں کا جو حصہ ہے وہ اللہ کے حصہ میں کبھی شامل نہیں ہو پاتا۔ اس کے بعد فرمایا:

وَ كَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ اَوْلَادِهِمْ شُرَكَاؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَ لِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ○ (الانعام:۱۳۷)

اسی طرح بہت سے مشرکین کو خدا کے ساتھ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں نے ان کی اولاد کے قتل کو آراستہ کر دیا ہے، تاکہ ان کو ہلاک کر دیں اور ان کے دین کو ان کے لیے خلط ملط کر دیں۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ ایسا نہ کرتے۔ چھوڑو ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو۔

آیت میں 'کثیر من المشرکین' (بہت سے مشرکین) کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد وہ مشرکین ہیں جو قتلِ اولاد کا ارتکاب کر رہے تھے۔ ان کی ایک بڑی تعداد تھی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ عرب کی اکثریت اس میں ملوّث تھی۔[1]

آیت سے قتل اولاد سے متعلق بعض باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱- مشرکین نے خدا کا جن کو شریک قرار دے رکھا تھا انھوں نے قتل اولاد کو ان کے لیے مزین کر دیا تھا۔ ایک غلط اور بھیانک عمل کو اس طرح آراستہ کر دیا تھا کہ وہ اس کی قباحت اور سنگینی کو محسوس نہیں کرتے تھے، بلکہ بعض اوقات وہ اسے ایک پسندیدہ فعل

---

[1] مفسر ابن عطیہ کہتے ہیں۔ الکثیر فی ھٰذہ الاٰیة یراد به من کان یئد من مشرکی العرب۔ المُحرر الوجیز: ۴/۶۷

سمجھتے تھے۔

۲- شرکاء سے مراد کون ہیں؟ یہ وہ شیاطین ہیں جو غلط اور فاسد خیالات ذہنوں میں ڈالتے رہتے ہیں اور انسان شعوری یا غیر شعوری طور پر ان کو اپنا لیتا ہے۔ اس میں وہ مذہبی راہ نما اور پروہت اور پادری بھی ہیں جو کسی غلط کام کو مذہبی رنگ دیتے ہیں اور ان کے معتقدین اسے مذہبی عمل سمجھ کر اختیار کر لیتے ہیں۔ ان میں گم راہ لیڈر اور رہ نما بھی آتے ہیں جو مختلف حکمتیں بتا کر قتلِ اولاد کو جائز قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اس میں شامل ہیں۔

۳- تیسری بات یہ کہی گئی لِیُرۡدُوۡهُمۡ (تا کہ انہیں ہلاک کر دیں) اس کے ذریعہ یہ حقیقت واضح کی گئی کہ قتل اولاد ہلاکت اور تباہی کا راستہ ہے۔ جو فرد یہ راہ اختیار کرتا ہے وہ نسل کشی کا ارتکاب کرتا اور اپنے ہی دست و بازو قطع کرتا ہے۔ جو قوم اس پر عمل کرتی ہے وہ اپنی افرادی قوت کو ختم کرتی چلی جاتی ہے اور بالآخر تباہ ہو کر رہتی ہے۔ اسی ہلاکت کا راستہ شیاطینِ جن و انس ان کو دکھا رہے ہیں۔ قتل اولاد کے جرم ہونے کا احساس تو شاید کسی نہ کسی شکل میں موجود رہا ہے، لیکن قرآن مجید نے اس جرم کی شناعت اور اس کے نتائجِ بد سے دنیا کو سب سے پہلے اس تفصیل سے آگاہ کیا۔ تاریخ اس کی تصدیق کر رہی ہے۔ آج اس کی وجہ سے خاندان برباد ہو رہے ہیں۔ قومیں افرادی طاقت سے محروم ہو رہی ہیں۔ یہ تو دنیا کی تباہی ہے۔ آخرت کی بربادی اور وہاں کا نقصان اس سے زیادہ ہوگا۔

اس سلسلے کی چوتھی بات یہ کہی گئی وَلِيَلۡبِسُوۡا عَلَيۡهِمۡ دِيۡنَهُمۡ (تا کہ ان کے دین کو ان پر مشتبہ کر دیں) اہل عرب کا دین اصلاً حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسمٰعیلؑ کا دین تھا۔ یہ شرک اور قتلِ اولاد جیسے ظلم سے پاک تھا، لیکن شیاطینِ جن وانس نے اس میں توحید کی جگہ شرک کو داخل کر دیا اور اولاد سے شفقت و ہمدردی کی جگہ ان کے قتل کی راہ دکھائی۔ یہ اسی راہ پر چل رہے ہیں۔ یہ دنیا امتحان گاہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مہلت دے

رکھی ہے۔ دین کے نام پر وہ جو افترا پردازی کر رہے ہیں وہ توجہ کے قابل نہیں ہے۔

اسی ذیل میں دو آیات کے بعد ارشاد ہوا۔

قَدْ خَسِرَ الَّـذِيْنَ قَتَلُوْا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام:۱۴۰)	بے شک خسارے میں پڑے وہ لوگ جنھوں نے اپنی اولاد کو حماقت میں بغیر کسی علم کے قتل کیا۔

یہ اس بات کا اظہار و اعلان ہے کہ ’قتل اولاد‘ کسی بھی محرک کے تحت ہو خسارے اور نقصان کا عمل ہے۔ یہ سراسر جہالت اور جاہلیت کا مظاہرہ ہے۔ اس کی کوئی معقول توجیہ نہیں کی جاسکتی۔ اس کے لیے کوئی علمی، دینی، اخلاقی اور سماجی جواز فراہم کرنا ممکن نہیں ہے۔[۱]

’قتل اولاد‘ سے یہاں خاص طور پر دختر کشی مراد ہے۔ اس لیے کہ زیادہ تر اسی کا ارتکاب ہوتا تھا۔ لڑکے کی جان لی جائے یا لڑکی کی وہ قتل اولاد ہے۔ اسلام دونوں میں فرق نہیں کرتا۔

دختر کشی کے خلاف اسلام نے پوری شدت سے آواز بلند کی اور کہا کہ لڑکی کو حق زیست حاصل ہے۔ وہ زندہ رہے گی۔ جو کوئی اس کے اس حق پر دست درازی کرے گا، قیامت کے روز اس کی باز پرس سے بچ نہ سکے گا۔

وَ اِذَا الْمَوْءُدَةُ سُئِلَتْ۝ بِاَيِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ۝ (التکویر:۸،۹)	اور جب زندہ درگور کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا کہ کس گناہ میں وہ ماری گئی۔

یہ سوال بظاہر اس سنگ دل باپ اور شقی القلب ماں سے ہونا چاہیے جنھوں نے ایک معصوم بچی کو اپنے ہاتھوں سے زیر زمین کیا تھا۔ اس کی جگہ اس بچی ہی سے پوچھا جا رہا ہے کہ تم نے کیا جرم کیا تھا کہ تمھیں یہ ہول ناک سزا دی گئی۔ وہ جب

---

[۱] عرب میں قتل اولاد کے رواج، اس کے محرکات اور قرآن کی تعلیمات کو سورۂ انعام کی مذکورہ آیات کے ذیل میں مفسرین نے تفصیل سے پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو: الجامع لاحکام القرآن، جلد ۴، جزء ۷، ص ۶۰ اور ۶۴۔ رازی، التفسیر الکبیر، جلد ۷، جز ۱۳، ص ۱۶۸-۱۷۰-۱۷۲۔ خازن، لباب التاویل فی معانی التنزیل، بغوی، معالم التنزیل: ۴۵۱/۲-۴۵۳

بتائے گی کہ اس کی آنکھیں کھلی بھی نہ تھیں کہ بند کردی گئیں اور دنیا کو جی بھر کر دیکھنے سے پہلے ہی اسے ختم کر دیا گیا تو ظالم ماں باپ کی زبانوں پر تالے لگ جائیں گے اور وہ اپنے ظلم کی کوئی توجیہ نہ کرسکیں گے۔

آیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہ مکہ کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی۔ اس وقت مسلمان تھوڑی سی تعداد میں تھے، جو انگلیوں پر شمار کئے جاسکتے ہیں۔ یہ ان کا کوئی مسئلہ بھی نہیں تھا کہ ان کے درمیان اس بربریت کا مظاہرہ ہو رہا ہو، بلکہ یہ عرب کے بعض قبائل کا مسئلہ تھا، لیکن اس کے باوجود قرآن نے اس مسئلہ کو پورے زور سے اٹھایا۔ اور اپنے ماننے والوں کو دعوت دی کہ وہ اس کے خلاف کھڑے ہوں۔ اسلام ہر طرح کے ظلم کے خلاف ہے۔ وہ کسی بھی فرد یا جماعت پر ظلم کو برداشت نہیں کرتا اور اسے ختم کرنا چاہتا ہے۔

معاشی محرک

قتل اولاد، خاص طور پر لڑکیوں کے قتل کے محرکات میں ایک بڑا محرک غربت اور افلاس بھی تھا۔ اہل عرب سمجھتے تھے کہ لڑکی حصول معاش میں تو کچھ زیادہ معاون نہیں ہوتی، بلکہ بوجھ ہی بنی رہتی ہے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس کی وجہ سے ان کے احتیاج اور تنگ دستی میں مزید اضافہ ہو۔ فقر و فاقہ نہ بھی ہو تو محض اندیشۂ فقر سے وہ یہ بھیانک اقدام کر بیٹھتے تھے۔

لڑکیوں کے قتل کے اسباب

قرآن نے کہا کہ رزق اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ جو مخلوق پیدا ہوتی ہے وہ اپنا رزق لے کر آتی ہے۔ کسی دوسرے کا رزق نہیں کھاتی، اس لیے یہ نہ سمجھو کہ تمھاری اولاد تمھارا رزق تم سے چھین رہی ہے۔ وہ نہ ہوگی تو تم آسودہ رہوگے۔

وَ لَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ؕ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَ اِيَّاكُمْ ؕ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝ (بنی اسرائیل: ۳۱)

اپنی اولاد کو افلاس کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم انھیں بھی رزق دیں گے اور تمھیں بھی۔ بے شک ان کا قتل ایک بڑی غلطی ہے۔

یہ بات صاحب حیثیت افراد سے کہی گئی جو اولاد کی پیدائش کی وجہ سے معاشی تنگی کے خدشات میں مبتلا ہوتے ہیں۔ غریبوں اور ناداروں کو بھی اس سے منع کیا گیا۔

وَ لَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَکُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ط — افلاس کی وجہ سے اپنی اولاد کو قتل نہ کرو۔
نَحْنُ نَرْزُقُکُمْ وَ اِیَّاھُمْ (الانعام:۱۵۱) — ہم تمھیں بھی رزق دیں گے اور انھیں بھی۔

مطلب یہ کہ فقر و فاقہ کی وجہ سے قتل اولاد جیسے بھیانک جرم کا ارتکاب نہ کرو۔ اس سے تم پر رزق کے دروازے نہیں کھل جائیں گے۔ اللہ روزی رساں ہے۔ یقین رکھو وہ تمھیں بھی بھوکا نہیں رکھے گا اور تمھاری اولاد کو بھی کھلائے گا۔ رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپ نے فرمایا:

ان تقتل ولدک مخافۃ اَن یَّطْعَمَ مَعَکَ[۱] — تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے قتل کر دو کہ وہ تمھارے ساتھ کھائے گی۔

یہاں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ قرآن نے تلاش معاش کا بھی حکم دیا ہے۔ اسے جاری رکھنا بہت بڑا کار ثواب ہے۔ اس سے رزق کی راہیں کھلتی ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے اس مظلوم اور نازک صنف کی حمایت میں جو آواز بلند کی، جو ہدایات اور تعلیمات دیں آج تک کوئی بھی مدعی حقوقِ نسواں ان سے زیادہ صحیح اور حقیقی تعلیمات نہ پیش کرسکا۔ آپ نے فرمایا کہ ماں کی نافرمانی اور زندہ لڑکیوں کو زیر زمین کر دینا غیر اخلاقی حرکت ہی نہیں ایک فعلِ حرام کا ارتکاب ہے۔ ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَیْکُمْ عُقُوْقَ الْاُمَّھَاتِ وَ مَنْعاً وَھَاتِ وَ وَأْدَ الْبَنَاتِ[۲] — اللہ نے حرام کی ہے تم پر ماؤں کی نافرمانی، ادائے حقوق سے ہاتھ روکنا اور ہر طرف سے مال بٹورنا اور لڑکیوں کو زندہ دفن کرنا۔

رسول اللہ ﷺ نے لڑکیوں کو زندہ رہنے کا حق ہی نہیں دیا بلکہ ان سے محبت، ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت کی طرف بھی متوجہ کیا، اس کی فضیلت بیان کی، اس پر جنت کی بشارت دی، لڑکے اور لڑکی کے درمیان برتاؤ میں فرق کو ناپسندیدہ اور غلط قرار

۱۔ بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ البقرۃ، باب قولہ تعالیٰ فلا تجعلوا للّٰہ اندادا۔ مسلم، کتاب الایمان، باب کون الشرک اقبح الذنوب و بیان اعظمھا بعدہ۔

۲۔ بخاری، کتاب الادب، باب عقوق الوالدین

۴۔ عورت کی عظمت اور اس سے محبت

عورت ۔ نصف انسانیت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو زوجین (مرد اور عورت) کی شکل میں پیدا کیا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس لیے ان کی آبادی ایک دوسرے کے برابر ہوتی ہے۔ عام حالات میں اس تناسب میں فرق واقع نہیں ہوتا۔ مرد اور عورت مل کر اس تناسب کو برقرار رکھتے ہیں۔ یہ ایک فطری عمل ہے، اسے کسی مصنوعی طریقہ سے تبدیل کرنا مرد اور عورت دونوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ یہ بات کہ کس جوڑے سے لڑکے یا لڑکیاں پیدا ہوں، کس سے لڑکوں اور لڑکیوں کا سلسلہ جاری رہے اور کون سا جوڑا بانجھ رہے، اس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ اپنے علم وحکمت کے تحت فرماتا ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ؕ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ الذُّكُوْرَ ۝ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا ۚ وَ يَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ؕ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ ۝ (الشوریٰ:۴۹،۵۰)

اللہ ہی کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے، جسے چاہتا ہے لڑکیاں اور جسے چاہتا ہے لڑکے عطا کرتا ہے یا انھیں لڑکوں اور لڑکیوں کے جوڑے دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے بانجھ بنا دیتا ہے۔ بے شک وہ علم والا اور قدرت والا ہے۔

یہ اس حقیقت کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا مالک ہے۔ ہر چیز اس کی ملک ہے۔ تخلیق اسی کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس چیز کو وجود میں لانا چاہتا ہے

لے آتا ہے۔ اس میں کسی دوسرے کا کوئی دخل نہیں ہے۔ اسی نے انسان کو وجود دیا۔ اس کے سلسلۂ نسل کو جاری رکھنے کے لیے وہ کسی کو لڑکیاں اور کسی کو لڑکے عطا کرتا ہے، کسی کو دونوں طرح کی اولاد سے نوازتا ہے۔ اس کی حکمت کے تحت کوئی اولاد سے محروم بھی ہوتا ہے۔ جب انسان کا وجود و بقا مرد اور عورت دونوں کا رہینِ منت ہے تو ان میں سے کسی کے برتر اور کم تر یا کسی کے مفید اور غیر مفید ہونے کا سوال ہی بے معنی ہے۔

آیت میں اولاد کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہبہ اور عطیہ کہا گیا ہے۔ لڑکا بھی اس کا عطیہ ہے اور لڑکی بھی عطیہ ہے۔ ہبہ کرنے والا کوئی بہتر چیز ہبہ کرتا ہے۔ اس پر ناگواری کا اظہار یا اسے بوجھ سمجھنا اللہ تعالیٰ کے انعام و اکرام کی توہین ہے۔ اولاد میں پہلے لڑکیوں کا ذکر ہے۔ بعض اوقات لڑکیوں کی پیدائش ناگوار گزرتی ہے۔ آیت اس غلط نفسیات پر ضرب لگاتی ہے۔ قرآن مجید نے لڑکی کی ولادت کو بشارت کہا ہے۔ (النحل:۸۵) اس کی پیدائش ماں باپ کے لیے خوش خبری ہے، لیکن نادان انسان اسے خبرِ بد سمجھتا ہے۔

عورت سے محبت

دنیا نے عورت کو منبعِ معصیت اور مجسم پاپ اور گناہ سمجھ رکھا تھا۔ لیکن کائنات کی اس برگزیدہ ہستی نے فرمایا، جس کی ہر حرکت و ادا صحیفۂ اخلاق تھی، جس نے دنیا کو تقویٰ اور خدا ترسی کے آداب سکھائے، جو پیدا ہی اس لیے کیا گیا تھا تاکہ کائناتِ معصیت و فحاشی کو تہ و بالا کردے صلی اللہ علیہ وسلم:

حُبِّبَ اِلَیَّ مِنَ الدُّنیَا النِّسَاءُ وَ الطِّیبُ وَ جُعِلَتْ قُرَّةُ عَینِی فِی الصَّلٰوةِ[1]	دنیا کی چیزوں میں مجھے عورت اور خوشبو پسند ہے (لیکن) میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔

یعنی عورت سے نفرت اور صفائی و نفاست سے بے زاری، خدا ترسی کی دلیل نہیں ہے۔ خدا ترسی نام ہے تعلق باللہ کے استحکام کا۔ انابت الی اللہ اور خوف و خشیت

---

[1] نسائی، کتاب عشرۃ النساء، باب حب النساء

کا۔ آدمی عورت سے پسندیدہ تعلقات رکھنے، صاف ستھرا اور باذوق رہنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کا محبوب بن سکتا ہے، بلکہ اس کی رضا جوئی کا یہی صحیح طریقہ ہے۔ ضرورت صرف اس امر کی ہے کہ دنیا انسان کا مطمحِ نظر اور اس کی کوششوں کا مرکز نہ بننے پائے۔

ایک مرتبہ ازواجِ مطہرات اونٹوں پر سفر کر رہی تھیں، آپؐ نے شتربان سے فرمایا:

رویدًا سَوْقَکَ بالقواریر[۱] — شیشوں کو ذرا سنبھال کے لے چلو۔

حضرت فاطمہؓ کے بارے میں آپؐ نے فرمایا:

فَاِنَّمَا اِبْنَتِیْ بِضْعَةٌ مِّنِّیْ یُرِیْبُنِیْ مَا رَابَهَا وَ یُؤْذِیْنِیْ مَا اٰذَاهَا[۲] — میری بچی میرا گوشت پوست ہے، جو چیز اس کے لیے باعث تشویش ہوگی وہ میرے لیے بھی پریشانی کا سبب ہوگی اور جو بات اس کے لیے باعثِ اذیت ہوگی یقیناً اس سے مجھے بھی تکلیف پہنچے گی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ نبی ﷺ سب سے زیادہ کس سے محبت فرماتے تھے؟ جواب دیا: فاطمہؓ سے۔[۳]

ایک مرتبہ نبی ﷺ سے دریافت کیا گیا کہ آپ کی محبوب ترین شخصیت کون ہے؟ فرمایا: عائشہؓ۔[۴]

یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ بیویوں میں حضرت عائشہؓ اور اولاد میں حضرت فاطمہؓ، آپؐ کی منظورِ نظر تھیں۔ ان احادیث سے صنفِ نسواں کے بارے میں اسلام کے رجحان اور مزاج کو سمجھا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے متبعین کے اندر اس صنف کے

---

[۱] صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب رحمتہ صلی اللہ علیہ وسلم للنساء
[۲] بخاری، کتاب المناقب۔ مسلم، کتاب الفضائل، باب من فضائل فاطمۃ واللفظ لہ
[۳] ترمذی، ابواب المناقب، باب ماجاء فی فضل فاطمہؓ
[۴] ترمذی، ابواب المناقب، باب من فضل عائشہؓ

حق میں کس قسم کے جذبات کی پرورش کرتا ہے؟

اس تعلیم نے فکر و عمل میں ایسا انقلاب پیدا کیا کہ جس معاشرہ میں ایک معصوم جان کو زندہ درگور کرنے میں تامل نہ ہوتا تھا اور جو اس سنگ دلی پر کبھی شرم سار نہ تھا، اس کی چارہ گری اور پرورش کو اپنے لیے سرمایۂ حیات تصور کرنے لگا۔ جہاں اپنے ہی جگر گوشوں کو امان نہیں ملتی تھی، وہاں دوسروں کی اولاد سے محبت اور ہم دردی کے جذبات ابھر آئے اور لڑکیوں کی پرورش اور نگہداشت کو سعادت و خوش بختی سمجھا جانے لگا۔

بخاری، مسلم اور ابوداؤد وغیرہ کی روایت ہے کہ حضرت حمزہؓ کی شہادت کے بعد ان کی بیٹی کی کفالت کے تین دعوے دار پیدا ہوگئے۔ ایک طرف سے حضرت علیؓ چلے آئے کہ یہ میری چچا زاد بہن ہے، لہٰذا میں اس کی پرورش کا حق دار ہوں، دوسری طرف حضرت جعفرؓ نے دعویٰ کیا کہ میں علیؓ سے زیادہ اس کی نگہ داشت کا مستحق ہوں، کیوں کہ یہی نہیں کہ وہ میرے چچا کی لڑکی ہے، بلکہ اس کی خالہ میرے نکاح میں ہے۔ اس طرح دو دو جہت سے مجھے اس کی پرورش کی سعادت ملنی چاہیے۔ تیسری طرف حضرت زیدؓ نے مقدمہ دائر کر دیا کہ وہ تو میرے بھائی (حضرت زیدؓ انصاری تھے اور حضرت حمزہؓ مہاجر تھے۔ نبی ﷺ نے ان کے درمیان مواخات قائم کردی تھی) کی بچی ہے اور چچا سے زیادہ بھتیجی کی تربیت کا حق کیسے پہنچتا ہے؟[1]

فکر و نظر کے اس عظیم انقلاب کی مثال تاریخ کے کسی دوسرے دور میں بھی ملتی ہے؟

ان تعلیمات میں اتنا زور اور قوت ہے کہ وہ پنجۂ جور و ستم کو توڑ کر رکھ دیتی ہے، جو شخص ان پر کامل یقین رکھتا ہو اس کے لیے ممکن ہی نہیں کہ وہ عدل و انصاف سے باہر قدم رکھے اور عورت کو بے بس و کم زور پا کر اس پر ظلم کے تیر برسانے لگے۔

---

[1] نیل الاوطار، ج ۷، ص ۱۳۷

۵- ایمان اور عمل صالح سے

مرد اور عورت کامیاب ہو سکتے ہیں

اسلام کے نزدیک ایمان اور عمل صالح دنیا اور آخرت کی کامیابی کے لیے شرطِ لازم ہے، جو اس شرط کو پورا کرے گا وہ دونوں جہاں میں سرخ رو اور کامیاب ہوگا، جس کے اندر ایمان ہو اور نہ عمل صالح اسے تباہی اور بربادی سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی۔ ایمان بعض غیبی حقیقتوں کو ماننے کا نام ہے اور خدا کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنا عمل صالح ہے۔ یہ دو لفظ اسلام کے پورے نظامِ فکر و عمل کی ترجمانی کرتے ہیں۔ اسلام چاہتا ہے کہ عورت اور مرد دونوں ہی ایمان اور عمل صالح کے سانچہ میں ڈھل جائیں اور بے یقینی اور بد عملی کی دلدل سے نکل آئیں تاکہ خدا کی پکڑ سے محفوظ رہیں اور اس کے انعام و اکرام کے حق دار بن جائیں۔ یہ بات قرآن مجید میں بار بار اور بڑی صراحت کے ساتھ کہی گئی ہے۔ ایک جگہ فرمایا یہ دنیا فانی اور بے حقیقت ہے۔ اصل اہمیت آخرت کی ہے، جہاں کی زندگی ابدی اور دائمی ہے۔ جو فرد بشر بھی دنیا کے مقابلہ میں آخرت کو ترجیح دے گا اور خدا کے دین پر مشکلات کے باوجود ثابت قدم رہے گا، وہ اسے دنیا میں پاکیزہ زندگی اور آخرت میں بہترین اجر عطا کرے گا۔ یہ اللہ کا قانون ہے اور اس کے قانون میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ ارشاد ہے:

مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَ مَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ؕ وَ لَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ۚ وَ لَنَجْزِيَنَّهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ○ (النحل:۹۶،۹۷)

جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ تو ختم ہو جائے گا اور جو اللہ کے پاس ہے وہ ہمیشہ باقی رہے گا اور ہم صبر کرنے والوں کو ان کے بہترین اعمال کا جو وہ کر رہے تھے ضرور اجر دیں گے، جس نے بھی نیک کام کیا چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بشرطے کہ وہ مومن ہو تو ہم اسے (دنیا میں) پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے اور جو اچھے عمل کر رہے تھے ان کا اجر انھیں (آخرت میں) ضرور عطا کریں گے۔

یہی بات ایک دوسری جگہ اس طرح کہی گئی ہے:

اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ؗ وَّ اِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ○ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا يُجْزٰۤى اِلَّا مِثْلَهَا وَ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَ هُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ○ (المومن:۳۹،۴۰)

یہ دنیا کی زندگی تو چند روزہ سامان ہے اور آخرت ہی ہمیشہ رہنے کی جگہ ہے، جو شخص بھی کوئی برائی کرے گا تو اسے اتنا ہی بدلہ دیا جائے گا اور جو کوئی نیک کام کرے گا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، بشرطے کہ وہ مومن ہو تو یہ سب لوگ جنت میں جائیں گے اور وہاں انھیں بے حساب رزق دیا جائے گا۔

مذہب کی دنیا میں بعض جماعتیں اس فریب میں مبتلا رہی ہیں کہ وہ خدا کی محبوب ہیں، اس لیے ان کے ساتھ وہ خصوصی معاملہ کرے گا، ان کے جرائم پر اس طرح گرفت نہیں ہوگی، جس طرح دوسروں کی ہوگی۔ قرآنِ مجید نے اس غلط خیال کی تردید کی اور فرمایا: اللہ کے ہاں فیصلہ اس بنیاد پر نہیں ہوگا کہ کون کس گروہ سے تعلق رکھتا ہے۔ بلکہ وہاں انسان کے ایمان وعمل کو دیکھا جائے گا، جو غلط کار ہوگا وہ اپنے کیے کی سزا پائے گا اور جو بھی ایمان وعمل صالح سے آراستہ ہوگا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت اجر و ثواب کا مستحق ہوگا۔ فرمایا:

لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ؕ مَنْ يَّعْمَلْ سُوْٓءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَ لَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَّ لَا نَصِيْرًا ○ وَ مَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ نَقِيْرًا ○ (النساء: ۱۲۳، ۱۲۴)

نہ تمھاری آرزوؤں پر موقوف ہے اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوؤں پر، جو بھی برا عمل کرے گا اس کی سزا اسے دی جائے گی اور وہ اللہ کے مقابلہ میں اپنا کوئی حامی و ناصر نہیں پائے گا۔ اور جو اچھے عمل کرے گا، چاہے وہ مرد ہو یا عورت، اگر وہ مومن ہے تو یہ سب لوگ جنت میں جائیں گے اور ذرّہ برابر ان کی حق تلفی نہ ہوگی۔

ان آیتوں میں بعض اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ یہ کہ:

۱- عورت اور مرد میں سے کوئی بھی نہ تو پیدائشی طور پر پاپی یا گناہ گار ہے اور نہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے بے گناہی کی سند ملی ہے۔

۲- نہ تو مرد کا محض مرد ہونا عزت و سرفرازی کی ضمانت ہے اور نہ عورت کا عورت ہونا اس کی ذلت اور پستی کی دلیل ہے۔

۳- کامیابی اور ناکامی مرد کی ہو یا عورت کی، ایمان اور عمل صالح سے وابستہ ہے۔ ان میں سے کسی کی کامیابی کے لیے بھی اللہ نے کوئی اور شرط نہیں رکھی ہے۔ جو اپنے عمل میں جتنا آگے ہوگا اتنا ہی کامیاب ہوگا اور جو اس میں جس قدر پیچھے ہوگا اسی قدر ناکام رہے گا۔

۴- ایمان اور عمل صالح کے ذریعے اونچے سے اونچے درجات حاصل کرنے کی اللہ تعالیٰ نے مرد میں بھی صلاحیت رکھی ہے اور عورت میں بھی۔ اس لیے دونوں کو اس میدان میں کسی برتری یا کم تری کے احساس کے بغیر آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

یہ وہ حقیقتیں ہیں، جن کا قرآن مجید میں بار بار ذکر ہوا ہے اور انھیں مختلف پہلوؤں سے سمجھایا گیا ہے۔ چناں چہ ایک جگہ کہا گیا: ایسے مردوں اور عورتوں کو جو اپنے ایمان میں سچے اور مخلص ہیں، قیامت میں نور نصیب ہوگا۔ وہ روشنی میں اپنا راستہ طے

کریں گے اور ان کو جنت کی خوش خبری سنائی جائے گی۔ یہ وہ کامیابی ہے کہ اس سے بڑی کامیابی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے برخلاف ایمان کا جھوٹا دعویٰ کرنے والے مرد اور عورتیں سب کے سب اندھیرے میں ہوں گے۔ انھیں کہیں سے روشنی نہیں ملے گی اور ان کا انجام خدا کے منکروں کے ساتھ ہوگا اور دونوں ہی جہنم کے مستحق قرار دیے جائیں گے۔ ارشاد ہوا:

يَوۡمَ تَرَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ يَسۡعٰى نُوۡرُهُمۡ بَيۡنَ اَيۡدِيۡهِمۡ وَ بِاَيۡمَانِهِمۡ بُشۡرٰكُمُ الۡيَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِيۡنَ فِيۡهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِيۡمُ ۚ‏ يَوۡمَ يَقُوۡلُ الۡمُنٰفِقُوۡنَ وَالۡمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيۡنَ اٰمَنُوا انۡظُرُوۡنَا نَقۡتَبِسۡ مِنۡ نُّوۡرِكُمۡ‌ ۚ قِيۡلَ ارۡجِعُوۡا وَرَآءَكُمۡ فَالۡتَمِسُوۡا نُوۡرًا ؕ فَضُرِبَ بَيۡنَهُمۡ بِسُوۡرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِيۡهِ الرَّحۡمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنۡ قِبَلِهِ الۡعَذَابُ ؕ‏ يُنَادُوۡنَهُمۡ اَلَمۡ نَكُنۡ مَّعَكُمۡ‌ ؕ قَالُوۡا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمۡ فَتَنۡتُمۡ اَنۡفُسَكُمۡ وَ تَرَبَّصۡتُمۡ وَ ارۡتَبۡتُمۡ وَ غَرَّتۡكُمُ الۡاَمَانِىُّ حَتّٰى جَآءَ اَمۡرُ اللّٰهِ وَ غَرَّكُمۡ بِاللّٰهِ الۡغَرُوۡرُ‏ ۝ فَالۡيَوۡمَ لَا يُؤۡخَذُ مِنۡكُمۡ فِدۡيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا ؕ مَاۡوٰكُمُ النَّارُ ؕ هِىَ مَوۡلٰكُمۡ ؕ وَ

اس دن تم دیکھو گے ایمان والے مردوں اور عورتوں کو کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں دوڑ رہا ہوگا۔ ان سے کہا جائے گا کہ آج خوش خبری ہے تمھارے لیے۔ ایسی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں، ان میں ہمیشہ رہوگے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔ اس روز منافق مرد اور عورتیں ایمان والوں سے کہیں گے ذرا ہماری طرف دیکھو تاکہ ہم تمھارے نور سے کچھ فائدہ اٹھالیں، ان سے کہا جائے گا۔ پیچھے پلٹ جاؤ اور اپنا نور تلاش کرو۔ پھر ان کے درمیان میں ایک دیوار کھڑی کردی جائے گی، جس میں ایک دروازہ ہوگا، اس کے اندر رحمت ہوگی اور باہر عذاب۔ وہ مومنوں سے پکار کر کہیں گے کہ کیا ہم تمھارے ساتھ نہ تھے؟ مومن جواب دیں گے: ہاں ساتھ تھے، مگر تم نے اپنے آپ کو فتنہ میں ڈالا، انتظار کرتے رہے، شک میں پڑے رہے اور جھوٹی توقعات تمھیں فریب دیتی رہیں یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آ گیا اور اللہ کے معاملے میں اس بڑے دھوکے باز (شیطان) نے تمھیں دھوکا میں رکھا، لہٰذا آج نہ تم سے کوئی فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ ان

بِئۡسَ الۡمَصِیۡرُ۝ (الحدید:۱۲-۱۵)

لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تم سب کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ وہی تمھاری خبر گیری کرنے والی ہے اور یہ بدترین انجام ہے۔

اس طرح اسلام نے پوری قوت کے ساتھ یہ بات کہی کہ مرد اور عورت دونوں ہی کی کامیابی ایمان خالص اور عملِ صالح سے وابستہ ہے۔ اس کے سوا ان کی نجات اور فلاح کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ ان میں سے جس کسی کے پاس ایمان و یقین کی دولت اور عملِ صالح کا ذخیرہ ہوگا وہ کامیاب ہوگا۔ جس کا دامن ان دونوں باتوں سے خالی ہوگا وہ ناکام و نامراد ہوگا۔ اس معاملہ میں خدا کا قانون بے لچک ہے۔ وہ نہ تو عورت کے ساتھ کوئی رعایت کرتا ہے اور نہ مرد کے ساتھ۔



۶- مرد اور عورت کے لیے مطلوبہ صفات

اسلام انسان کے اندر جو صفات دیکھنا چاہتا ہے وہ ایک مومن کے اندر پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہیں۔ اس لیے انھیں مومنانہ صفات بھی کہا جاسکتا ہے۔ اسلام نے پوری تفصیل سے ان کا ذکر کیا ہے۔ ایک جگہ فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے مومنوں کے جان و مال جنت کے عوض خرید لیے ہیں۔ وہ اس کے راستے میں مارتے اور مرتے ہیں۔'' اس کے بعد ان کے بارے میں کہا:

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۝

(التوبہ: ۱۱۲)

وہ اللہ کی طرف پلٹنے والے، اس کی عبادت کرنے والے، اس کی حمد کرنے والے، اس کی راہ میں سیاحت کرنے والے، اس کے آگے رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، نیکی کا حکم دینے والے، بدی سے روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے ہیں اور مومنوں کو خوش خبری سنادو۔

ان صفات کا مردوں کے اندر پایا جانا جتنا ضروری ہے اتنا ہی عورتوں کے لیے بھی ان سے آراستہ ہونا ضروری ہے۔ چناں چہ ایک جگہ ازواجِ مطہرات کو رسول اللہ ﷺ کی اطاعت پر ابھارتے ہوئے کہا گیا کہ اگر تم ان کی اطاعت نہ کروگی تو وہ تمھیں چھوڑ دیں گے اور اللہ تعالیٰ انھیں تم سے بہتر بیویوں سے نوازے گا، ان میں وہ خوبیاں ہوں گی جو مطلوب ہیں۔ یہ خوبیاں تقریباً وہی ہیں، جن کا اوپر کی آیت میں ذکر ہے۔ ارشاد ہے:

عَسٰی رَبُّهٗۤ اِنْ طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىِٕحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا○ (التحریم:۵)

اگر وہ تمھیں طلاق دے دیں تو ان کا رب بہت جلد انھیں تمھارے بدلے تم سے اچھی بیویاں دیدے گا جو اسلام پر عمل کرنے والیاں، توبہ کرنے والیاں، عبادت کرنے والیاں اور سیاحت کرنے والیاں ہوں گی۔ بیوہ بھی کنواریاں بھی۔

قرآن مجید کا خطاب گو بالعموم مردوں سے ہوتا ہے، لیکن عورتیں اس میں داخل ہوتی ہیں۔ اس اصولی بات سے قطع نظر اس نے اس کی صراحت بھی کردی ہے کہ وہ اعلیٰ صفات جن کے بغیر انسان کی سیرت کی تکمیل نہیں ہوتی، عورت اور مرد دونوں ہی میں پائی جانی چاہئیں۔ چناں چہ ایک جگہ بڑی صراحت کے ساتھ کہا گیا ہے۔

اِنَّ الْمُسْلِمِیْنَ وَ الْمُسْلِمٰتِ وَ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِیْنَ وَ الْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِیْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَ الصّٰبِرِیْنَ وَ الصّٰبِرٰتِ وَ الْخٰشِعِیْنَ وَ الْخٰشِعٰتِ وَ الْمُتَصَدِّقِیْنَ وَ الْمُتَصَدِّقٰتِ وَ الصَّآىِٕمِیْنَ وَ الصّٰٓىِٕمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَ الْحٰفِظٰتِ وَ الذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّ الذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّ اَجْرًا عَظِیْمًا○

(الاحزاب:۳۵)

بے شک اطاعت کرنے والے مرد اور اطاعت کرنے والی عورتیں، ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں، فرماں برداری کرنے والے مرد اور فرماں برداری کرنے والی عورتیں، راست باز مرد اور راست باز عورتیں، صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں، خشوع کرنے والے مرد اور خشوع کرنے والی عورتیں، صدقہ و خیرات کرنے والے مرد اور صدقہ و خیرات کرنے والی عورتیں، روزہ رکھنے والے مرد اور روزہ رکھنے والی عورتیں، اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والی عورتیں اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والے مرد اور اللہ کو کثرت سے یاد کرنے والی عورتیں، ان کے لیے اللہ نے مغفرت اور اجرعظیم تیار کر رکھا ہے۔

مسند احمد اور نسائی وغیرہ کی روایت ہے کہ حضرت ام سلمہؓ نے رسول اللہ ﷺ

سے دریافت کیا کہ مردوں کا تو قرآن مجید میں ذکر ہے، لیکن عورتوں کا نہیں۔ آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ مطلب یہ ہے کہ کیا عورتیں اس قابل نہیں ہیں کہ ان کا تذکرہ ہو۔ اس کے جواب میں سورۂ احزاب کی مذکورہ بالا آیت نازل ہوئی۔

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ کچھ دوسری صحابیات نے یہ سوال کیا تھا، کچھ اور روایات بتاتی ہیں کہ بعض صحابیات نے ازواجِ مطہرات سے کہا کہ آپ لوگوں کا تو قرآن مجید میں ذکر ہے لیکن ہمارا نہیں، اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]

یہ سب ہی امکانات ہیں۔ علامہ آلوسی کہتے ہیں:

ولاَ مانع ان یکون کل ذٰلک[2] — یہ ماننے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ سب ہی واقعات پیش آئے ہوں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ فضا میں اس طرح کے جو سوالات ابھر رہے تھے، قرآن مجید نے اس آیت میں ان کا جواب دیا ہے۔ یہاں عورت اور مرد کی حسبِ ذیل دس صفات بیان ہوئی ہیں:

اسلام، ایمان، قنوت، صدق، صبر، خشوع، صدقہ، صوم، حفظ فروج، ذکر کثیر۔ یہ صفات اتنی جامع ہیں کہ ان میں پورا دین آجاتا ہے۔ یہ آیت اس پہلو سے اہم ہے کہ اس سے عورت کی حیثیت، معاشرہ میں اس کے کردار اور اس کے دائرۂ عمل کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے قدیم علماء ومفسرین نے ان صفات کی جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہاں پیش کر دیا جائے۔

۱- اسلام: زمخشری کہتے ہیں 'مسلم' وہ ہے جو جنگ کے بعد امن و امان میں آجائے، ایسا مطیع وفرماں بردار جو مخالفت نہ کرے۔ مسلم اس شخص کو بھی کہا جاتا ہے جو اپنے سارے معاملات اللہ تعالیٰ کے حوالہ کردے اور اس پر توکل کرے۔

۲- **ایمان:** ایمان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کی جانب سے

---

[1] یہ ساری روایات ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں جمع کردی ہیں۔ تفسیر القرآن العظیم: ۶/۴۳۹

[2] آلوسی، روح المعانی، جزء ۲۲/۲۰۲

آئی ہوئی تعلیمات کو دل و جان سے قبول کیا جائے۔ درحقیقت قرآن یہ چاہتا ہے کہ ہر مرد اور عورت کے اندر اسلام کے ساتھ ایمان بھی ہو۔ وہ جہاں اللہ کے احکام کی اطاعت کرے، وہیں اس کا دل اس کی حقانیت پر مطمئن بھی ہو۔ ان دونوں صفات کی تشریح علاّمہ ابو السعود نے اس طرح کی ہے:

الداخلین فی السلم المنقادین لحکم الله من الذکور والاُناث ...المصدقین بما یجب ان یصدق من الفریقین	امن اور اطاعت میں داخل ہو جانے اور اللہ کے حکم کے سامنے سر جھکانے والے مرد اور عورتیں ... دونوں فریقوں میں سے ان باتوں کی تصدیق کرنے والے جن کی تصدیق کرنا ضروری ہے۔

۳۔**قنوت:** اس کے معنی ہیں جھک جانا۔ زمخشری کہتے ہیں۔

القانت القائم بالطاعة الدائم علیها	قانت وہ اطاعت گزار ہے جو اس پر ہمیشہ قائم رہے۔

حافظ ابن کثیرؒ ان صفات کا باہمی ربط اس طرح بیان کرتے ہیں۔

القنوت هو الطاعة فی سکون ... فالاسلام بعده مرتبة یرتقی الیها وهو الاِیمان ثم القنوت ناشیءٌ عنهما	قنوت کے معنی ہیں سکون کے ساتھ اطاعت کرنا... اسلام کے بعد کا مرتبہ جس کی طرف ترقی کی جاتی ہے وہ ایمان ہے پھر قنوت کا مقام ہے جو ان دونوں سے پیدا ہوتا ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں ایمان انسان سے اس بات کا مطالبہ کرتا ہے کہ وہ نیک اعمال اختیار کرے، یہی قنوت ہے۔

۴۔**صدق:** یہ بڑا جامع وصف ہے۔ علامہ زمخشری کہتے ہیں:

الصادق الذی یصدق فی نیته و قوله و عمله	صادق وہ ہے جو اپنی نیت اور ارادے اور اپنے قول وعمل ہر ایک میں سچا ہو۔

امام رازی اس کا ایک اور پہلو ہمارے سامنے رکھتے ہیں۔ فرماتے ہیں: ایمان اور عمل صالح سے انسان کی شخصیت کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس کے بعد وہ دوسروں کی تکمیل

کی کوشش کرتا ہے انھیں معروف کا حکم دیتا اور منکر سے منع کرتا ہے، گویا صداقت اور راست بازی کے ذریعے ان کے ساتھ خیر خواہی کرتا ہے۔ یہ اس کے صادق ہونے کا مفہوم ہے۔

۵-**صبر:** صبر کے معنی ہیں مشکلات میں ثابت قدم رہنا۔ اس کے تین پہلو ہمارے علماء نے بیان کیے ہیں۔ ایک آدمی کا مصیبتوں اور آزمائشوں میں استقامت دکھانا اور جزع فزع نہ کرنا۔ دوسرے راحت ہو یا تکلیف ہر حال میں اللہ کی عبادت کرتے رہنا، تیسرے نفس اور شیطان کی ترغیبات کے باوجود معاصی سے بچے رہنا۔ علّامہ آلوسی نے اسی حقیقت کو یہاں ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

و الصابرین و الصابرات علی المکارہ و علی العبادات و عن المعاصی

صبر کرنے والے مرد اور صبر کرنے والی عورتیں جو مصائب اور مشکلات پر عبادات کی بجاآوری اور گناہوں کے چھوڑنے پر صبر و استقامت دکھاتے ہیں۔

امام رازی نے اوپر 'صدق' کا مفہوم بیان کیا ہے، اسی کی روشنی میں صبر کی بھی تعریف کی ہے۔ فرماتے ہیں: معروف کا حکم دینے اور منکر سے منع کرنے والے کو تکلیف بھی لازماً پہنچتی ہے۔ یہاں ان لوگوں کا ذکر ہے جو اس تکلیف پر صبر کرتے ہیں۔

۶-**خشوع:** زمخشری کہتے ہیں۔

الخاشع المتواضع لله بقلبه و جوارحه

خاشع وہ ہے جو اپنے جسم و جان کے ساتھ اللہ کے سامنے جھک جائے۔

امام رازیؒ فرماتے ہیں: اگر انسان خود بھی درجۂ کمال کو پہنچ جائے اور دوسروں کو بھی کمال تک پہنچانے لگے تو اس کے اندر نخوت اور کبر بھی پیدا ہوسکتا ہے، اس لیے فرمایا کہ ان ساری خوبیوں کے باوجود ان کے اندر خاک ساری اور فروتنی ہوتی ہے اور وہ اللہ کے سامنے سر جھکائے رہتے ہیں۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ان خوبیوں کی وجہ سے ان کے اندر دنیا کی محبت اور جاہ طلبی پیدا ہو جائے۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ کے یہ خاشع اور

متواضع بندے ان پست جذبات سے پاک ہوتے ہیں۔

۷- **صدقہ:** اس میں فرض اور نفل دونوں طرح کے صدقات شامل ہیں۔ مطلب یہ کہ وہ مال کی محبت میں گرفتار نہیں ہوتے اور راہِ خدا میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اس میں حبِ مال کی نفی ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

الصدقة هي الاِحسان الى الناس المَحاويج الضعفاء الذين لاَ كسب لهم ولاَ كاسب يعطون من فضول الاَموال طاعة لله و احسانا الى خلقهٖ	صدقہ نام ہے ان حاجت مند اور ضعیف انسانوں پر احسان کا جو نہ تو خود کما سکتے ہوں اور نہ کوئی دوسرا ان کے لیے کمانے والا ہو۔ مطلب یہ کہ اس طرح کے لوگوں پر اللہ کے نیک بندے اپنا فاضل مال اللہ کی اطاعت اور اس کی مخلوق کے ساتھ احسان کے جذبہ سے خرچ کرتے ہیں۔

۸- **صوم:** صدقہ کے بعد روزہ کا ذکر کیا گیا۔ اس میں فرض اور نفل دونوں طرح کے روزے شامل ہیں۔ علامہ آلوسی کہتے ہیں:

الصوم المشروع فرضًا كان او نفلاً	شریعت کے بتائے ہوئے روزے، چاہے وہ فرض ہوں یا نفل۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پیٹ کے بندے نہیں ہوتے، شکم پروری ان کا مقصد نہیں ہوتا۔ وہ اللہ کی رضا کے لیے کام و دہن کی لذتوں سے کنارہ کش رہ سکتے ہیں۔ امام رازی کے بقول مطالباتِ شکم ان کو اللہ کی عبادت سے باز نہیں رکھتے۔

۹- **حفظِ فروج:** اس سے مراد عفت و عصمت ہے۔ مطلب یہ کہ وہ پاک دامن ہوتے ہیں۔ غلط طریقہ سے جنسی خواہش پوری نہیں کرتے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں: اس میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ ان کی جنسی خواہشات اللہ کی عبادت کی راہ میں مانع نہیں ہوتیں۔

۱۰- **ذکرِ کثیر:** یعنی یہ وہ مرد اور عورتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں اور بہت یاد کرتے ہیں۔ حضرت مجاہد فرماتے ہیں:

لا یکتب الرجل من الذاکرین اللہ کثیرا حتی یذکر اللہ قائما و قاعدا و مضطجعا

اللہ کا کثرت سے ذکر کرنے والوں میں آدمی کا نام اسی وقت لکھا جاتا ہے جب کہ وہ کھڑے، بیٹھے، لیٹے (ہر حال میں) اس کا ذکر کرے۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں:

و الذاکر اللہ کثیرا من لاَ یکاد یخلو من ذکر اللہ بقلبہ او لسانہ او بھما و قرأۃ القران والاِشغال بالعلم من الذکر

اللہ کا بہت زیادہ ذکر کرنے والا وہ ہے جو اللہ کے ذکر سے گویا کبھی خالی نہ بیٹھا رہے۔ چاہے یہ ذکر اپنے دل سے ہو یا اپنی زبان سے یا ان دونوں سے۔ قرآن کا پڑھنا اور علم میں مشغول رہنا بھی ذکر ہی ہے۔

علامہ ابن جریر طبری فرماتے ہیں:

و الذاکرین اللہ بقلوبھم و السنتھم و جوارحھم والذاکرات کذٰلک[1]

وہ دل سے، زبان سے اور اعضا و جوارح (اعمال) سے اللہ کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور اسی طرح وہ عورتیں بھی اس کا ذکر کرتی رہتی ہیں۔

آخر میں فرمایا: **اَعَدَّ اللّٰہُ لَھُمۡ مَّغۡفِرَۃً وَّ اَجۡرًا عَظِیۡمًا**○

مطلب یہ کہ جس مرد اور عورت کے اندر یہ صفات ہوں گی اللہ تعالیٰ صرف یہی نہیں کہ اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرمائے گا بلکہ اسے اجر عظیم سے نوازے گا۔

اسلام زندگی کا ایک خاص تصور رکھتا ہے۔ یہ صفات عورت اور مرد دونوں ہی کو اس تصور کے مطابق ڈھالتی ہیں۔ یہ عقیدہ و عبادت، سیرت و اخلاق، خدمت خلق اور حسنِ سلوک، دعوت و تبلیغ، صبر و ثبات سب پر حاوی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کے تقاضے بڑے گوناگوں اور وسیع ہیں۔ ان صفات سے دنیا اور آخرت کی کامیابی وابستہ ہے۔ اسلام اسی کامیابی کی طرف عورت اور مرد دونوں کو بلاتا ہے۔

---

[1] حوالوں کے لیے دیکھئے تفسیر ابن جریر ۲۲/ ۸۲۔ زمخشری: الکشاف عن حقائق التنزیل: ۳/ ۵۲۲-۵۲۳۔ رازی: التفسیر الکبیر، جزء ۲۵/ ۲۸۲۔ ابو السعود: علی ہامش التفسیر الکبیر، طبع قدیم: ۷/ ۴۴۶، ۴۴۷۔ ابن کثیر: ۶/ ۴۴۰۔ روح المعانی جزء ۲۲/ ۲۰۲، ۲۰۳

۷- مرد اور عورت تہذیب کے معمار

دنیا میں بہت سی تہذیبیں اور تمدن وجود میں آئے۔ لیکن عورت کو غیر مفید اور مخل تمدن عنصر سمجھ کر میدان عمل سے دور رکھا گیا۔ اس نے کوئی کردار ادا بھی کیا تو اسے تسلیم نہ کیا گیا اور اس کی ہمت افزائی نہ ہوئی۔ اسی لیے تہذیب وتمدن پر مرد کا غلبہ رہا، اس کی فکر، خواہشات اور جذبات چھائے رہے اور عورت کنارے پر کھڑی رہی۔ قرآن مجید نے بتایا کہ تہذیب وتمدن کو وجود میں لانے اور اسے ایک رخ دینے میں مرد اور عورت دونوں شریک ہوتے ہیں۔ ان میں سے کسی کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ تہذیب کو بداخلاقی کی راہ پر لگانے اور راہ راست سے ہٹانے میں بھی دونوں کی کوششوں کا دخل ہوتا ہے اور ان کے باہمی تعاون ہی سے تہذیب کو صحیح سمت بھی ملتی ہے۔ منافق اور بے ایمان مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا تعاون حاصل ہوتا ہے اور وہ معاشرہ کو ناپاک کرنے اور اعلیٰ قدروں سے محروم کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ سورۂ توبہ میں ارشاد ہے:

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَ يَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَ يَقْبِضُوْنَ اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ۝ (التوبۃ: ۶۷)

منافق مرد اور منافق عورتیں آپس میں ایک ہی ہیں۔ برائی کا حکم دیتے اور بھلائی سے روکتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے اپنے ہاتھ روکے رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ انھوں نے اللہ کو بھلا دیا اور اللہ نے بھی انھیں فراموش کر دیا۔ بلاشبہ منافق بڑے ہی نافرمان ہیں۔

اس کے بعد ان کے انجام کا ذکر ہے کہ منافقین اسی طرح کفار (اللہ تعالیٰ کی ہدایت کا انکار کرنے والے) معاشرے کو غلط رُخ پر لے جاتے ہیں، اس لیے ان کے مرد اور عورتیں آخرت میں نارِ جہنم کے مستحق ہوں گے، جس میں وہ ہمیشہ پڑے رہیں گے۔ ان پر اللہ کی لعنت ہوگی اور وہ اس کی رحمت سے دور ہوں گے۔ (التوبہ:۶۸)

منافقین اور منافقات کے ناپاک رویہ کے برعکس اہل ایمان مرد و خواتین معاشرے کو حق و صداقت کی راہ پر لگانے، بھلائیوں کو فروغ دینے اور برائیوں سے پاک کرنے میں ایک دوسرے کا تعاون کرتے ہیں۔ اسی سے ایک پاکیزہ اور صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُھُمْ اَوْلِیَآءُ بَعْضٍ یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ یَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوۃَ وَ یُؤْتُوْنَ الزَّکٰوۃَ وَ یُطِیْعُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ ط اُولٰٓئِکَ سَیَرْحَمُھُمُ اللّٰہُ ط اِنَّ اللّٰہَ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ○ (التوبۃ:۷۱)

ایمان والے مرد اور ایمان والی عورتیں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ وہ بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور نماز قائم کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے ہیں۔ ان لوگوں پر اللہ ضرور رحم کرے گا۔ بلاشبہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ اللہ کا وعدہ ہے ان ایمان والے مردوں اور عورتوں سے کہ وہ انھیں ایسی جنتیں عطا کرے گا، جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ ان ہمیشہ رہنے والی جنتوں میں ان کے لیے پاکیزہ مکانات ہوں گے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھیں اللہ کی رضا حاصل ہوگی۔ اس سے بڑی کوئی اور کامیابی نہیں ہے۔[1] (التوبہ:۷۲)

---

[1] سورۂ توبہ کی ان آیات کی مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب '**مسلمان خواتین کی ذمے داریاں**' مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

اسلام کا خطاب مرد اور عورت دونوں سے ہے۔ اس کی تاریخ ہی یہ ہے کہ دونوں نے اس کی دعوت پر لبیک کہا، اس کی تبلیغ و اشاعت کی سعی کی، تکلیفیں اٹھائیں، اپنا وطن عزیز چھوڑا، ہجرت اختیار کی اور جب حکم ہوا تو دین کے غلبہ کی جدوجہد اور جہاد میں اپنا حصہ ادا کیا۔ سورۂ آل عمران کے آخر میں اہل ایمان کی قلبی کیفیت کا بیان ہے کہ اپنی تمام تر خدمات، قربانیوں اور راہ خدا میں استقامت کے باوجود انہیں کوتاہیوں کا احساس دامن گیر ہے اور وہ دست بدعا ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے قصور معاف کردے، روز قیامت ہم رسوا نہ ہوں اور تیرے انعام و اکرام کے مستحق قرار پائیں۔ اس کے جواب میں کہا گیا:

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰی ج بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ج فَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ وَ اُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَ قٰتَلُوْا وَ قُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَیِّاٰتِهِمْ وَ لَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ج ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ○ (آل عمران:۱۹۵)

پس ان کے رب نے ان کی دعا قبول کی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تم آپس میں ایک ہی ہو۔ پس جن لوگوں نے ہجرت کی اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور انھیں میری راہ میں تکلیف دی گئی اور جو لڑے اور مارے گئے تو ضرور میں ان کی غلطیاں معاف کروں گا اور انھیں ایسے باغات میں داخل کروں گا، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ یہ بدلہ ہے اللہ کی جانب سے اور اللہ کے پاس اچھا بدلہ ہے۔

اسلامی معاشرے کی صورت گری میں مسلمان مرد و خواتین کی ایک دوسرے کو رفاقت حاصل رہی۔ اس کی ترقی کے ہر مرحلہ میں دونوں نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا۔ یہ تاریخ کی شہادت ہے۔ آج بھی یہ معاشرہ اسی وقت وجود میں آسکتا ہے جب کہ وہ ایک دوسرے کے معاون و مددگار ہوں اور اس کے قیام کے لیے جدوجہد کریں۔

۸- مشترک قانون شریعت

قدیم مذاہب میں مرد اور عورت کی ایک حیثیت نہیں تھی۔ مرد کی سطح عورت سے اونچی تھی، اس لیے دونوں کے لیے الگ الگ قوانین حیات تجویز کیے گئے، لیکن اسلام کا مخاطب 'انسان' ہے۔ قرآن مجید کا بیان ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دین و شریعت کا بارِامانت کائنات کی کوئی مخلوق نہ اٹھا سکی۔ یہ بار صرف انسان نے اٹھایا ہے۔ اس میں مرد اور عورت دونوں داخل ہیں۔

اِنَّا عَرَضْنَا الْاَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَالْجِبَالِ فَاَبَيْنَ اَنْ يَّحْمِلْنَهَا وَ اَشْفَقْنَ مِنْهَا وَ حَمَلَهَا الْاِنْسَانُ ط اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ۙ لِيُعَذِّبَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتِ وَ الْمُشْرِكِيْنَ وَ الْمُشْرِكٰتِ وَ يَتُوْبَ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ط وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ع

(الاحزاب: ۷۲، ۷۳)

ہم نے آسمانوں اور زمین اور پہاڑوں کے سامنے 'امانت' پیش کی، لیکن انھوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے۔ (لیکن) انسان نے اسے اٹھا لیا۔ بلاشبہ وہ بڑا ظالم اور بڑا نادان تھا۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ منافق مردوں اور منافق عورتوں کو عذاب دے اور ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں پر اپنی شفقت و رحمت کے ساتھ توجہ کرے اور اللہ بڑا مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان آیات میں 'امانت' کا لفظ آیا ہے، اس سے مراد احکام دین اور شریعت کی عائد کردہ ذمہ داریاں ہیں۔ اس میں خدا اور بندے کے تمام حقوق آتے ہیں۔ ان کو

امانت سے اس لیے تعبیر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے شریعت پر عمل کی ذمے داری انسان پر ڈالی ہے اور اس کے ادا کرنے کا اسے پابند بنایا ہے۔

امانت کا ادا کرنا قابل ستائش ہے اور اس پر اجر و ثواب بھی ہے۔ اس کے لیے اختیار ضروری ہے۔ اگر کسی پہاڑ پر یا زیر زمین کوئی امانت رکھ دی جائے اور وہ غائب ہوجائے تو پہاڑ اور زمین سے باز پرس نہ ہوگی اور محفوظ مل جائے تو ان کی تعریف نہ ہوگی۔ آسمان، زمین اور پہاڑوں نے بارِ امانت اٹھانے سے اس لیے انکار کیا کہ وہ اختیار سے محروم ہیں اور جس کام پر لگا دیا گیا ہے وہ انجام دے رہے ہیں۔ یا یہ کہا جائے کہ وہ اس امتحان کے لیے نہیں تیار ہوئے کہ حقِ امانت ادا کرکے مستحق ثواب اور خیانت کرکے گرفتارِ عذاب ہوں، لیکن انسان نے اسے اٹھا لیا۔ اس کے نتائج بھی اس کے سامنے تھے کہ وہ امانت ادا کرکے انعام و اکرام کا مستحق ہوگا اور خیانت ہو تو اس کی پاداش بھی اسے بھگتنی پڑے گی[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان نے ازل میں جو بارِ امانت اٹھایا وہ احکام شریعت کا بار تھا۔ اب اس میں سے مرد ہو یا عورت دونوں کو اس کی جزا یا سزا ملے گی۔ جو مرد یا عورت کفر و نفاق اور شرک و الحاد میں مبتلا ہوں گے وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے مستحق ہوں گے۔اس کی توجہ اور عنایت ان خوش نصیب مردوں اور عورتوں کو حاصل ہوگی جو سرمایۂ ایمان اپنے ساتھ رکھیں گے اور وہ انعام و اکرام سے نوازے جائیں گے۔

ایک اور جگہ وضاحت ہے کہ مرد اور عورت دونوں پر اللہ اور اس کے رسول کے احکام واجب الاتباع ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی اس سے بالاتر یا آزاد نہیں ہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَآ	کسی مومن اور مومنہ کے لیے صحیح نہیں ہے کہ
قَضَى اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ	جب اللہ اور اس کا رسول کسی معاملہ میں فیصلہ

---

[1] ان آیات پر تفصیلی بحث اور مختلف اقوال کے لیے ملاحظہ ہو۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن جلد ۷، جزء ۱۴، ص ۱۶۲-۱۶۵۔ رازی، التفسیر الکبیر جلد ۱۳، جزء ۲۵، ص ۲۰۲-۲۰۵۔ بیضاوی، انوار التنزیل و اسرار التاویل: ۲ / ۲۵۴

لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ؕ وَ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا ○ (الاَحزاب:۳۶)

کردے تو انھیں اپنے معاملہ میں اختیار ہو، جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہی میں مبتلا ہوگیا۔

اسلام نے یہی نہیں کہ نوع انسانی کی دونوں اصناف کے لیے زندگی کی راہ متعین کی ہے، بلکہ ایک ہی راہ اور ایک ہی دستورِ حیات تجویز کیا ہے۔ اس نے عورت کو ذلیل وکم تر اور مرد کو بلند و برتر سمجھ کر جدا گانہ قوانین نہیں وضع کیے۔ اس کی تعلیمات دونوں کو ایک ہی مرتبہ میں رکھ کر خطاب کرتی ہیں اور یکساں ہدایات دیتی ہیں۔ اس کے ہاں نوعِ انسانی نہ تو طبقات میں منقسم ہے اور نہ درجات میں، بلکہ مرد اور عورت ایک ہی محاذِ جنگ کے سپاہی ہیں جن کے دائرۂ کار گو مختلف ہیں، لیکن مقصدِ کار اور نشانۂ عمل ایک ہی ہے۔

اس نے عقائد وعبادات، اخلاق و عادات، معاملات اور تعلقات میں سے کسی میں بھی عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا ہے۔ الّا یہ کہ خود اختلافِ صنف کسی ترمیم کا تقاضا کرے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّمَا النِّسَاءُ شَقَائِقُ الرِّجَالِ[1] عورتیں مردوں ہی کی ہم جنس ہیں۔

علامہ زین العابدین ابن نجیم مصری حنفی نے اپنی مشہور کتاب 'الاشباہ والنظائر' میں قوانینِ شریعت کے سارے دفتر کو کھنگال کر پچھتر (۷۵) کے قریب فرائض و واجبات، سنن ومستحبات اور مکروہات وممنوعات کی ایسی فہرست پیش کی ہے، جس میں شریعت نے اختلافِ صنف کی وجہ سے مرد اور عورت کے درمیان فرق کیا ہے۔ ان میں بیشتر احکام کا معاشرتی و اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثلاً عورت نماز میں کہاں ہاتھ باندھے گی اور مرد کہاں؟ عورت کا کفن کتنے کپڑوں کا ہوگا اور مرد کا کتنے کپڑوں کا؟ عورت کے علاماتِ بلوغ کیا ہیں اور مرد کے کیا؟ اجتماعی زندگی سے تعلق رکھنے والے مسائل، اس فہرست میں صرف چھ سات ہیں، ان میں سے بیشتر کی حقیقت اور نوعیت

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، باب فی الرجل یجد البلۃ فی منامہ۔ ترمذی، ابواب الطہارۃ، باب فیمن یستیقظ ویری بللاً ولا یذکر احتلاماً۔

سے انشاء اللہ اپنے مناسب مواقع پر بحث کی جائے گی[1] میراث بھی ان ہی مسائل میں شامل ہے، جن پر حقوق میں مساوات کے ذیل میں آگے بحث آ رہی ہے۔

---

[1] جن مسائل کا علامہ ابن نجیم نے ذکر کیا ہے، ان کے سلسلے میں خود فقہ حنفی میں بھی اختلافات ہیں، جنھیں شارح کتاب احمد بن محمد الحنفی الحموی نے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو 'غمز عیون البصائر شرح کتاب الاشباہ والنظائر' ۳/۳۸۱-۳۹۴، دار الکتب العلمیہ، بیروت ۱۹۸۵ء۔ فقہ شافعی میں بھی اس طرح کے جو فرق ہیں وہ علامہ جلال الدین سیوطی کی 'الاشباہ والنظائر فی قواعد وفروع فقہ الشافعیہ' میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ ص:۲۳۷-۲۴۰، دار الکتب العلمیہ، لبنان ۱۹۸۳ء



۹- حقوق میں مساوات

اسلام نے عورت کے ساتھ حسن سلوک کی اخلاقی ہدایات ہی نہیں دیں، صرف ترغیب وتذکیر ہی کا طریقہ نہیں اختیار کیا، بلکہ قانونی طور پر بھی اسے مستحکم حیثیت عطا کی۔

اسلام نے عورت پر ہونے والے ظلم کو جس تیزی سے ختم کیا، مختصر سے عرصہ میں اسے سماجی طور پر جس طرح اٹھایا اور قانونی حقوق و مراعات دیے وہ ایک انقلابِ عظیم تھا۔ اس سلسلے میں اسلام نے یکے بعد دیگرے جو مسلسل اقدامات کیے اس کا اندازہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے ایک بیان سے ہوتا ہے۔

كنا نتقي الكلام والانبساط الى نسائنا على عهد النبیؐ هيبة ان ينزل فينا شيء فلما توفى النبیؐ تكلمنا وانبسطنا[1]

نبی ﷺ کے زمانہ میں ہم اپنی عورتوں سے گفتگو کرتے اور بے تکلفی برتتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں ہمارے متعلق کوئی حکم نہ نازل ہوجائے۔ جب نبی ﷺ رحلت فرما گئے تو ہم ان کے ساتھ بے تکلف رہنے لگے۔

ریاست انسانی حقوق کی محافظ اور امن و امان کی ذمہ دار ہوتی ہے۔ اس کا فرض ہے کہ کسی بھی شہری پر ظلم نہ ہونے دے، جو ہاتھ جور وتعدی کے لیے اٹھے اسے قلم کردے اور جو قدم حق و انصاف کی پامالی کے لیے بڑھے اسے کاٹ پھینکے۔ انسان کی جان معاشرہ کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے، جو شخص ناحق کسی کی جان لے تو اسلام نے 'قصاص' کا حکم دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہی انصاف کا تقاضا اور ظلم کو روکنے کا راستہ ہے۔ اسی میں معاشرہ کی زندگی ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب الوصاۃ بالنساء۔ ابن ماجہ، باب ذکر وفاتہ و دفنہ صلی اللہ علیہ وسلم

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يَّا اُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ۝ (البقرۃ:۱۷۹)
اے عقل والو! تمہارے لیے قانونِ قصاص میں زندگی ہے۔ تاکہ تم ناحق قتل سے بچے رہو۔

(۱) شریعت کا یہ ایک کلی اصول ہے کہ قاتل سے قصاص میں اس کی جان لی جائے گی خواہ وہ کسی مرد کو قتل کرے یا کسی عورت کو، کیوں کہ ایک عورت کی جان بھی ویسے ہی محترم و معزز ہے جیسے ایک مرد کی جان ہو سکتی ہے اور جو ہاتھ ان دونوں میں سے کسی کے بھی خون سے رنگین ہو گویا خود اس نے اپنے خون کی قیمت کھو دی۔

اہلِ یمن کے لیے نبی ﷺ نے جو مجموعۂ قوانین تحریر کروایا تھا اس میں اس بات کی تصریح تھی:

اِنَّ الرَّجُلَ يُقْتَلُ بِالْمَرْأَةِ[1]
بلاشبہ عورت کے عوض مرد قتل کیا جائے گا۔

بخاری، مسلم، ترمذی، ابوداؤد، نسائی وغیرہ کتب صحاح کی روایت ہے کہ ایک یہودی نے ایک لڑکی کو اس کا سر کچل کر ہلاک کر دیا تو رسول اللہ ﷺ نے یہودی سے اسی شکل میں قصاص لیا۔[2]

حضرت عمرؓ سے یہاں تک ثابت ہے کہ آپ نے ایک عورت کے قصاص میں کئی اشخاص کو قتل کیا جو اس کے خون میں شریک تھے۔[3]

ابو الزناد کہتے ہیں:

كان من ادركت من فقهائنا الذى يُنتهىٰ الى قولهم منهم سعيد ابن المسيب و عروة بن الزبير والقاسم بن محمد و ابوبكر بن عبد الله و خارجة
ہمارے وہ فقہا، جن سے ہماری ملاقات ہے اور جن کے اقوال فقہ میں مرجع کی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں سعید بن مسیّب، عروہ بن زبیر، قاسم بن محمد، ابوبکر بن عبد الرحمٰن، خارجہ بن زید، عبید اللہ بن عبد اللہ، سلیمان بن

---

[1] بیہقی، السنن الکبریٰ: ۸/ ۵۲
[2] شوکانی، نیل الاوطار: ۷/ ۱۶۰
[3] جصاص، احکام القرآن: ۱/ ۱۶۲

بن زید بن ثابت و عبید الله بن عبد الله بن عتبة و سلیمان بن یسارٍ فی مشیخة جلة سواهم من نظرائهم من اهل فقهٍ و فضلٍ انهم کانوا یقولون المرأة تقاد من الرجل عینا بعینٍ و اذنا باذن و کل شیء من الجراح علیٰ ذٰلک و ان قتل قتل بها[۱]	یسار اور ان کے علاوہ ان ہی کے ہم پایہ دیگر اصحابِ فقہ و فضل شامل ہیں، کہتے ہیں کہ (قصاص کے معاملہ میں عورت اور مرد کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے) عورت کی آنکھ کان اور دوسرے کسی بھی زخم کے عوض مرد سے (اگر مرد مجرم ہے) اسی نوعیت کا بدلہ لیا جائے گا اور اگر مرد، عورت کو قتل کردے تو اس کو بھی قتل کیا جائے گا۔

(۲) عورت اگر اپنے کسی عزیز کے قتل کو معاف کردے تو کسی رشتہ دار کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے عطا کردہ پروانۂ معافی کو منسوخ کردے۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا:

علی المقتتلین ان ینحجزوا الاَول فالاَول و ان کانت امرأة[۲]	اگر اولیاء مقتول قاتل سے دیت لینے اور جان لینے کے بارے میں اختلاف کرنے لگیں اور کوئی قریبی رشتہ دار قاتل کی جان کو معافی عطا کردے تو دوسرے تمام رشتہ داروں کو جان لینے سے رُک جانا چاہیے۔ معافی دہندہ خواہ عورت ہی کیوں نہ ہو؟

یہی نہیں، بلکہ اگر وہ حالتِ جنگ میں کسی دشمن کو پناہ دے تو اس کو رد نہیں کیا جاسکتا۔ نبی ﷺ کا فرمان ہے:

ان المرأة لتأخذ للقوم[۳]	بلاشبہ مسلمانوں کے فائدے کے لیے عورت دشمن قوم کو پناہ دے سکتی ہے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ:

۱؎ بیہقی، السنن الکبریٰ: ۸/ ۷۲

۲؎ ابوداؤد، کتاب الدیات، باب عفو النساء عن الدم۔ نسائی، کتاب القسامة، باب عفو النساء عن الدم۔

۳؎ ترمذی، ابواب السیر، باب ماجاء فی امان العبد والمرأة۔

ان كانت المـرأة لتجـير على المؤمنين فيجوز[1]	عورت محاربینِ اہل ایمان کو پناہ دے سکتی ہے اور اس کی پناہ نافذ ہوگی۔

مشہور واقعہ ہے کہ فتح مکہ کے وقت ام ہانیؓ نے رسول اللہﷺ سے عرض کیا کہ میں نے ابن ہبیرہ کو پناہ دی ہے لیکن علیؓ کہتے ہیں کہ وہ اس کو قتل کر کے رہیں گے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

قـد اجرنـا من اجـرت يـا ام هانی[2]	ام ہانی! تم نے جسے پناہ دی اسے ہماری بھی پناہ ہے۔

(۳) حدودِ شریعت کے اندر رہتے ہوئے اسلام مالیات کے میدان میں عورت اور مرد کو دوڑ دھوپ کی اجازت عطا فرماتا ہے اور ان کی محنت کے صلہ کو ان کا جائز حق تسلیم کرتا ہے، جس پر قانوناً کوئی بھی شخص دست درازی نہیں کرسکتا۔ حتی کہ خاوند بھی بیوی کے مال میں تصرف کا مجاز نہیں ہے اور نہ بیوی کے لیے یہ جائز ہے کہ شوہر کی دولت میں اپنی مرضی نافذ کرے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ط وَ لِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ط وَ اسْئَلُوا اللّٰهَ مِنْ فَضْلِهٖ (النساء:۳۲)	مردوں کو اپنی کمائی کا حصہ ہے اور عورتوں کو اپنی کمائی کا حصہ ہے اور (دونوں) اللہ سے اس کا فضل مانگو۔

قانونِ وراثت اور اس پر اعتراض

(۴) قانونِ وراثت کے تحت یہ کلیہ بیان ہوا ہے:

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوْضًا (النسا:۷)	جو کچھ ماں باپ اور رشتہ دار چھوڑیں خواہ وہ تھوڑا ہو یا زیادہ اس میں مردوں کا بھی حصہ ہے اور عورتوں کا بھی حصہ ہے۔ ایک مقرر حصہ۔

اسلام کے ضابطہ وراثت کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں مرد

---

[1] ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی امان المرأۃ۔
[2] بخاری، کتاب الجہاد، باب امان النساء وجوارہن۔

اور عورت کے درمیان مساوات نہیں پائی جاتی، اس لیے کہ اس میں عورت کا حصہ کم ہے۔ بعض اوقات سطح بین نگاہیں اس سے دھوکا بھی کھا جاتی ہیں۔ اس لیے یہاں اختصار کے ساتھ ان اصولوں کی نشان دہی کی جا رہی ہے، جن پر اسلام کا قانونِ وراثت قائم ہے۔

(ا) اس نے پہلا اصول یہ پیش کیا:

لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ — ایک مرد کا حصہ دو عورتوں کے حصہ کے برابر ہوگا۔ (النساء:۱۱)

اس پر عمل درآمد دو صورتوں میں ہوگا۔

پہلی صورت یہ ہے کہ وارث میت سے بلا واسطہ جائز تعلق رکھتا ہو، مثلاً میاں بیوی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ ورثاء رشتہ کے لحاظ سے ایک درجہ کے ہوں اور میت کے سارے مال کے بہ حیثیت عصبہ (عصبہ ان ورثاء کو کہتے ہیں جو متعینہ حقوق کی ادائی کے بعد بقیہ تمام مال کے مالک ہوجائیں) وارث ہوں۔ مثلا میت کی اولاد بھائی بہن وغیرہ۔

بہ ظاہر ان دونوں صورتوں میں صنفین کے درمیان مساوات نہیں برتی گئی ہے اور مرد کے مقابلہ میں عورت کی مالی پوزیشن کم زور کردی گئی ہے لیکن اگر اسلام کے پورے خاندانی سسٹم پر غور کیا جائے تو حقیقت اس کے برعکس نظر آئے گی۔ اسلام نے عورت کی مالی حیثیت کو اس کی بعض فطری کم زوریوں کی بنا پر بہت زیادہ محفوظ اور مضبوط کر دیا ہے جب کہ مرد کی اقتصادی حالت ہر آن غیر یقینی اور نا مستحکم ہے، وہ اگر وراثت میں عورت کا آدھا حصہ مقرر کرتا ہے تو دو طریقوں سے اس کی تلافی بھی کرتا ہے۔ ایک تو یہ کہ وہ بیوی کو شوہر سے مہر دلواتا ہے، جس کی وہ بلاشرکت غیرے حق دار ہوتی ہے، دوسرے یہ کہ شادی میں جو مال و زیور اور تحفے تحائف دیے جاتے ہیں ان کا بھی عورت ہی کو مالک قرار دیتا ہے۔

یہاں ایک اور پہلو بھی ہے، وہ یہ کہ اسلام پورے خاندان کی معاشی، تعلیمی اور تربیتی ذمے داری اصلاً مرد پر ڈالتا ہے، بالخصوص معاشی ذمے داری جس سے عورت بڑی حد تک آزاد ہے۔ یہی نہیں بلکہ حکم ہے کہ خود عورت کا معاشی بار شادی سے پہلے اس کا سرپرست اٹھائے اور شادی کے بعد خاوند برداشت کرے۔ ایسی صورت میں دونوں کو وراثت میں بھی مساوی حقوق دینا کس طرح قرینِ عقل و انصاف ہوسکتا ہے؟

ان دو پہلوؤں سے قطع نظر جہاں اسلام نے محض رشتہ کا خیال کیا ہے، وہاں عورت اور مرد کو مساوی درجہ دیا ہے۔ مثلاً میت کی اولاد کی موجودگی میں والدین کے حصے یکساں ہوں گے، یا اخیافی بھائی بہن (ماں جائے بھائی بہن) کہ ان کے درمیان بھی اسلام نے کوئی فرق نہیں کیا ہے۔

(۲) دوسرا اصول شریعت نے یہ پیش کیا ہے:

اَلْحِقُوا الْفَرائِضَ بِاَهْلِهَا فَمَا بَقِيَ لِاَوْلِىٰ رَجُلٍ ذَكَرٍ[1]

حقوق کو اصحابِ حقوق تک پہنچاؤ اور جو کچھ باقی رہے قریبی رشتہ دار مرد کا حصہ ہوگا۔

قانونِ وراثت کی یہ دفعہ اس وقت تک سمجھ میں نہیں آسکتی جب تک اسلام کے نظامِ معاشرت کے ایک دوسرے اصول کو پیش نظر نہ رکھا جائے، وہ یہ کہ اسلام نے مرد پر مالی بار ڈالنے کے ساتھ رجالِ خاندان کے درمیان تعاون و تناصر کے ضابطے بھی مقرر کردیے ہیں۔ یہ ضابطے نہ صرف اخلاقی اہمیت کے حامل ہیں، بلکہ انھیں قانونی اور دستوری حیثیت بھی حاصل ہے۔ اگر ایک شخص افلاس کا شکار ہو جائے تو رجالِ خاندان میں نسبتاً جو اس سے قریب تر ہوگا اس پر سب سے زیادہ مالی تعاون اور کفالت کی ذمے داری عائد ہوتی ہے۔

یہ موقع ان مباحث کی تفصیل کا نہیں ہے۔ کہنے کا منشا صرف یہ ہے کہ جب

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الفرائض

ایک شخص زندگی کے ہر نشیب و فراز اور ہر مصیبت میں سب سے زیادہ پشت پناہ اور سہارا ہو تو کیا عقل و فہم اور اخلاق و قانون اس بات کا تقاضا نہیں کرتے کہ ادائے حقوق کے بعد کم از کم بقیہ مال کا وہ وارث قرار دیا جائے؟ لیکن قانونِ وراثت میں چوں کہ اصلاً اہمیت نسب ہی کو دی گئی ہے، اس لیے اس ضابطہ کے تحت ضروری نہیں کہ مرد کو زیادہ ہی حصہ ملے۔ یہ عین ممکن ہے کہ ایک عورت مورث سے قریبی تعلق رکھتی ہو اور وہ اس مرد سے زیادہ حصہ پائے جو مورث کا دور کا رشتہ دار ہے۔ مثلاً فرض کیجیے ایک شخص اپنے پیچھے ایک بیوی، ایک لڑکی یا ایک بہن اور ایک چچا چھوڑ جاتا ہے تو اسلامی قانونِ وراثت اس کے مال متروکہ سے بیوی کو ایک چوتھائی اور لڑکی یا بہن میں سے جو ہو اُسے آدھا اور چچا کو ایک چوتھائی دلائے گا۔

اسلام کے پورے نظام معاشرت پر غور کرنے کے بعد یہ ہرگز نہیں کہا جاسکتا کہ اس نے ناانصافی اور جانب داری کی راہ اختیار کی ہے۔ اس نے مرد اور عورت کے حقوق اور ذمے داریوں کے تعیّن میں اس طرح اعتدال اور توازن رکھا ہے کہ نہ تو عورت اپنی محرومی کی شکایت کرسکتی ہے اور نہ مرد زیادہ حق پانے کا دعویٰ کرسکتا ہے۔[1]

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ'، بحث: عورت کا حق وراثت، ص ۱۸۵-۲۰۰۔ ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

۱۰- قانونِ زوجیت

قرآن مجید نے کتابِ قانون میں، اخلاق کے صحیفہ میں اور حقوق کی فہرست میں عورت اور مرد کو ایک حیثیت عطا کی، دونوں کی عزت و ذلت کا ایک معیار قرار دیا، دونوں کے لیے ترقی و کامیابی کے یکساں مواقع فراہم کیے، دونوں کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کو لازم قرار دیا۔ یہ کیوں اور اس کی بنیاد کیا ہے؟ دنیا کے موجودہ لٹریچر میں قرآن پاک نے سب سے پہلے اس کا فلسفیانہ اور عقلی جواب دیا اور اسے دلیل و برہان کی پوری قوت سے پیش کیا۔ دنیا تحقیق و تجربہ کے صدہا مراحل سے گزرنے کے باوجود مساواتِ مرد و زن کی اس سے بہتر اور سائنٹفک توجیہ نہیں کرسکی۔

اس نے کہا، یہ کائنات ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت پیدا کی گئی ہے اور انتہائی نظم و ضبط اور ہم آہنگی و یگانگت کے ساتھ اس طرح مصروف عمل ہے کہ ہزارہا سال بیت گئے، لیکن اس نگار خانہ کی رنگینیوں اور دل فریبیوں میں شمّہ برابر فرق نہ آیا۔ زمانہ کی گردشیں مسلسل اپنا کام کرتی چلی جا رہی ہیں، لیکن اس انجمنِ زرنگار کی تابانی اور حیرت انگیزی جوں کی توں قائم ہے۔ آخر وہ کون سی قوت ہے، جو اس کائنات کو آغوشِ فنا میں جاگرنے سے روکے ہوئے ہے؟ وہ کون سا قانون ہے، جو اس کے لمحاتِ حیات کو دراز کیے چلا جا رہا ہے؟ اس کا جواب قرآن یہ دیتا ہے کہ یہاں قانونِ زوجیت کی کارفرمائی ہے، یعنی اس عالم کی ہر شئے کے اندر اپنی نوع کی بقا کا جذبہ پایا جاتا ہے اور قدرت نے اس جذبہ کی آسودگی کے لیے خود اسی کی نوع سے ایک صنفِ مقابل کی تخلیق کی ہے، یہ صنف مقابل اس کے جذبات و احساسات کو سوز و حرکت عطا کرتی اور اسے مجبور کرتی ہے کہ بقائے نوع کا سامان کرے اور عروسِ عالم کی جمال و رعنائی اور نظر افروزی

میں کوئی فرق نہ آنے دے۔

جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا وَّمِنَ الْاَنْعَامِ اَزْوَاجًا یَذْرَؤُکُمْ فِیْهِ (الشوریٰ:۱۱)	اس نے تم ہی میں سے تمھارے جوڑے پیدا کیے اور جانوروں میں بھی جوڑے پیدا کیے۔ اس طرح وہ تمھیں پھیلاتا ہے۔
وَ مِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَo (الذاریٰت:۴۹)	اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے پیدا کیے تا کہ تم سمجھ سکو۔
سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ کُلَّهَا مِمَّا تُنْبِتُ الْاَرْضُ وَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ وَ مِمَّا لاَ یَعْلَمُوْنَo (یٰسٓ:۳۶)	پاک ہے وہ ذات، جس نے ہر چیز کے جوڑے پیدا کیے ان چیزوں میں بھی جو زمین اُگاتی ہے اور خود ان ہی کے اندر بھی اور دوسری بہت سی) چیزوں میں بھی جنھیں وہ نہیں جانتے۔

ان آیات میں صراحت سے کہا گیا ہے کہ قانونِ زوجیت اپنی وسعت میں کائنات کی ہر شے پر حاوی ہے۔ اس سے نہ انسان مستثنیٰ ہے، نہ دنیا کی کوئی دوسری چیز۔ اگر یہ نہ ہوتو تغیرات کی نیرنگی اور بازارِ حسن و جمال کی سحر آفرینی و دل ربائی آناً فاناً ختم ہو جائے گی اور ہر شے سکون نا آشنا اور محرومِ تمنا رہ جائے گی۔ انسان کے صنفی جذبات بھی اس کی صنف مقابل کے بغیر کسی طرح سکون و اطمینان سے ہم آغوش ہو ہی نہیں سکتے۔ مرد کی زندگی کے بہت سے ایسے خالی گوشے ہیں جنہیں عورت کے حسین ہاتھ ہی پر کر سکتے ہیں، وہ اس کے جبلّی تقاضوں اور فطری سوالات کا جواب اور اس کے ترانۂ محبت کا ساز ہے۔ اسی طرح مرد کے بغیر نسائیت کی بستی سونی رہتی ہے، وہ اس کی کائناتِ جذبات کی رونق اور اس کی بے تابیوں اور بے کلیوں کا علاج ہے۔

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کی مخلوقات میں نقص یا عیب ہے، یہاں کا ہر پھول بے داغ اور ہر نقش لاثانی ہے۔ خامۂ قدرت کی کسی بھی تحریر میں عیب اور خامی کی نشان دہی نہیں کی جاسکتی، کہنے کا منشا یہ ہے کہ قدرت نے بزمِ عالم کو اس طرح آراستہ کیا ہے کہ یہاں کا ہر نقش دوسرے نقش کی تکمیل کا ذریعہ بنتا ہے۔ قانونِ زوجیت بھی اسی کی ایک جامع و مکمل شکل ہے۔ بالفاظِ دیگر دنیا کی ہر شے اپنی بعض ذاتی استعدادات

اور نوعی خصوصیات کے اظہار کے لیے ایک میدان کی محتاج ہے اور صنفِ مقابل یہ میدان فراہم کرتی ہے۔ یہ ایک طرح کی نسبت ہے، جو زوجین کے درمیان پائی جاتی ہے اور دونوں مساوی طور پر ایک دوسرے کے محتاج ہیں۔ اس میں ذلت و حقارت اور عزت و سربلندی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ قرآن مجید نے بار بار نئے نئے اسالیب سے اس حقیقت کی توضیح کی ہے۔ ایک مقام پر کہا:

هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَ اَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (البقرۃ:۱۸۷)

وہ تمھارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے لباس ہو۔

غور کیجیے کتنی لطیف تعبیر ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ مرد کی زندگی میں بہت سے ایسے تشنہ پہلو ہیں جن کی آسودگی کا سامان عورت ہی کرسکتی ہے اور خود عورت کی زندگی کے متعدد گوشے مرد کے بغیر محتاجِ تکمیل رہتے ہیں۔ ایک اور مقام پر قرآن نے کہا کہ یہ رشتہ غصہ و نفرت کا نہیں الفت و محبت کا رشتہ ہے۔ اس کی ترکیب دشمنی و عداوت کے عناصر سے نہیں ہوئی ہے بلکہ اس میں محبت و چاہت کی تحلیل کی گئی ہے۔ یہ تعلق بغض و کینہ کی تخم ریزی کے لیے نہیں بلکہ دل بستگی و شیفتگی کی نشو و نما کے لیے وجود میں آیا ہے:

وَ مِنْ اٰيٰتِهٖۤ اَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا لِّتَسْكُنُوْۤا اِلَيْهَا وَ جَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّ رَحْمَةً ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ○ (الروم:۲۱)

اس کی نشانیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس نے تمھارے لیے تم ہی میں سے جوڑے پیدا کیے تاکہ تم ان سے سکون حاصل کرو اور اس نے تمھارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کردی۔ بلاشبہ اس میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے نشانیاں ہیں۔

اسلام نے اس پر ایک اور پہلو سے بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس دنیا میں انسان کی پیدائش کا ایک طریقہ ہے۔ اس سے مرد اور عورت پیدا ہوتے ہیں اور نسل انسانی پھیلتی ہے۔ یہ خدا کی قدرت، دونوں کی زندگی کے بامقصد ہونے اور آخرت کے امکان کی دلیل ہے تاکہ یہ دیکھا جائے کہ انھوں نے اس مقصد کی تکمیل کی یا نہیں اور

کی تو کس حد تک کی ہے؟

وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ جَعَلَكُمْ اَزْوَاجًا...(فاطر:۱۱)

اللہ نے تم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر نطفہ سے پھر اس نے تمھیں جوڑے جوڑے بنائے۔

ایک اور جگہ فرمایا:

وَ اَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَ الْاُنْثٰىۙ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰىۙ وَ اَنَّ عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰىۙ (النجم:۴۵-۴۷)

اسی نے نر اور مادہ دونوں جنس، نطفہ سے پیدا کیے جب کہ وہ رحم میں ڈالا جاتا ہے اور اس کے ذمہ ہے (قیامت کے روز) دوبارہ اٹھانا۔

سورۂ قیامہ میں یہ مضمون زیادہ وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

اَيَحْسَبُ الْاِنْسَانُ اَنْ يُّتْرَكَ سُدًىؕ اَلَمْ يَكُ نُطْفَةً مِّنْ مَّنِيٍّ يُّمْنٰىۙ ثُمَّ كَانَ عَلَقَةً فَخَلَقَ فَسَوّٰىۙ فَجَعَلَ مِنْهُ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰىؕ اَلَيْسَ ذٰلِكَ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰىؒ (القیامہ:۳۶-۴۰)

کیا انسان یہ خیال کرتا ہے کہ وہ بے کاریوں ہی چھوڑ دیا جائے گا، کیا وہ نطفۂ منی نہ تھا جو (رحم مادر میں) ٹپکایا جاتا ہے پھر اس نے گوشت کے لوتھڑے کی شکل اختیار کی۔ اللہ نے اسے انسان بنایا اسے نک سک سے ٹھیک کیا۔ پھر اس سے مرد اور عورت دو انواع بنائے۔ (جو خدا یہ سب کچھ کرتا ہے) کیا وہ اس کی قدرت نہیں رکھتا کہ مردوں کو زندہ کرے؟

ان آیات میں نوعِ انسانی کے درمیان جو قانون زوجیت کارفرما ہے اس کا ذکر ہے۔ تخلیق کا ایک طریقہ ہے اس سے مرد اور عورت دونوں وجود میں آتے ہیں۔ دونوں کی تخلیق بے مقصد نہیں ہے۔ ان کا ایک مقصد حیات ہے۔ اس کے متعلق ان سے قیامت کے روز باز پرس ہوگی۔ اس تصور نے مرد اور عورت دونوں کو ذمے دارانہ حیثیت عطا کی ہے اور ان کے درمیان فرق و امتیاز کے تمام جھوٹے تصورات ختم کردیے ہیں۔

یہ ہیں وہ اساسات جو اسلامی معاشرے میں عورت کی حیثیت متعین کرتے ہیں۔ ان اساسات کے بغیر اسلامی معاشرہ کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

عورت کا حقیقی دائرۂ کار

اسلامی معاشرہ میں مسلمان عورت کا کیا رول ہوگا اور اس کی تگ و دو کن خطوط پر ہوگی؟ اس سوال کا جواب قرآن مجید نے حضور اکرم ﷺ کی ازواجِ مطہرات کو خطاب کرتے ہوئے یہ دیا ہے:

وَ قَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ وَلاَ تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی (الاحزاب: ۳۳)	اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور اگلے دورِ جاہلیت کی طرح زیب و زینت کا اظہار نہ کرتی پھرو۔

پس منظر

اس فرمان کا پس منظر یہ ہے کہ ہجرت کے بعد رسول اللہ ﷺ اور صحابۂ کرام اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ مدینہ کی چھوٹی سی ریاست کو اسلامی اصول و اخلاق کی جلوہ گاہ بنائیں اور جو خواب وادیِ مکہ میں شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا تھا اس کو سرزمین مدینہ میں حقیقت اور واقعہ ثابت کر دکھائیں، لیکن اس فیصلہ کو وہ قوتیں کسی طرح برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہ تھیں، جن کو شرافت و اخلاق اور صلاح وتقویٰ کے فروغ میں اپنا زوال نظر آرہا تھا۔ جیسے ہی آپؐ نے اپنی مہم کا آغاز فرمایا، ہر جہت سے فتنہ و فساد کی آندھیاں اٹھنے لگیں اور ابھی چھ سال بھی پورے گزرنے نہیں پائے تھے کہ مخالفت کا طوفان اس طرح افقِ مدینہ پر چھا گیا کہ رہ رہ کر شبہ ہوتا تھا کہ شاید اب حق کی شمع ہمیشہ

کے لیے بجھ جائے اور دنیا تاقیامت باطل کے قبضہ میں چلی جائے۔

فساد کے یہ سرچشمے مدینہ کے باہر ہی نہیں تھے، بلکہ اندرون مدینہ بھی نفاق اور عداوت کا الاؤ پوری شدت کے ساتھ بھڑک رہا تھا۔ منافقین انتہائی کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح اخلاق اور خدا ترسی کا پودا مدینہ میں جڑ نہ پکڑنے پائے اور سارا ماحول نیکی اور تقویٰ سے اسی طرح تہی دامن رہے، جس طرح خود ان کی زندگیوں کے اوراق ان پاکیزہ نقوش سے خالی ہیں۔ ان کی مفسدانہ کوششوں کا ایک بہت بڑا ہدف لوگوں کی عفت و عصمت بھی تھی، کیوں کہ اسلامی معاشرہ کے اس بنیادی ستون کو ڈھائے بغیر وہ اپنی ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات کی دنیا تعمیر نہیں کر سکتے تھے۔

اس دوہری اور فیصلہ کن کشمکش کا تصور کیجیے اور پھر بتایئے کہ اس نازک وقت میں دنیا کے کسی بھی دانش مند کا کیا فیصلہ ہوگا؟ غالباً یہی کہ ملت کے ایک ایک فرد کو دشمن کے مقابلہ میں کمربستہ ہو جانا چاہیے اور اس وقت تک ہتھیار نہیں رکھنا چاہیے، جب تک کہ ملک اور معاشرہ ہر قسم کے خطرات سے محفوظ نہ ہوجائے۔ دنیا کی اس 'دانش مندانہ' رائے کے برخلاف اسلام نے ملک و ملت کے تحفظ کے نئے اصول و آئین وضع کیے۔ اس نے مرد کے متعلق تو فیصلہ کیا کہ اسے ہر فتنہ کا دو بدو مقابلہ کرکے اس کا سر کچلنا چاہیے، لیکن دخترانِ ملت کو ان کی ماؤں کے واسطے سے یہ حکم دیا کہ وہ اس جنگ میں شریک تو ضرور ہوں، لیکن گھروں کے حصار میں رہ کر، وہ دین و ایمان کی غارت گر قوتوں کے مقابلہ میں لگی تو رہیں، لیکن اپنی سیرت و کردار اور عزت و ناموس کو گھر کی پناہ گاہ میں محفوظ رکھتے ہوئے۔

اس پس منظر میں قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ اسلام نے ریاست اور معاشرہ کے تحفظ کی ذمے داری اصلاً مرد کے سر ڈالی ہے اور عورت کی جدوجہد کا رُخ گھر کی طرف موڑ دیا ہے۔ اس کی حقیقی پوزیشن یہ نہیں ہے کہ وہ بازار کی تاجر، دفتر کی کلرک، عدالت کی جج اور فوج کی سپاہی بنی رہے، بلکہ اس کے عمل کا حقیقی

میدان گھر ہے۔

فقہ اسلامی کی معروف شخصیت علاّمہ ابو بکر جصّاصؒ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

و فیه الدلالة علی ان النساء	اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ عورتیں
مامورات بلزوم البیوت	اپنے گھروں سے چمٹی رہنے پر مامور ہیں
منھیات عن الخروج[1]	اور ان کو باہر نکلنے سے روک دیا گیا ہے۔

عورت کی مصروفیات کا احترام

اسلام نے زندگی کی تعمیر کا جو نقشہ پیش کیا ہے، خواہ اس کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے، خاندانی نظم سے ہو یا معاشرتی آداب سے، اقتصادی قوانین سے ہو یا اصولِ تہذیب سے، اس نے کسی بھی گوشہ میں عورت کی اس حیثیت کو مجروح ہونے نہیں دیا ہے۔

دین میں عبادات کی جیسی کچھ اہمیت ہے اس سے ہر شخص واقف ہے۔ حقیقت میں یہ روحِ دین اور جانِ شریعت ہیں۔ ان عبادات کی ایک اہم خصوصیات یہ ہے کہ ان کے مخاطب ہیں تو افراد، لیکن ان کے ادا کرنے کی صورت اجتماعی رکھی گئی ہے۔ نماز ادا ہو تو جماعت کی شکل میں۔ روزہ رکھیں تو سب مل کر ایک ساتھ اور ایک مہینہ میں۔ زکوٰۃ کی تحصیل و تقسیم کا حق ہے تو اولاً ریاست کو۔ فریضۂ حج انجام پاسکتا ہے تو سب کے ساتھ اور مخصوص ایام میں۔ عبادات کو یہ اجتماعی رُخ اس لیے دیا گیا تاکہ آدمی کے اندر اپنی تربیت اور سیرت سازی کے روپ میں انفرادیت پسندی اور اجتماعیت سے گریز کے رجحانات نہ پیدا ہونے پائیں اور اس کو ہر قدم پر یہ محسوس ہو کہ وہ ایک امت کا فرد اور اس کی صلاح و فلاح کا ذمہ دار ہے۔

کوئی بھی اجتماعی عمل اسی وقت انجام پاتا ہے جب کہ افراد اپنی انفرادی

---

[1] جصاص، احکام القرآن: ۳/۳۵۸

سرگرمیوں کو ترک کر کے اُس میں شریک ہوں اور اسی کے لیے طے شدہ طریقہ اور اجتماعی ہیئت اختیار کرلیں۔ اس کے لیے تاجر کو تجارت ترک کرنی پڑتی ہے، استاذ اور طالب علم کو درس و تدریس کا سلسلہ بند کرنا ہوتا ہے۔ مزدور کو اپنی مزدوری سے دست کش ہونا پڑے گا۔ اس طرح ہر فرد اپنی ذاتی مصروفیت چھوڑ کر اجتماعی کاموں میں شریک ہوتا ہے۔

لیکن شریعت کی نگاہ میں اجتماعی عبادات میں عورت کی شرکت سے زیادہ اس بات کی اہمیت ہے کہ وہ اپنے محاذ پر جمی رہے۔ اس کا کسی اجتماعی پروگرام سے الگ رہنا معاشرہ کے لیے اتنا زیادہ نقصان دہ نہیں ہے جتنا کہ اس کا اپنے مرکز کو چھوڑنا ضرر رساں ہوسکتا ہے۔ اجتماعی طریقہ پر عبادات کی ادائی کے ذریعے جن فوائد کی توقع کی جاتی ہے، ان کی تلافی دوسرے طریقوں سے ممکن ہے، لیکن عورت کے اپنی جگہ سے ہٹ جانے سے جو خلا پیدا ہوتا ہے اس کو کسی اور ذریعے سے بھرا نہیں جاسکتا۔ یہی وجہ ہے کہ عبادات ہوں یا دیگر فرائضِ حیات، ان کو عورت پر یا تو اجتماعی شکل میں فرض ہی نہیں کیا گیا ہے یا فرض کیا بھی گیا ہے تو ان ہی عبادات و فرائض کو جو اسے اپنے مقاصد سے غافل کرنے والے نہیں ہیں۔

عبادات کے اہم ترین جزء نماز کو لیجیے۔ مرد پر نماز جماعت کے ساتھ فرض ہے۔ عورت پر نماز تو فرض کی گئی، لیکن جماعت کو ضروری نہیں قرار دیا گیا۔ مرد اگر بلا وجہ جماعت سے پیچھے رہتا ہے تو اس کو انتہائی زجر و توبیخ کا مستحق سمجھا جاتا ہے، اس کے برعکس عورت کو مختلف پہلوؤں سے ترغیب دی جاتی ہے کہ وہ اپنے مکان کے کسی گوشہ ہی کو اپنی عبادت گاہ بنائے۔

حضور اکرم ﷺ کا فرمان ہے:

خَیْرُ مَسَاجِدِ النِّسَاءِ قَعْرُ بُیُوْتِهِنَّ[1]	عورتوں کی بہترین مسجدیں ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں۔

---

[1] مسند احمد: ۷/۲۱۷ حدیث نمبر ۲۶۰۰۲۔ حاکم، المستدرک: ۱/ ۳۲۸

مشہور صحابی ابوحمید ساعدیؓ کی بیوی آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کرنے لگیں، یا رسول اللہ! میں چاہتی ہوں کہ آپؐ کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھا کروں، آپؐ کی کیا رائے ہے؟ حضورؐ نے جواب دیا: مجھے یقین ہے کہ واقعۃً تمہاری یہ خواہش ہے، لیکن جان لو، اپنے مکان کی کسی تنگ کوٹھری میں نماز پڑھنا تمہارے لیے کشادہ کمرہ میں نماز پڑھنے سے بہتر ہے۔ تمھاری جو نماز کمرہ میں ادا ہو وہ مکان کے وسط میں ادا کی جانے والی نماز سے اولیٰ ہے اور وسط مکان میں پڑھی جانے والی نماز افضل ہے اس نماز سے جو تم اپنے محلّہ کی کسی مسجد میں ادا کرو۔ اسی طرح تمھاری جو نماز اپنے محلّہ کی مسجد میں ادا ہوتی ہے وہ تمھارے حق میں میری مسجد میں پڑھی جانے والی نماز سے بہتر ہے۔

حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ کے فرمان کا ابوحمید ساعدیؓ کی بیوی پر یہ اثر ہوا کہ انھوں نے مکان کے بالکل تنگ حصہ میں نماز کی جگہ متعین کر رکھی تھی اور زندگی بھر وہیں نماز ادا کرتی رہیں۔[1]

جمعہ نہ صرف یہ کہ اجتماعیت کا مظہر ہے بلکہ وہ افرادِ ملت کو ایک دوسرے سے قریب کرنے اور دینی تعلیمات اور ہدایات سے روشناس کرانے کا بھی ایک بہترین ذریعہ ہے، لیکن آپ دیکھیں گے کہ شریعت نے عورت کو اس اجتماعی طریقِ عبادت سے بھی مستثنیٰ رکھا ہے:

عَنْ طَارِقِ بْنِ شِهَابٍ عَنِ النَّبِيِّ قَالَ الْجمعةُ حَقٌّ وَاجِبٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ اِلَّا اَرْبَعَةً عَبْدٌ مَمْلُوْكٌ او امْرأةٌ اَوْ صَبِيٌّ اَوْ مَرِيْضٌ.[2]

طارق بن شہابؓ، نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ جمعہ ہر مسلمان پر واجب ہے سوائے چار قسم کے لوگوں کے۔ غلام، عورت، بچہ اور مریض۔

اسلامی معاشرہ پر ایک مومن کا حق زندگی میں بھی ہوتا ہے اور اس وقت بھی جب کہ وہ اس دنیا سے کوچ کر جائے، جس طرح معاشرہ نے لمحاتِ حیات میں اس کو ہر

---

[1] مسند احمد: ۷/ ۵۱۴، ۵۱۵، حدیث نمبر ۲۶۵۵۰۔ الاستیعاب لابن عبد البر تذکرۃ ام حمید الانصاریہ

[2] ابوداؤد، باب الجمعۃ للمملوک والمرأۃ

ممکن راحت پہنچائی، اسی طرح یہ بھی اس کا فرض ہے کہ جب اس کا سفر ختم ہو تو بہتر طریقہ سے اس کو سپردِ خاک کرے۔ لیکن ام عطیہؓ کی روایت ہے:

نُهِينَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَـائِزِ وَ لَمْ يُعْزَمْ عَلَيْنَا[۱]

ہمیں جنازوں کی مشایعت سے منع کیا گیا، لیکن اس معاملے میں ہم پر سختی نہیں کی گئی۔

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات آپ نے اس سلسلے میں سختی بھی کی ہے۔ حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم حضورؐ کے ساتھ ایک جنازہ لیے جا رہے تھے۔ آپؐ نے بعض عورتوں کو پیچھے چلتے ہوئے دیکھا تو (غصہ سے) پوچھا: کیا تم اسے اٹھا رہی ہو؟ عورتوں نے جواب دیا: نہیں! آپؐ نے دریافت کیا: کیا تم اس کے دفن کرنے میں حصہ لوگی؟ انھوں نے کہا: نہیں! آپ نے فرمایا: جب تمہارا یہاں کوئی کام نہیں ہے تو آخر آنے کی کیا ضرورت تھی؟ تمھیں اس کا اجر کچھ نہیں ملے گا، واپس جاؤ اپنے سر وبال لے کر۔[۲]

اسلام حق سے وفاداری کا نام ہے۔ مسلمان وہ ہے، جو اس وفاداری کا عہد کرے، اس عہد کے بعد یوں تو زندگی کے ہر قدم پر ایک مومن کے پیمانِ وفا کا امتحان ہوتا رہتا ہے، لیکن اس امتحان کا انتہائی سخت مرحلہ اس وقت پیش آتا ہے جب کہ حق کے باغی پوری قوت کے ساتھ میدان میں آچکے ہوں اور حق و باطل کی موت و حیات کا فیصلہ ہو رہا ہو۔ اس وقت ایک باوفا بندے کا فرض ہے کہ حق کی حفاظت کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔ اسلام نے ان نازک لمحات میں بھی عورت سے اس کی وفاداری کا ثبوت محاذِ جنگ پر نہیں طلب کیا ہے، بلکہ گھر کے دائرہ ہی کو اس کی آزمائش کا میدان قرار دیا اور خاوند، اولاد اور خویش و اقارب کے ساتھ خیر خواہی کو اس کے ایمان کی دلیل سمجھی ہے:

عَنْ عَائِشَةَ عَنِ النَّبِيِّ اَنَّـهُ قَالَ: عَلَيْكُنَّ بِالْبَيْتِ فَاِنَّهُ جِهَادُ كُنَّ[۳]

حضرت عائشہؓ نبی ﷺ سے روایت کرتی ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: تم اپنے گھر میں جمی رہو کیوں کہ یہی تمہارا جہاد ہے۔

---

۱ بخاری، کتاب الجنائز، باب اتباع النساء الجنازۃ

۲ ابن حجر، فتح الباری: ۳/ ۵۳۶

۳ مسند احمد: ۷/ ۱۰۱، حدیث نمبر ۲۳۸۷۲

ایک صحابیہ نے حضور ﷺ سے دریافت فرمایا:

كَتَبَ اللّٰهُ الْجِهَادَ عَلَى الرِّجَالِ فَاِنْ اَصَابُوْا اُجِرُوْا وَ اِنِ اسْتُشْهِدُوْا كَانُوْا احياءً عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ فَمَا يَعْدِلُ ذٰلِكَ مِنْ اَعْمَالِهِمْ مِنَ الطَّاعَةِ

اللہ تعالیٰ نے مردوں پر جہاد فرض کیا ہے۔ اگر وہ فتح یاب ہوتے ہیں تو غنیمت پاتے ہیں اور اگر شہید ہوتے ہیں تو وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں جہاں ان کو روزی ملتی ہے۔ پس عورتوں کا کون سا عمل ان کے اس عمل کے برابر ہوگا؟

آپؐ نے جواب دیا:

طَاعَةُ اَزْوَاجِهِنَّ وَالْمَعْرِفَةُ بِحُقُوْقِهِنَّ[1]

اپنے شوہروں کی اطاعت اور ان کے حقوق کا پہچاننا۔

اللہ تعالیٰ کی راہ میں جان و مال اور آسائش و راحت کی قربانی کے جذبہ سے کسی بھی مسلمان خاتون کا دل خالی نہیں ہوسکتا۔ شریعت نے اس جذبہ کی تسکین کا سامان تو کیا، لیکن جدوجہد اور ایثار و قربانی کا رُخ موڑ دیا۔ وہ اپنا مرکزِ عمل چھوڑے گی، لیکن اللہ تعالیٰ سے وفاداری کے عہد کو تازہ کرنے کے لیے۔ وہ گھر سے باہر آئے گی لیکن اسے آباد کرنے کے عزم کو مزید پختہ اور مضبوط کرنے کے ارادے سے۔

حضرت عائشہؓ نے نبی اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا عورتوں پر جہاد فرض ہے؟ آپؐ نے اس سوال کے پیچھے کارفرما جذبات کی رعایت کرتے ہوئے بڑے ہی حسین اور پیارے انداز میں جواب دیا:

نَعَمْ عَلَيْهِنَّ جِهَادٌ لاَ قِتَالَ فِيْهِ اَلْحَجُّ وَالْعُمْرَةُ[2]

ہاں، ان پر جہاد ہے لیکن ایسا جہاد جس میں جنگ نہیں ہوتی اور وہ ہے حج اور عمرہ۔

ازواجِ مطہرات کی طرف سے جہاد میں شرکت کی اجازت طلب کی گئی تو کبھی آپؐ نے جواب دیا: جِهَادُكُنَّ الْحَجُّ (تمھارا جہاد حج ہے) اور کبھی خدا کے گھر تک پہنچنے

---

[1] المنذری، الترغیب والترہیب: ۳/ ۳۴ بحوالہ طبرانی

[2] ابن ماجہ، ابواب المناسک، باب الحج جہاد النساء و رواہ ابن خزیمۃ فی صحیحہ (الترغیب والترہیب: ۲/ ۱۰۵)

کے لیے جو زحمتیں برداشت کی جاتی ہیں، ان کی عظمت و فضیلت کا احساس دلاکر ان کے جذبۂ جہاد کے اطمینان کا سامان کیا۔ چناں چہ جب آپؐ کے سامنے اس قسم کی خواہش کا اظہار کیا گیا تو آپ نے فرمایا: نِعْمَ الْجِهَادُ الْحَجُّ (تمھارے حق میں بہترین جہاد حج ہے)۔

عورت کی اصل پوزیشن کو باقی رکھنے کے لیے معاشی تگ و دو سے بھی اس کو مستثنیٰ رکھا گیا، اس پر کسی اور کا کیا معنی خود اس کا اپنا معاشی بار بھی نہیں ڈالا گیا، تاکہ اسے اپنایا دوسروں کا پیٹ بھرنے کے لیے اپنے دائرہ کار سے باہر نکلنے پر مجبور نہ ہونا پڑے۔

کسی بڑی مصلحت کے تحت اس کو گھر چھوڑنے کی اجازت دی بھی گئی ہے یا کسی عبادت کے اجتماعی طریقہ کو اس کے لیے مفید یا ضروری سمجھا گیا ہے تو اس کے ساتھ ایسی تدابیر بھی اختیار کی گئی ہیں، جو ہر آن اس کے اندر یہ احساس تازہ رکھتی ہیں کہ اس کا حقیقی مقام وہی ہے جہاں سے وہ چلی تھی۔ گھر سے باہر نکلنے کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ وہ حدودِ نسوانیت سے بھی باہر ہوچکی ہے۔

مثلاً عورتوں کو مسجد میں باجماعت نماز پڑھنے کی اجازت حاصل ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ وہ مردوں کے ساتھ مل کر اور ان کی صفوں میں شامل ہوکر نماز ادا نہیں کریں گی، بلکہ ان کی صفیں مردوں کی صفوں سے الگ ہوں گی۔ یہ علیحدگی اور دوری جتنی زیادہ ہو اتنی ہی شریعت میں محبوب و پسندیدہ ہے۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ خَیْرُ صُفُوْفِ الرِّجَالِ اَوَّلُهَا وَ شَرُّهَا اٰخِرُهَا وَ خَیْرُ صُفُوْفِ النِّسَاءِ اٰخِرُهَا وَ شَرُّهَا اَوَّلُهَا[1]

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: مردوں کی بہترین صف اگلی صف ہے اور بدترین صف پچھلی صف، اور عورتوں کی بہترین صف وہ ہے جو سب سے پیچھے ہو اور ان کی بدترین صف وہ ہے جو سب سے آگے ہو۔

مردوں کی آخری اور عورتوں کی پہلی صف کی اس لیے مذمت کی گئی ہے کہ وہ

---

[1] رواہ مسلم (کتاب الصلوٰۃ) و اصحاب السنن الاربعۃ

ایک دوسرے سے قریب ہوتی ہیں۔ اس کے بعد مردوں کی پہلی اور عورتوں کی آخری صف کی تعریف کی گئی کیوں کہ ان کے درمیان فاصلہ زیادہ ہوتا ہے۔ یہ طرزِ عمل اس نظریہ کا لازمی نتیجہ ہے جو اسلام نے عورت کے متعلق اختیار کیا ہے۔ اس سے صاف واضح ہے کہ اسلام نے مرد اور عورت کے دائرہ کار الگ رکھے ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ عورت اپنے دائرے میں رہے۔ کسی دینی و سماجی ضرورت کے تحت اسے اس سے باہر نکلنا پڑے تو اپنی نسوانیت کو باقی رکھے اور اپنے رویہ سے مرد ہونے کا اعلان نہ کرے۔



عورت
علم و عمل کے میدان میں

- معاشرہ ایک وحدت ہے
- عورت کی تعلیم و تربیت
- عورت ـــــ میدان عمل میں

معاشرہ ایک وحدت ہے

جب کوئی فرد معاشرے کے کسی اجتماعی شعبہ یا ادارے سے وابستہ ہوتا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے تمام اداروں سے اپنا ناطہ توڑ لے، بلکہ اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے فکر و عمل کی بیشتر صلاحیتیں اس پر صرف کرے اور اس سے اس کی توجہ ہٹنے نہ پائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ خواہ چند افراد پر مشتمل کوئی خاندان ہو یا کسی دیہات کا پنچایتی نظام، کسی چھوٹی آبادی کی میونسپلٹی ہو یا کسی بڑے شہر کا کارپوریشن، کوئی صوبائی نظامِ حکومت ہو یا مرکزی و بالائی اقتدار یا ان کے علاوہ دیگر صنعتی، تعلیمی اور معاشی ادارے، یہ بظاہر جدا جدا اور ایک دوسرے سے علیحدہ معلوم ہوتے ہیں، لیکن دراصل یہ ایک ہی ہیئتِ اجتماعیہ کے مختلف اجزاء ہیں اور ہیئتِ اجتماعیہ ان سب کی محتاج ہے۔ ان میں کا کوئی بھی ایک ادارہ اس کے تمام معاشرتی اور اجتماعی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا، بلکہ ان کی تکمیل سب ہی اداروں کے تعاون سے ہوتی ہے۔ خاندان فرد کی فکری تربیت کا آغاز کرتا ہے تو مدارس اور یونیورسٹیاں اس کی ترقی میں مدد دیتی ہیں۔ میونسپلٹی اس کی صحت کے تحفظ کا سامان کرتی ہے تو عدالت گاہیں اس کے حقوق و مفادات کی نگہداشت کرتی ہیں۔ اس لیے کبھی وہ علم کی طلب میں درس گاہوں کی جانب رخ کرنے پر مجبور ہوگا، کبھی اس کو ایک تاجر کی حیثیت میں بازار اور منڈی جانا ہوگا، کبھی وہ اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائے گا اور کبھی تلاشِ روزگار میں کھیت اور کارخانہ

کی طرف دوڑے گا۔ غرض، فرد کی تمدنی ضروریات پورے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ اپنی تنگ و دو کسی ایک دائرہ میں محدود نہیں رکھ سکتا۔ کسی کاشت کار کے لیے یہ ناممکن ہے کہ زندگی کی وسعتوں کو اپنے محدود رقبۂ زمین میں سمیٹ لے۔ کوئی طالب علم ایسی کوئی صورت نہیں رکھتا کہ سوسائٹی کے تمام اداروں سے کٹ کر صرف تعلیم کا ہو رہے۔ کسی جج کو اس کا کمرۂ عدالت ساری دنیا سے بے نیاز نہیں کرسکتا۔ لہٰذا معاشرہ کا یہ فرض ہے کہ فرد کی متنوع ضروریات جن اجتماعی تعلقات کا تقاضا کرتی ہیں اس کو ان سے باز نہ رکھے۔

چناں چہ اسلام نے بھی عورت کو خاندان سے متعلق تو ضرور کیا ہے لیکن اس کے فکر و عمل کی دنیا کو اسی ادارے کے اندر محصور نہیں کر دیا ہے۔ اس کو ان حقوق سے محروم نہیں رکھا ہے جو اجتماعی زندگی بسر کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ یہی نہیں بلکہ وہ اس کو اس قابل بھی بناتا ہے کہ معاشرہ میں کامیاب و بامراد زندگی بسر کر سکے۔

فرد کی کامیابی کے شرائط

سوسائٹی میں کسی فرد کے کامیاب رول ادا کرنے کے لیے تین شرطیں ضروری ہیں۔ پہلی شرط یہ ہے کہ وہ صحیح فکر رکھتا ہو تا کہ بھلائی اور برائی اور نفع و نقصان میں بہ آسانی تمیز کر سکے۔ یہ صلاحیت نہ صرف فرد کے ارتقا کے لیے ضروری ہے، بلکہ معاشرہ کی تعمیر و ترقی بھی اسی پر منحصر ہے کیوں کہ اس کے بغیر فرد اور جماعت کے درمیان کامل ہم آہنگی نہیں پیدا ہوسکتی جو ایک کو دوسرے کے لیے کار آمد اور مفید بناتی ہے۔ فرد اگر اجتماعیت کے حقوق و فرائض سے پوری طرح واقف نہ ہو، وہ یہ نہ جانتا ہو کہ اس پر سوسائٹی کے کیا حقوق ہیں اور سوسائٹی کن حقوق کی ادائیگی پر مجبور ہے، اسے یہ نہ معلوم ہو کہ معاشرہ کو بنانے اور سنوارنے والے عوامل کیا ہیں اور کن اسباب کے تحت وہ زوال پذیر ہوتا ہے تو ہر قدم پر اس بات کا خدشہ ہے کہ اس کے مفادات جماعت کے مفادات سے ٹکرا جائیں اور اس کی تگ و دو اس رُخ پر نہ ہو جس رُخ پر معاشرہ بڑھ رہا ہے۔ اس

لیے ریاست کا فرض ہے کہ وہ فرد کو اس قابل بنائے کہ وہ حیاتِ اجتماعی کے مختلف مراحل و حالات میں جو فرض بھی انجام دے رہا ہو درست و نا درست اور صواب و خطا میں حد فاصل کھینچ سکے۔ وہ حاکم ہو تو یہ جانے کہ محکوم کے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جانا چاہیے اور محکوم ہو تو اس بات کا علم رکھتا ہو کہ اطاعت کے اصول و شرائط کیا ہیں؟ اگر وہ قاضی ہو تو قانون و انصاف کے تقاضوں سے پوری طرح باخبر ہو اور اگر اس کو دادخواہ اور طالبِ عدل بننا پڑے تو وہ اس کے حصول کے طریقوں سے ناآشنا نہ ہو۔

اس صلاحیت کے ساتھ فرد کی کامیابی کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ اس کو اپنی صواب دید کے مطابق عمل کے مواقع حاصل ہوں۔ علم وفن، تجارت و زراعت، صنعت و حرفت، غرض جس راہ میں بھی وہ آگے بڑھنا چاہے کوئی چیز اس کے پاؤں کی زنجیر نہ بنے اور اگر اس کے حق پر کسی قسم کی چیرہ دستی ہو تو معاشرہ میں اتنی قوت ہونی چاہیے کہ اسے روک سکے اور اس کے حق کی نگہ داشت کر سکے۔ ورنہ فرد اپنے بھلے اور برے اور نفع و نقصان کو محسوس کرتے ہوئے بھی اسی طرح ناکامی کا شکار رہے گا، جس طرح نادانستہ کسی تباہی سے وہ دو چار ہو جائے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ اگر ایک طرف فرد سے معاشرہ کی وفاداری کا مطالبہ کیا جائے تو دوسری طرف اس کو معاشرہ کی خیر خواہی کے لیے سعی و جہد کا بھی حق دیا جائے۔ اگر معاشرہ کے مفاد کے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی اس کو اجازت نہیں دی جاتی تو اس کے فائدے کے لیے کام کرنے کی اس کو آزادی بھی ملنی چاہیے۔ کیوں کہ جس طرح فرد کی غلط روی سے معاشرہ کو نقصان پہنچتا ہے اسی طرح معاشرہ کی طرف سے غیر ضروری بندشیں بھی اس کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ لہٰذا جب ہم سوسائٹی کو فرد کے کردار و عمل کے جائزہ کا حق دیتے ہیں تو فرد کو بھی سوسائٹی کے احتساب اور اس کی اصلاح کا حق ملنا چاہیے۔

یہ تین شرطیں ایسی ہیں جنھیں دنیا کا ہر جمہوری دستور تسلیم کرتا ہے، کیوں کہ ان

ہی کی بنیاد پر فرد سوسائٹی میں اپنا رول ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ ان تینوں شرطوں کو ہم مختصر الفاظ میں تعلیم و تربیت، مواقع عمل، معاشرہ کی تعمیر و اصلاح کی آزادی سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

آیئے، اب ہم دیکھیں کہ اسلامی معاشرہ عورت کے معاملہ میں ان شرائط کو پورا کرتا ہے یا نہیں اور جس حد تک پورا کرتا ہے اس کے کیا نتائج نکل سکتے ہیں اور ماضی میں کیا نکلے ہیں؟



عورت کی تعلیم و تربیت

یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام کے آنے سے قبل اہل عرب بے قید اور آزاد زندگی گزار رہے تھے۔ زندگی کے بارے میں وہ نہ تو کوئی سنجیدہ اور ٹھوس فکر رکھتے تھے اور نہ اس بحث میں پڑنا ہی چاہتے تھے۔ ان کی ساری جدوجہد اس مادی دنیا اور اس کی آسائشوں کے لیے وقف تھی۔ وہ اس کا تصور بھی نہیں کرتے تھے کہ اس مادی دنیا سے ماورا بھی کچھ حقیقتیں ہیں۔ اسلام نے ان کے سامنے زندگی کا ایک ایسا فلسفہ پیش کیا، جس میں اخلاقی پابندیاں تھیں۔ جائز و ناجائز اور حرام و حلال کے ضابطے تھے، عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ کا تصور تھا۔ خدا اور اس کے رسول کا اقرار اور ان کی فرماں برداری کی تعلیم تھی۔ اس فلسفہ کو آہستہ آہستہ جب وہ قبول کرنے لگے تو اسلام نے اس کی بنیاد پر ایک معاشرہ کی تعمیر شروع کردی اور ابھی یہ معاشرہ تعمیر ہو ہی رہا تھا کہ خدا کا حکم نازل ہوا کہ اگر باہر کی کوئی عورت ہجرت کرکے مدینہ آئے اور اس معاشرہ کا جز بننا چاہے تو اس سے حسب ذیل اصولِ اخلاق اور قوانین کی پابندی کا عہد لیا جائے:

یٰٓاَیُّھَا النَّبِیُّ اِذَا جَآءَکَ الْمُؤْمِنٰتُ	اے نبی! جب مومن عورتیں ان باتوں پر
یُبَایِعْنَکَ عَلٰٓی اَنْ لَّا یُشْرِکْنَ	بیعت کرنے کے لیے تمھارے پاس آئیں کہ
بِاللّٰہِ شَیْئًا وَّلَا یَسْرِقْنَ وَلَا یَزْنِیْنَ	وہ اللہ کے ساتھ نہ توکسی کو شریک ٹھہرائیں گی اور
وَلَا یَقْتُلْنَ اَوْلَادَھُنَّ وَلَا یَاْتِیْنَ	نہ چوری کریں گی اور نہ زنا کا ارتکاب کریں گی

بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○
(الممتحنہ:۱۲)

اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ جانتے بوجھتے کسی پر بہتان باندھیں گی نہ کسی معروف میں تمھاری نافرمانی کریں گی تو تم ان سے بیعت لے لو اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا کرو۔ بلاشبہ اللہ بڑا بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

اس آیت میں دین کے جن اصولوں کی پابندی کا عہد عورتوں سے لیا گیا ہے، ان سے مرد مستثنٰی نہیں ہیں، کیوں کہ ان کا تعلق جتنا خانگی زندگی سے ہے اس سے کہیں زیادہ گھر سے باہر کی زندگی سے ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دین کے اصول و کلیات کے احترام کا مطالبہ مرد اور عورت دونوں ہی سے ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ مرد کی طرح عورت بھی دین کی تعلیمات سے پوری طرح واقف ہو، تاکہ وہ یہ جان سکے کہ زندگی کے مختلف امور و مسائل میں اس کی کیا ہدایات ہیں، اور وہ ان کو کس طرح حل کرتا ہے؟ چناں چہ اسی آیت میں اس سے جن باتوں کا اقرار لیا گیا ہے، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ ”کسی معروف حکم میں رسول کی نافرمانی نہیں کرے گی۔“ یہ بظاہر ایک چھوٹا سا فقرہ ہے لیکن معاشرہ کے اندر عورت کو انتہائی ذمے دار اور جواب دہ بنا دیتا ہے اور مجبور کرتا ہے کہ زندگی کے کسی بھی معاملہ میں قدم اٹھانے سے پہلے رسول اللہ ﷺ کی ہدایت سے واقفیت حاصل کرے اور آپ کی مخالفت سے باز رہے۔ رسولِ اکرمؐ ہی کے دورِ مبارک کا ذکر ہے کہ خواتین کے اندر احکام دین معلوم کرنے کی ایسی تڑپ پیدا ہوگئی تھی کہ وہ شب و روز اس کے لیے بے چین رہتی تھیں اور اس تلاش و جستجو میں بسا اوقات طبعی تکلف اور حجاب بھی رکاوٹ نہیں بنتا تھا۔

انصار کی خواتین کے متعلق حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

نِعْمَ النِّسَاءُ نِسَاءُ الْاَنْصَارِ لَمْ يَكُنْ يَمْنَعُهُنَّ الْحَيَاءُ اَنْ يَّتَفَقَّهْنَ فِي الدِّيْنِ[1]

انصار کی عورتیں بھی بہت خوب تھیں دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے سلسلہ میں حیا اور شرم ان کے لیے رکاوٹ نہیں بنتی تھی۔

---

[1] مسلم، کتاب الحیض

اس دور کی خواتین وقتِ ضرورت اسلام کے احکام جاننے اور ان پر عمل کرنے کی کوشش بھی کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ وہ اسلامی تعلیمات کا گہرائی اور دقتِ نظر سے مطالعہ بھی کرتی تھیں، اس کا اندازہ حضرت عائشہؓ کے ان الفاظ سے کیا جاسکتا ہے۔

كَانَتْ تَنْزِلُ عَلَيْنَا الْآيَةُ فِيْ عَهْدِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَنَحْفَظُ حَلَالَهَا وَ حَرَامَهَا وَ اٰمِرَهَا وَ زَاجِرَهَا وَلَا نَحْفَظُهَا[1]

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں ایک آیت نازل ہوتی تو ہم اس میں بتائے ہوئے حلال وحرام اور امر و نہی کو حفظ کرلیتے گو اس کے الفاظ کو ازبر نہ کریں۔

جمعہ اور عیدین میں خواتین کی شرکت

جمعہ اور عیدین کے خطبوں کا مقصد تذکیر، نصیحت اور لوگوں کو دین کی تعلیمات سے واقف کرانا ہے۔ شریعت نے عورت کے لیے ان میں شرکت کو ضروری نہیں قرار دیا ہے، کیوں کہ اس سے بعض اوقات اس کی خانگی ذمے داری کے ادا کرنے میں رکاوٹ پیش آسکتی تھی۔ یوں بھی عورت کے بار بار باہر نکلنے میں سماج کے لیے نفع سے زیادہ ضرر کا اندیشہ رہتا ہے، اس کے باوجود عام حالات میں شریعت نے عورت کو ایسے مواقع سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دی ہے۔ ام عطیہؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتی ہیں:

لِتَخْرُجِ الْعَوَاتِقُ وَ ذَوَاتُ الْخُدُوْرِ وَ الْحُيَّضُ وَ يَعْتَزِلُ الْحُيَّضُ الْمُصَلّٰى وَ يَشْهَدْنَ الْخَيْرَ وَ دَعْوَةَ الْمُؤْمِنِيْنَ قَالَتْ فَقُلْتُ لَهَا أَاَلْحُيَّضُ قَالَتْ نَعَمْ أَلَيْسَ الْحَائِضُ تَشْهَدُ عَرَفَاتِ وَ تَشْهَد كَذَا وَ تَشْهَدُ كَذَا[2]

بالغ اور پردہ نشین خواتین کو اور ان خواتین کو جو حالتِ ایام میں ہوں، عید گاہ چلنا چاہیے البتہ جن عورتوں کے ایام ہوں وہ نماز کی جگہ سے الگ رہیں گی اور خیر اور مومنوں کی دعاؤں میں شریک ہوں گی (حدیث روایت کرنے والی خاتون کہتی ہیں) میں نے ام عطیہؓ سے کہا کہ حیض والیاں بھی شریک ہوں گی؟ انھوں نے جواب دیا ہاں! کیا وہ عرفات اور دیگر فلاں فلاں موقع پر حاضر نہیں ہوتیں؟

---

[1] العقد الفرید، جلد ۲، ص ۲۳۹
[2] بخاری، کتاب العیدین، باب اذا لم یکن للمرأۃ جلباب

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان علمی و عبادتی مجالس میں خواتین بڑے ہی ذوق وشوق کے ساتھ خاصی تعداد میں شریک ہوتی تھیں۔ خولہ بنت قیس الجہنیہؓ حضور ﷺ کی بلندیِ آواز کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہیں:

كُنْتُ اَسْمَعُ خُطْبَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ يَوْمَ الْجُمُعَةِ وَ اَنَا فِیْ مُؤَخَّرِ النِّسَاءِ[۱]	جمعہ کے دن رسول اللہ ﷺ کا خطبہ اچھی طرح سنتی تھی حالاں کہ میں عورتوں میں سب سے آخر میں ہوتی۔

ان مواقع پر عورتوں کی شرکت کسی میلہ یا تفریحی مجلس میں شرکت جیسی نہیں ہوتی تھی، بلکہ وہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتی تھیں۔

حارثہ بن نعمانؓ کی صاحب زادی فرماتی ہیں:

مَا حَفِظْتُ قٓ اِلَّا مِنْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَخْطُبُ بِهَا كُلَّ جُمُعَةٍ[۲]	میں نے حضور اکرم ﷺ کی زبان سے سن کر ہی سورۂ قٓ یاد کی ہے، جسے آپؐ ہر جمعہ کو (لوگوں کی تذکیر کے لیے) خطبہ میں پڑھتے تھے۔

خود حضور اکرم ﷺ کو عورتوں کی تعلیم و تذکیر کا اس درجہ خیال رہتا تھا کہ اگر کسی وقت آپ محسوس فرماتے کہ آپ کے ارشادات وہ سن نہیں سکی ہیں، تو دوبارہ ان کے قریب پہنچ کر وعظ و تلقین فرماتے۔ ایک عید کے موقعے کا حضرت عبد اللہ بن عباسؓ ذکر فرماتے ہیں:

فَظَنَّ اَنَّهٗ لَمْ يُسْمِعِ النِّسَاءَ فَوَعَظَهُنَّ وَ اَمَرَهُنَّ بِالصَّدَقَةِ[۳]	آپ کو خیال ہوا کہ آپ عورتوں کو اپنی بات نہیں سنا سکے ہیں تو آپ نے (الگ سے) ان کو نصیحت کی اور صدقہ و خیرات کا حکم دیا۔

اس سلسلے میں ابن جریجؒ نے عطاء تابعی سے دریافت کیا:

---

[۱] طبقات ابن سعد: ۸/ ۳۰۱

[۲] مسلم، کتاب الجمعۃ، ابوداؤد۔ کتاب الصلوٰۃ، باب الرجل یخطب علیٰ قوس

[۳] بخاری، کتاب العلم، باب عظۃ الامام النساء و تعلیمھن

أَ تَرىٰ حَقًّا عَلَى الْإِمَامِ ذٰلِکَ وَ يُذَكِّرُهُنَّ

کیا آپ کے خیال میں امام پر عورتوں کی تذکیر ضروری ہے؟

انھوں نے جواب دیا:

اِنَّهٗ لَحَقٌّ عَلَيْهِمْ وَمَا لَهُمْ لاَ يَفْعَلُوْنَهٗ[1]

بلاشبہ یہ ان پر لازم ہے، آخر کیا وجہ ہے کہ وہ اس کا التزام نہ کریں۔

اسلام نے عورت کے اندر علم کی جو پیاس پیدا کردی تھی اس کی تسکین ان چند عام ذرائع سے نہیں ہو رہی تھی اس لیے کبھی کبھی حضور ﷺ ان کو استفادہ کے لیے مخصوص مواقع بھی عطا فرماتے تھے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے:

قَالَ النِّسَاءُ لِلنَّبِيِّ غَلَبَنَا عَلَيْکَ الرِّجَالُ فَاجْعَلْ لَنَا يَوْمًا مِنْ نَّفْسِکَ فَوَعَدَهُنَّ يَوْمًا لَقِيَهُنَّ فِيْهِ فَوَعَظَهُنَّ وَ اَمَرَهُنَّ[2]

عورتوں نے نبیؐ سے کہا: آپؐ کی مجلس میں ہمیشہ مردوں کا ہجوم رہتا ہے (اس وجہ سے ہم استفادہ نہیں کر پاتیں) لہٰذا آپ ہمارے لیے الگ سے ایک دن مقرر فرمائیں۔ چناں چہ (ایک دن متعین کرکے) آپ ان کے پاس تشریف لے گئے اور وعظ و نصیحت فرمائی اور انھیں نیک کاموں کا حکم دیا۔

اسی نوعیت کا ایک واقعہ حضرت حذیفہؓ کی بہن سے منقول ہے:

قَالَتْ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ فَقَالَ يَا مَعْشَرَ النِّسَاءِ اَمَا لَكُنَّ فِي الْفِضَّةِ مَا تَحَلَّيْنَ اَمَا اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْكُنَّ اِمْرَأَةٌ تَحَلّٰى ذَهَباً تُظْهِرُهٗ اِلَّا عُذِّبَتْ بِهٖ[3]

کہتی ہیں، حضورؐ نے ہم لوگوں کو خطاب کرکے خطبہ دیتے ہوئے فرمایا۔ اے گروہِ خواتین تمھیں چاندی کے زیورات میں رغبت کیوں نہیں ہے کہ اس کو استعمال نہیں کرتی ہو۔ سن لو تم میں سے جو عورت بھی سونے کے زیورات پہن کر نمود و نمائش کرتی پھرے گی اس کو اس سے عذاب دیا جائے گا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حضور اکرم ﷺ تعلیم و تذکیر کی اس خدمت پر اپنے کسی

---

[1] بخاری، کتاب العیدین، باب موعظۃ الامام النساء یوم العید

[2] بخاری، کتاب العلم، باب ھل یجعل للنساء یوم علیٰ حدۃ

[3] مسند احمد جلد: ۷/ ۴۹۹، حدیث نمبر ۲۶۴۷۱

نمایندے کو مامور فرماتے:

عَنْ اُمِّ عَطِیَّۃَ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ لَمَّا قَدِمَ الْمَدِیْنَۃَ جَمَعَ نِسَاءَ الْاَنْصَارِ فِیْ بَیْتٍ فَاَرْسَلَ اِلَیْنَا عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ فَقَامَ عَلَی الْبَابِ فَسَلَّمَ عَلَیْنَا فَرَدَدْنَا عَلَیْہِ السَّلَامَ ثُمَّ قَالَ اَنَا رَسُوْلُ رَسُوْلِ اللّٰہِ اِلَیْکُنَّ وَ اَمَرَنَا بِالْعِیْدَیْنَ اَنْ نُّخْرِجَ فِیْھِمَا الْحُیَّضَ وَ الْعُتَّقَ وَلاَ جُمُعَۃَ عَلَیْنَا وَ نَھَانَا عَنِ اتِّبَاعِ الْجَنَائِزِ [1]

ام عطیہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب مدینہ تشریف لائے تو آپؐ نے (ہم) انصار کی عورتوں کو ایک گھر میں جمع کیا اور ہمارے پاس عمر بن خطابؓ کو نصیحت کے لیے بھیجا۔ انھوں نے دروازے کے پاس کھڑے ہوکر سلام کیا۔ ہم نے سلام کا جواب دیا۔ اس کے بعد انھوں نے کہا کہ میں رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے تمھارے پاس آیا ہوں۔ چناں چہ حضرت عمرؓ کے واسطے سے یہ معلوم ہوا کہ حضورؐ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ہم عیدین میں نوجوان اور حیض والی خواتین کو بھی عید گاہ لے چلیں اور یہ کہ ہم پر جمعہ فرض نہیں ہے اور یہ کہ آپؐ نے ہمیں جنازوں کے پیچھے چلنے سے منع کیا ہے۔

ماں باپ اور خاوند کو ہدایت

عورت کی حقیقی تعلیم گاہ اور تربیت کا مقام اس کا اپنا گھر ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کی ازواج مطہرات کے مکانات ان کے لیے کتاب و سنت کی تعلیم کے مراکز تھے، جہاں شب و روز اللہ کی آیات اور ان کی حکمتوں اور باریکیوں کا چرچا رہتا تھا۔ ایک خاص مناسبت سے ازواجِ مطہرات کو اس کی یاد دہانی کرائی گئی ہے۔ ارشاد ہے:

وَ اذْکُرْنَ مَا یُتْلٰی فِیْ بُیُوْتِکُنَّ مِنْ اٰیٰتِ اللّٰہِ وَالْحِکْمَۃِ ط اِنَّ اللّٰہَ کَانَ لَطِیْفًا خَبِیْرًا ○ (الاحزاب: ۳۴)

اور تمھارے گھروں میں اللہ کی آیات کی جو تلاوت ہوتی اور حکمت کا جو درس ہوتا ہے اس کا ذکر کرتی رہو یقیناً اللہ تعالیٰ لطف کرنے والا خبردار ہے۔

اس میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اہل ایمان کے گھروں کو بھی مراکزِ علم ہونا چاہیے، جہاں بیوی بچے اور اہل خاندان علم دین حاصل کرسکیں اور اس کی باریکیوں سے

[1] ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب خروج النساء فی العید۔ نسائی، کتاب الحیض والاستحاضۃ، باب شھود الحیض العیدین و دعوۃ المسلمین۔

واقف ہوسکیں۔ چناں چہ شریعت نے والدین اور شوہر کو اس طرف متوجہ کیا کہ وہ بیوی بچوں کو حق و باطل میں تمیز کرنا سکھائیں اور انھیں غلط روی سے بچائیں۔

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا (التحریم:٦)	اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے 'اہل' کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔

اس کا ذریعہ سوائے تعلیم و تربیت کے اور کوئی نہیں ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ لحاظ ہے کہ 'اہل' سے مراد اصلاً بیوی ہی ہوتی ہے۔

مالک بن حویرثؓ کہتے ہیں کہ ہم چند نوجوان حضورؐ کی خدمت میں دین سے واقفیت حاصل کرنے کی غرض سے بیس دن رہے۔ جب آپؐ نے محسوس کیا کہ ہمیں گھر جانے کی جلدی ہے، تو ارشاد فرمایا:

اِرْجِعُوْا اِلٰی اَهْلِیْكُمْ فَاَقِیْمُوْا فِیْهِمْ وَ عَلِّمُوْهُمْ وَ مُرُوْهُمْ[1]	جاؤ اپنے بیوی بچوں کی طرف، ان میں رہو اور ان کو دین کی باتیں سکھاؤ اور ان پر عمل کا حکم دو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کوفہ والوں کو لکھتے ہیں:

عَلِّمُوْا نِسَاءَكُمْ سُوْرَةَ النُّوْرِ[2]	اپنی بیویوں کو سورۂ نور کی تعلیم دو۔

حضور اکرم ﷺ نے عورت کی تعلیم، اس کی بہتر تربیت اور اسے فکری و عملی پہلو سے آگے بڑھانے کی مختلف پہلوؤں سے ترغیب دی اور اس سلسلے میں بے پایاں ثواب کی بشارت سنائی ہے۔ آپؐ کا فرمان ہے:

مَنْ عَالَ ثَلَاثَ بَنَاتٍ فَاَدَّبَهُنَّ وَ زَوَّجَهُنَّ وَ اَحْسَنَ اِلَیْهِنَّ فَلَهُ الْجَنَّةُ[3]	جس نے تین لڑکیوں کی پرورش کی، ان کو ادب اور سلیقہ سکھایا، ان کی شادی کی اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو اس کے لیے جنت ہے۔

اس کا تعلق والدین سے ہے۔ شوہر کے متعلق آپؐ کے اس ارشاد سے راہنمائی ملتی ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب الاذان، باب الاذان للمسافر۔ الخ
[2] تفسیر قرطبی، جلد ٦ جزء ١٢، ص ١٠٦
[3] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فضل من عال یتامیٰ

ثَلاَ ثَةٌ لَهُمْ اَجْرَانِ رَجُلٌ كَانَتْ عِنْدَهٗ اَمَةٌ فَاَدَّبَهَا فَاَحْسَنَ تَادِيْبَهَا وَعَلَّمَهَا فَاَحْسَنَ تَعْلِيْمَهَا ثُمَّ اَعْتَقَهَا فَتَزَوَّجَهَا[1]

تین قسم کے آدمی ہیں، جن کو دو گنا اجر ملے گا، ان میں سے ایک وہ شخص بھی ہے، جس کے پاس کوئی باندی ہو اور وہ اس کو ادب سکھائے اور اچھا ادب سکھائے۔ تعلیم دے اور بہتر تعلیم دے، پھر اس کو آزاد کر کے اس سے شادی کرلے۔

اس حدیث کی رو سے ایک ثواب کا مستحق وہ شخص بھی ہوگا، جو آزاد بیوی کی تعلیم و تربیت میں کوشاں ہے، کیوں کہ وہ حدیث کے ایک پہلو کی تکمیل کر رہا ہے۔ اس میں بہرحال بیوی کی تعلیم و تربیت کی بھی ترغیب موجود ہے۔

ایک مرتبہ نبی ﷺ نے ایک عورت کا نکاح ایک ایسے شخص سے کر دیا جو مفلس و نادار تھا، لیکن قرآن کی چند سورتوں کا عالم یا حافظ تھا۔ اس سے کہا کہ مہر کے عوض اپنی بیوی کو یہی چند سورتیں سکھا دو[2] گویا آپؐ نے عورت کو یہ حق دیا کہ دولتِ علم کے عوض مال کی شکل میں حاصل ہونے والے سرمایہ سے دست بردار ہوجائے۔

بعض اوقات رسول اللہ ﷺ نے مردوں کو قرآن مجید کے خاص خاص حصوں کی طرف متوجہ کیا کہ وہ خود بھی ان کا علم حاصل کریں اور اپنی بیویوں کو بھی ان کی تعلیم دیں۔ مثلاً سورۂ بقرہ کی آخری دو آیتوں میں ایمانیات اور اصولِ دین کا بیان ہے، ان کے متعلق آپؐ نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ خَتَمَ سُوْرَةَ الْبَقَرَةِ بِاٰيَتَيْنِ اُعْطِيْتُهُمَا مِنْ كَنْزِهِ الَّذِیْ تَحْتَ الْعَرْشِ فَتَعَلَّمُوْهُنَّ وَ عَلِّمُوْهُنَّ نِسَاءَكُمْ[3]

بلاشبہ اللہ نے سورۂ بقرہ کو ایسی دو آیتوں پر ختم کیا ہے، جو مجھ کو اس مخصوص خزانہ سے دی گئی ہیں جو عرش کے نیچے ہے، پس تم خود بھی ان کو سیکھو اور اپنی بیویوں کو بھی سکھاؤ۔

حضور اکرم ﷺ اس کی کوشش فرماتے کہ خواتین دین کی بنیادی تعلیمات سے باخبر ہوں اور ان پر عمل کریں۔ اس کا اندازہ ایک روایت سے ہوتا ہے۔ آپؐ کی ایک

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب تعلیم الرجل امتہ و اہلہ [2] بخاری، کتاب النکاح، باب تزویج المعسر۔ مسلم، کتاب النکاح [3] دارمی، کتاب فضائل القرآن، باب فضل اول سورۃ البقرۃ و آیۃ الکرسی

صاحب زادی فرماتی ہیں:

اِنَّ النَّبِیَّ کَانَ یُعَلِّمُھَا فَیَقُوْلُ قُوْلِیْ حِیْنَ تُصْبِحِیْنَ سُبْحَانَ اللّٰہِ وَ بِحَمْدِہٖ لاَ قُوَّۃَ اِلّاَ بِاللّٰہِ مَاشَاءَ اللّٰہُ کَانَ وَمَا لَمْ یَشَأْ لَمْ یَکُنْ اِعْلَمْ اَنَّ اللّٰہَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ وَ اَنَّ اللّٰہَ قَدْ اَحَاطَ بِکُلِّ شَیْءٍ عِلْمًا[1]

نبی ﷺ ان کو تعلیم دیتے تھے، فرماتے: جب تم صبح کرو، تو یہ کہو: پاکی ہے اللہ کی اور اس کی تعریف۔ (بھلائی کی) قوت اسی کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ اللہ جو چاہتا ہے ہوتا ہے اور جو نہیں چاہتا نہیں ہوتا۔ یہ بات تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور اللہ کے علم نے ہر چیز کا احاطہ کر رکھا ہے۔

اس طرح عورت کی تعلیم کے سلسلے میں جو انفرادی اور اجتماعی کوششیں ہوسکتی تھیں وہ سب اختیار کی گئیں۔

کتابت کی تعلیم

اسلام نے عورت کی تعلیم کی جو ترغیب دی ہے اس کا مقصد صرف یہ نہیں ہے کہ وہ زبانی طور پر دین کی تعلیمات سے واقف ہوجائے، بلکہ اس میں کتابی علم بھی شامل ہے۔ کتابی علم سے مراد پڑھنا اور لکھنا دونوں ہی ہے۔ اس کے بغیر اس کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن تعلیم کے اس تصور کے خلاف حضرت عائشہؓ سے ایک حدیث روایت کی جاتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لاَ تُسْکِنُوْھُنَّ الغُرَفَ وَلاَ تُعَلِّمُوْھُنَّ الْکِتَابَۃَ وَ عَلِّمُوْھُنَّ الْمِغْزَلُ وَ سُوْرَۃَ النُّوْرِ

عورتوں کو بالا خانوں میں نہ رکھو، ان کو کتابت کی تعلیم نہ دو، انہیں سوت کاتنا اور بننا سکھاؤ اور سورۂ نور کی تعلیم دو۔[2]

اس حدیث کی بنیاد پر متقدمین میں بعض علماء کی یہ رائے رہی ہے کہ عورت کی اتنی تعلیم ہونی چاہیے کہ وہ کتاب پڑھ سکے۔ اسے تحریر و کتابت سکھانا صحیح نہیں ہے۔ بعد کے دور میں بھی اس خیال کے حاملین رہے ہیں۔ لیکن حسب ذیل وجوہ سے یہ روایت

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب مایقول اذا اصبح [2] قال الالبانی اخرجہ ابن حبان والخطیب البیہقی، سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ و الموضوعۃ: ۵/ ۳۰

اس قابل نہیں ہے کہ اس سے کوئی استدلال کیا جائے۔

۱- اس حدیث میں کئی ایسی باتیں آئی ہیں جو اسلام کے مزاج اور اس کی عمومی تعلیمات کے خلاف ہیں۔

۲- کوئی شخص جب تک پڑھنے اور لکھنے پر قادر نہ ہو اسے تعلیم یافتہ یا 'پڑھا لکھا' نہیں کہا جاتا۔ اسلام کا منشا بہ ظاہر یہ ہے کہ عورت تعلیم سے آراستہ ہو۔ اس کے لیے صرف پڑھنے کی صلاحیت کافی نہیں ہے۔ اسے لکھنے اور تحریر کے ذریعے اپنا ما فی الضمیر ادا کرنے کے قابل ہونا چاہیے۔

۳- اس روایت کے غلط اور نا قابل قبول ہونے کی ایک دلیل یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کا عمل اس کے خلاف تھا۔ رسول اللہؐ کی رحلت کے بعد ان کے نام مدینہ سے باہر کے علاقوں سے جو خطوط آتے تھے، خود ان ہی کی ہدایت پر، عائشہ بنت طلحہؓ ان کا جواب دیا کرتی تھیں۔

۴- یہ روایت سند کے لحاظ سے بھی انتہائی ضعیف ہے۔ اسے ابن حبان، حاکم اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔ اس کے راویوں میں محمد بن ابراہیم شامی ہے، جسے محدثین نے کذّاب، منکر الحدیث اور حدیث گھڑنے والوں میں شمار کیا ہے۔

اس مضمون کی ایک روایت حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے بھی آئی ہے۔ اس کا ایک راوی جعفر بن نصر 'متّہم بالکذب' ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ثقہ راویوں کا نام لے کر غلط اور باطل روایات نقل کرتا تھا۔

سب سے بڑی بات یہ کہ یہ روایت ایک ایسی حدیث کے خلاف ہے جو صحیح سند سے ثابت ہے۔ حضرت شفاء بنت عبد اللہؓ کہتی ہیں کہ میں حضرت حفصہؓ کے پاس تھی کہ رسول اللہ ﷺ تشریف لائے۔ آپ نے فرمایا:

الاَ تعلّمین هٰذه رقية النملة كما علمتها الكتابة[1]	کیا تم ان کو مرض 'نملہ' کی دعا نہیں سکھاؤ گی جس طرح تم نے انہیں کتابت سکھائی ہے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطب، باب فی الرقی۔ مسند احمد: ۷/۵۱۶۔ حدیث نمبر ۲۶۵۵۵۔ حدیث شفاء بنت عبد اللہ۔ مرض 'نملہ' میں آدمی کے بازو پر دانے نکل آتے ہیں جو بہت تکلیف دہ ہوتے ہیں اور مریض کو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چیونٹیاں مسلسل حرکت کر رہی ہوں۔

یہ مسند احمد اور ابوداؤد کی روایت ہے اور صحیح ہے۔ یہ حدیث اس سے قوی تر سند سے مستدرک حاکم میں موجود ہے[۱]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شفاء لکھنا جانتی تھیں۔ حضرت حفصہؓ کو انہوں نے اس کی تعلیم دی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی تصویب و تائید فرمائی۔ اگر یہ عمل غلط ہوتا تو حضرت شفاء کو اس کی تعلیم سے اور حضرت حفصہؓ کو اس کے سیکھنے سے منع فرماتے۔

علامہ خطابی کہتے ہیں کہ یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ خواتین کے لیے کتابت کی تعلیم ناپسندیدہ نہیں ہے۔

حافظ ابن قیم فرماتے ہیں کہ اس سے عورتوں کے لیے کتابت کی تعلیم کا جواز نکلتا ہے۔

علامہ ابن عبد السلام محمد ابن تیمیہؒ (صاحب منتقیٰ الاخبار) کے نزدیک اس حدیث سے عورتوں کے لیے کتابت کی تعلیم کا جواز نکلتا ہے[۲]

۱۔ البانی، سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، المجلد الاول، ص ۳۴۰، نمبر ۱۷۸

۲۔ اس موضوع پر مولانا شمس الحق عظیم آبادی (صاحب عون المعبود) کا رسالہ 'عقود الجمان فی جواز تعلیم الکتابۃ للنسوان' کے نام سے موجود ہے۔ اس میں دونوں طرح کی احادیث پر محدثانہ انداز میں گفتگو کی گئی ہے اور اہل علم کا نقطۂ نظر بیان ہوا ہے۔ رسالہ فارسی میں ہے۔ یہی رسالہ اس وقت پیش نظر ہے اور بیشتر حوالوں کے لیے اسی پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اس کا عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔
بعض حضرات نے کہا ہے کہ حدیث میں ان خواتین کو کتابت کی تعلیم دینے سے منع کیا گیا ہے جن کے لیے وہ فساد اور بگاڑ کا سبب بن جائے۔

علامہ البانی نے اس پر سخت تنقید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک موضوع حدیث جس کی ہر سند انتہائی کمزور ہے، اس کی بنیاد پر اس طرح کی بات کرنا صحیح نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ کتابت سیکھنے، بلکہ مطلق علم حاصل کرنے سے آدمی فتنہ و فساد میں مبتلا ہوسکتا ہے۔ اس کا تعلق صرف عورتوں سے نہیں، کتنے ہی مرد ہیں جن کی تحریریں ان کے دین و اخلاق کے لیے نقصان دہ ہیں، اس وجہ سے کیا حصول علم ہی سے سب کو منع کر دیا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ پڑھنا لکھنا اللہ کی ایک نعمت ہے اس سے دونوں ہی کو فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔ ملاحظہ ہو سلسلۃ الاحادیث الضعیفۃ والموضوعۃ، ۵/ ۳۰، حدیث نمبر ۲۰۱۷۔ نیز سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، المجلد الاول، الجزء الثانی، ص ۳۴۶، ۳۴۷

عورت کی تعلیم کی قانونی حیثیت

یہ ارشادات محض ترغیبی اور اخلاقی نوعیت نہیں رکھتے ہیں، بلکہ ان کے پیچھے ضابطہ اور قانون کی زبان بول رہی ہے۔ آٹھویں صدی کے مشہور مالکی عالم، علامہ ابن الحاجؒ لکھتے ہیں:

فَلَوْ طَلَبَتِ الْمَرْأَةُ حَقَّهَا فِیْ اَمْرِ دِیْنِهَا مِنْ زَوْجِهَا رَفَعَتْهُ اِلَی الْحَاکِمِ وَ طَالَبَتْهُ بِالتَّعْلِیْمِ لِاَمْرِ دِیْنِهَا لِاَنْ ذٰلِکَ لَهَا اِمَّا بِنَفْسِهٖ اَوْ بِوَاسِطَةِ اِذْنِهٖ لَهَا فِی الْخُرُوْجِ اِلٰی ذٰلِکَ لَوَجَبَ عَلَی الْحَاکِمِ جَبْرَهٗ عَلٰی ذٰلِکَ کَمَا یُجْبِرُهٗ عَلٰی حُقُوْقِهَا الدُّنْیَوِیَّةِ اِذْ اَنَّ حُقُوْقَ الدِّیْنِ آکَدُ وَ اَوْلٰی۔[1]

اگر عورت دین کے معاملہ میں اپنا حق شوہر سے طلب کرے اور حاکم کے پاس اس کا مرافعہ کردے اور اپنی دینی تعلیم کا اس سے تقاضا کرے، کیوں کہ اس کا یہ حق ہے کہ یا تو شوہر خود ہی اسے تعلیم دے یا اس کو گھر سے باہر جاکر تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے، تو حاکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ شوہر کو اس مطالبہ کی تکمیل پر مجبور کرے، جس طرح وہ دنیوی حقوق کے سلسلے میں کرتا ہے، کیوں کہ دینی حقوق زیادہ موکد اور زیادہ اہم ہیں۔

امام فخر الدین حسن بن منصور حنفی المتوفی ۲۹۵ھ نے اپنے مشہور فتاویٰ میں کسی قدر تفصیل سے بحث کی ہے کہ عورت پر دین کا جاننا کب فرض ہوتا ہے اور کب سنت و استحباب کے درجہ میں رہتا ہے اور اس معاملہ میں وہ کس حد تک شوہر کے حکم کی پابند ہے اور کہاں اس کو شوہر کی مخالفت کا حق ہے؟ فرماتے ہیں:

وَ اِذَا اَرَادَتِ الْمَرْأَةُ اَنْ تَخْرُجَ اِلٰی مَجْلِسِ الْعِلْمِ بِغَیْرِ اِذْنِ الزَّوْجِ لَمْ یَکُنْ لَهَا ذٰلِکَ فَاِنْ وَقَعَتْ لَهَا نَازِلَةٌ فَسَأَلَتْ زَوْجَهَا وَ هُوَ عَالِمٌ فَاَخْبَرَهَا بِذٰلِکَ لَیْسَ لَهَا

اگر عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر کسی علمی مجلس میں شریک ہونا چاہے تو اس کو اس کا حق نہیں ہے لیکن جب کوئی مسئلہ اس پر آن پڑے تو وہ اپنے شوہر سے دریافت کرے گی۔ اب اگر شوہر عالم ہو اور وہ خود

[1] المدخل لابن الحاج، جلد ۱، صفحہ ۲۷۷

اَنْ تَخْرُجَ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ وَ اِنْ كَانَ الزَّوْجُ جَاهِلاً وَ سَأَلَ عَالِمًا عَنْ ذٰلِكَ فَكَذٰلِكَ وَ اِنِ امْتَنَعَ الزَّوْجُ عَنِ السُّوَالِ كَانَ لَهَا اَنْ تَخْرُجَ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ لِاَنَّ طَلَبَ الْعِلْمِ فِيْمَا يَحْتَاجُ اِلَيْهِ فَرْضٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٍ فَيُقَدَّمُ عَلٰى حَقِّ الزَّوْجِ وَ اِنْ لَّمْ يَقَعْ لَهَا نَازِلَةٌ وَ اَرَادَتْ اَنْ تَخْرُجَ اِلٰى مَجْلِسِ الْعِلْمِ لِتَتَعَلَّمَ مَسَائِلَ الصَّلٰوةِ وَالْوَضُوْءِ فَاِنْ كَانَ الزَّوْجُ يَحْفَظُ تِلْكَ الْمَسائل وَ يَذْكُر لهَا لَيسَ لَهَا اَنْ تَخْرُجَ بِغَيْرِ اِذْنِهٖ فَاِنْ كَانَ الزَّوْجُ لاَ يَحْفَظُ تِلْكَ الْمَسَائِلَ فَالْاَوْلٰى لَهٗ اَنْ يَّأْذَنَ لَهَا بِالْخُرُوْجِ فَاِنْ لَّمْ يَاْذَنْ فَلاَ شَيْءَ عَلَيْهِ۔[1]

ہی اسے مسئلہ بتا دے یا جاہل ہو اور دوسروں سے تحقیق کر کے اس کو اطلاع دے دے تو اس کو شوہر کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے، لیکن اگر شوہر تحقیق کر کے اس کو نہ بتائے تو وہ بلا اجازت بھی کسی علمی مجلس میں جاکر دریافت کرسکتی ہے، کیوں کہ طلب علم مسلمان مرد اور عورت دونوں پر فرض ہو جاتا ہے جب کہ وہ اس کے محتاج ہوں، اس لیے ایسی حالت میں طلب علم کو شوہر کے حق پر مقدم رکھا جائے گا۔ اگر عورت کو کوئی متعین مسئلہ تو درپیش نہ ہو لیکن وہ نماز اور وضو (وغیرہ) کے مسائل سیکھنے کے لیے کسی علمی مجلس میں شریک ہونا چاہے اگر شوہر ان مسائل کو جانتا ہو اور وہ اسے سکھا بھی رہا ہو تو اسے گھر سے نہیں نکلنا چاہیے جب تک شوہر اس کو اجازت نہ دے۔ اگر خود شوہر کو ان مسائل کا علم نہیں ہے تو بہتر یہ ہے کہ وہ اس کو علمی مجلسوں میں شرکت کی اجازت دے (اور کوئی مصلحت مانع ہو تو شوہر کو اس کا بھی حق ہے کہ) وہ اس کو باہر جانے کی اجازت نہ دے اور اس سے شوہر پر کوئی الزام نہیں آئے گا۔

تعلیمی سہولتیں

اسلام چاہتا ہے کہ عورت کو حصولِ علم اور اس سے استفادہ و افادہ میں ممکنہ معاشرتی سہولتیں حاصل ہوں، تاکہ اس کے فکری ارتقا میں ماحول کوئی رکاوٹ نہ بننے پائے۔

---

[1] فتاویٰ قاضی خاں المطبوع علی فتاویٰ عالمگیریہ: ۱/ ۴۴۳۔

یہ حدیث گزر چکی ہے کہ جو شخص اپنی باندی کو تعلیم و تربیت دے گا اور پھر اس کو آزاد کر کے شادی کر لے گا تو وہ دو اجر کا مستحق ہے۔ اس میں بہ ظاہر ایک اجر باندی کی تعلیم و تربیت کا ہے، دوسرا اجر اسے بندِ غلامی سے آزاد کرنے اور اسے اپنے عقد میں لانے کا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کا آزاد ہونا اسلام کو مطلوب ہے، تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کو بہتر طریقہ سے پروان چڑھا سکے۔

فکری تربیت

آدمی کے ذہنی ارتقاء میں ماحول کی موافقت اور تعلیمی سہولتوں سے کہیں زیادہ خود اس کی اپنی کوششوں کا دخل ہوتا ہے کہ وہ کس حد تک اپنی فکری صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے، اور اپنی معلومات سے نئے نئے نتائج اخذ کرنے اور نئی نئی حقیقتیں دریافت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ شریعت نے جہاں عورت کے فکری معیار کو بلند کرنے کے لیے خارج میں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی ہیں وہاں اس کے ذہن و فکر کی اندرونی صلاحیتوں کو بھی اُبھارنے کی سعی کی ہے، تاکہ قدرت نے خود اس کے اندر فکر و نظر کی جو مخفی قوتیں رکھی ہیں، ان سے وہ فائدہ اٹھانا سیکھے۔

قرآن مجید ازواجِ مطہراتؓ کو بعض معاشرتی احکام دینے کے بعد کہتا ہے:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ (الاحزاب:۳۴)

اور یاد کرو اللہ کی ان آیات کو جن کی تلاوت تمہارے گھروں میں ہوتی ہے اور حکمت کو۔

یعنی ذرا سوچو تو سہی کہ جس علم و حکمت کے شب و روز تمہارے گھروں میں چرچے ہوتے ہیں اس کا کیا تقاضا ہے؟ خدا پر ایمان اور محاسبۂ آخرت کا یقین کس طرزِ زندگی کا مطالبہ کرتا ہے؟

احادیث میں اس قسم کی کوششیں بہت ہی واضح انداز میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ہم دو واقعات درج کرتے ہیں:

ایک عورت نے حضور اکرم ﷺ سے دریافت کیا کہ میری ماں نے حج کرنے کا فیصلہ کیا تھا، لیکن موت نے اس کی مہلت نہ دی، کیا میں اس کی جانب سے حج کرسکتی ہوں؟ آپؐ نے جواب دیا:

حُجِّیْ عَنْهَا اَرَاَیْتِ لَوْ کَانَ عَلٰی اُمِّکِ دَیْنٌ اَکُنْتِ قَاضِیَةً؟ اِقْضُوْا فَا للّٰهُ اَحَقُّ بِالْوَفَاءِ[1]

ہاں! اس کی جانب سے حج کرو، غور کرو اگر تمہاری ماں پر قرض ہوتا تو کیا تم اس کو ادا نہ کرتیں۔ پس اللہ کے جو احکام ادا ہونے سے رہ گئے ہیں ان کو ادا کرو کیوں کہ اللہ تعالیٰ بندوں سے کہیں زیادہ اس کا مستحق ہے کہ اس کا قرض پورا کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس خاتون کے سوال کا قانونی جواب ہی نہیں دیا، بلکہ یہ بھی بتایا کہ احکامِ شریعت معلوم کرنے کا ایک ذریعہ قیاس بھی ہے اور وقتِ ضرورت اس سے کام لینا چاہیے۔

حضرت انسؓ کی والدہ اُمِّ سلیمؓ نے دریافت کیا: اگر عورت خواب میں جنسی لذت محسوس کرے تو کیا اس پر غسل واجب ہو جاتا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: ہاں! بشرطیکہ اس کو احتلام ہو۔ اس پر حضرت ام سلمہؓ نے پوچھا: کیا عورت کو بھی احتلام ہوتا ہے؟ (یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ عورت کو اس کی نوبت بہت کم آتی ہے)۔ آپؐ نے فرمایا:

نَعَمْ فَبِمَ یُشْبِهُهَا وَلَدُهَا[2]

ہاں! پھر کیسے بچہ اس سے مشابہ ہوتا ہے؟

غور کیجیے، اس ایک جملہ کے ذریعے رسول اللہ ﷺ نے حضرت ام سلمہؓ کے ذہن کو کتنے طبعی، نفسیاتی اور طبی مسائل کی طرف موڑ دیا۔

---

[1] بخاری، ابواب العمرۃ، باب الحج والنذر عن المیت الخ

[2] بخاری، کتاب العلم، باب الحیاء فی العلم۔ مسلم، کتاب الحیض، باب وجوب الغسل علی المرأۃ بخروج المنی منها

دورِ صحابہ

حضور اکرم ﷺ کے بعد صحابہ کرامؓ نے انفرادی طور پر ان خواتین کی فکری و عملی اصلاح و تربیت کے لیے کیا کچھ کیا جن کی ذمہ داری شریعت کی طرف سے ان پر ڈالی گئی تھی اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ذیل کے واقعہ سے کیا جاسکتا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ایک مرتبہ کہا کہ جو عورتیں مصنوعی بال گوندھتی ہیں، پچھنا کھدواتی ہیں اور دانتوں کو گھس کر خوب صورت بناتی ہیں، ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ یہ سن کر ایک خاتون نے کہا کہ یہ سب کچھ آپ کی بیوی بھی تو کرتی ہیں۔ عبد اللہ بن مسعودؓ نے فرمایا جاؤ پہلے دیکھ آؤ اور پھر بتاؤ۔ چناں چہ وہ عورت آپ کے گھر گئی، لیکن اس کا خیال غلط نکلا۔ حضرت ابن مسعودؓ نے کہا: اگر میری بیوی ان خلافِ شرع اعمال کا ارتکاب کرتی تو کبھی میرے عقد میں نہیں رہ سکتی تھی[1]

اسی طرح صحابۂ کرام عمومی انداز میں اصلاحِ معاشرہ کی جدوجہد کرتے تھے۔ اس میں ان کے پیشِ نظر مردوں کے ساتھ عورتیں بھی ہوتی تھیں۔

عائدہ نامی ایک خاتون عبد اللہ بن مسعودؓ ہی کی ایک تقریر کا ذکر کرتی ہیں۔

رَأَیْتُ ابْنَ مَسْعُوْدٍ یُوْصِی الرِّجَالَ وَالنِّسَاءَ وَ یَقُوْلُ مَنْ اَدْرَکَ مِنْکُمْ مِنْ اِمْرَأَۃٍ اَوْ رَجُلٍ فَالسَّمْتَ الْاَوَّلَ السَّمْتَ الْاَوَّلَ فَاِنَّا عَلَی الْفِطْرَۃِ[2]

میں نے عبد اللہ بن مسعودؓ کو دیکھا کہ وہ مردوں اور عورتوں کو نصیحت کر رہے ہیں۔ آپ فرمارہے تھے کہ تم میں جو بھی خواہ وہ مرد ہو یا عورت، فتنوں کا زمانہ پائے تو حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں کے طریقہ پر جما رہے تو ہم فطرت پر قائم رہیں گے۔

تعلیمی کوششوں کے نتائج

اس مسلسل کوشش اور پیہم توجہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ کل تک عورت، جو علم و ادب سے

---

۱ صحیح مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب تحریم فعل الواصلۃ، الخ

۲ سنن الدارمی، مقدمہ، باب فی کراھیۃ اخذ الرای

ناآشنائے محض تھی، آج اس کی نگہبان و محافظ بن گئی اور دنیائے فکر و ادب میں جس کا کوئی وجود نہیں تھا وہ آفتابِ علم و ہدایت بن کر چمکنے لگی۔

حضرت عائشہؓ

صحابیات ہی میں نہیں، بلکہ صحابہ کی جماعت میں بھی حضرت عائشہؓ کا مقام بہت نمایاں ہے۔ ان کے شاگردِ خاص عروہ بن زبیرؓ ان کی وسعتِ علم کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

مَا رَأَیْتُ اَحَدًا مِّنَ النَّاسِ اَعْلَمَ بِالْقُرْاٰنِ وَلاَ فَرِیْضَةٍ وَلاَ بِحَلاَلٍ وَ حَرَامٍ وَ لاَ بِشِعْرٍ وَلاَ بِحَدِیْثِ الْعَرَبِ وَلاَ بِنَسَبٍ مِّنْ عَائِشَةَ[۱]	میں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ قرآن اور فرائض، حلال وحرام، شعر و ادب، اہل عرب کی تاریخ اور ان کے حسب ونسب کو جاننے والا کسی کو نہیں پایا۔

عروہ بن زبیرؓ کو عربی کلام پر بڑا عبور تھا۔ اس معاملہ میں ان کی تعریف کی گئی تو کہا کہ حضرت عائشہؓ کے مقابلہ میں شاعری سے میری واقفیت کوئی حیثیت نہیں رکھتی، وہ تو بات بات پر اشعار سے استدلال کرتی تھیں[۲]

موسیٰ بن طلحہ کہتے ہیں:

مَا رَأَیْتُ اَحَدًا اَفْصَحَ مِنْ عَائِشَةَ[۳]	میں نے حضرت عائشہؓ سے زیادہ کسی کو فصیح نہیں دیکھا۔

لوگوں کو حضرت عائشہؓ کی واقفیتِ شعر و ادب سے کہیں زیادہ ان کی طبی معلومات پر حیرت ہوتی تھی۔ ابن ابی ملیکہؒ نے آپ سے کہا: آپ کی شاعری پر ہمیں تعجب نہیں ہوتا، کیوں کہ آپ ابو بکر صدیق کی بیٹی ہیں، جن کی فصاحت و بلاغت مانی

---

۱ ذہبی، تذکرہ الحفاظ: ۱/ ۲۷

۲ ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۷ ۴۳۔ الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/ ۲۳۳

۳ ترمذی، ابواب المناقب۔ حاکم، المستدرک، جلد ۴، ص ۳۵، حدیث نمبر ۲۳۳

ہوئی تھی۔ لیکن طب کہاں سے آپ نے سیکھی؟ جواب دیا کہ حضورؐ کو جب کوئی مرض لاحق ہوتا تو باہر سے حاضر خدمت ہونے والے وفود اس کا علاج بتاتے اور میں اس کو یاد رکھتی[1]

آپ کی حساب دانی کا یہ حال تھا کہ اکابرِ صحابہ آپ سے میراث کے مسائل دریافت فرماتے[2]

عمرہ بنت عبد الرحمٰن

حضرت عائشہؓ کے تلامذہ میں ایک عمرہ بنت عبد الرحمٰن بھی ہیں، جن کا تذکرہ ابن حماد حنبلی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

اَلْفَقِیْھَۃُ الْفَاضِلَۃُ عُمْرَۃُ بِنْتُ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ الْاَنْصَارِیَّۃُ نَشَأَتْ فِیْ حِجْرِ عَائِشَۃَ فَاَکْثَرَتْ الرِّوَایَۃَ عَنْھَا وَ ھِیَ الْعَدْلُ الضَّابِطَۃُ لِمَا یُؤْخَذُ عَنْھَا[3]

فقہ وفضیلت رکھنے والی، عمرہ بنت عبد الرحمٰن جن کی پرورش حضرت عائشہؓ کی گود میں ہوئی اور جنھوں نے حضرت عائشہؓ سے بہت زیادہ روایات بیان کیں۔ قابلِ اعتبار، ضبط اور حفظ کی مالک اور ایسی کہ جن کی روایات قبول کی جاتی ہیں۔

ان کے متعلق ابن حبانؒ فرماتے ہیں:

کَانَتْ مِنْ اَعْلَمِ النَّاسِ بِحَدِیْثِ عَائِشَۃَ

حضرت عائشہؓ کی روایات کی سب سے زیادہ جاننے والی تھیں۔

حضرت عائشہؓ کی روایات کے سلسلے میں ان پر سب سے زیادہ اعتماد کیا جاتا اور ان کی طرف رجوع کیا جاتا تھا[4]

دورِ تابعین کے نامور محدث اور فقیہ قاسم بن محمدؒ نے امام زہری سے کہا کہ میں تمہارے اندر علم کی تشنگی محسوس کرتا ہوں۔ کیا میں تم کو ایک علم سے بھرے ہوئے برتن کی

---

۱ المستدرک، جلد ۴، ص ۳۵، حدیث نمبر ۲۳۳۵

۲ حوالہ سابق

۳ ابن العماد حنبلی، شذرات الذہب: ۱/ ۳۹۵، دار ابن کثیر، بیروت ۱۹۸۶ء

۴ ابن حجر، تہذیب التہذیب: ۱۲/ ۳۸۹

نشان دہی نہ کروں؟ زہری نے جواب دیا: ہاں! ضرور۔ کہا، جاؤ، عمرہ بنت عبد الرحمٰن کی مجلس کو نہ چھوڑو، کیوں کہ وہ حضرت عائشہؓ کی پروردہ ہیں (اس لیے ان کے علم کی سب سے بڑی وارث بھی ہیں) امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ ان کے حسب مشورہ میں عمرہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو معلوم ہوا کہ وہ واقعتہً علم کا نہ ختم ہونے والا سمندر ہیں[۱]

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ نے ابوبکر بن محمد بن حزم کو لکھا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث، دور گزشتہ کی سنت اور عمرہ بنت عبد الرحمٰن کی حدیث ضبط تحریر میں لے آؤ۔ ڈر ہے کہ علم اور اہلِ علم ختم نہ ہوجائیں[۲]

حضرت ام سلمہؓ

حضرت ام سلمہؓ کے متعلق حافظ ابن حجرؒ نے لکھا ہے:

كَانَتْ أُمُّ سَلَمَةَ مَوْصُوفَةٌ بِالْجَمَالِ الْبَارِعِ وَالْعَقْلِ الْبَالِغِ وَالرَّأْيِ الصَّائِبِ[۳]

ام سلمہؓ انتہائی حسن کے ساتھ پختہ عقل اور درستی رائے سے بھی متصف تھیں۔

زینب بنت ام سلمہؓ

ام سلمہؓ کی صاحب زادی حضرت زینبؓ بقول علامہ ابن عبد البرؒ:

كَانَتْ مِنْ اَفْقَهِ اَهْلِ زَمَانِهَا[۴] اپنے زمانہ کی بہت بڑی فقیہ تھیں۔

ابو رافع صائغ کہتے ہیں:

---

۱ ذہبی، تذکرۃ الحفاظ: ۱/ ۱۰۶

۲ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۸/ ۴۸۰

۳ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/ ۴۰۶

۴ ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۴۱۱

كُنْتُ اِذَا ذَكَرْتُ امْرَأَةً فَقِيْهَـةً بِالْمَدِيْنَةِ ذَكَرْتُ زَيْنَبَ بِنْتِ اَبِىْ سَلْمَةَ[۱]

جب میں مدینہ کی کسی فقیہ عورت کا ذکر کرتا ہوں تو فوراً زینب بنت ابی سلمہ یاد آجاتی ہیں۔

ام الحسن

ام سلمہؓ کی ایک باندی خیرۃ ام الحسن نامی تھیں۔ انھوں نے حضرت ام سلمہؓ کے علاوہ حضرت عائشہؓ سے بھی روایتِ حدیث کی ہے۔ ان سے روایت کرنے والوں میں ان کے دو صاحب زادے حسن اور سعید ہیں۔ ان سے علی بن زید بن جدعان، معاویہ بن قرہ مزنی اور حفصہ بنت سیرین نے بھی روایت کی ہے[۲] وہ عورتوں کے درمیان باقاعدہ وعظ و تبلیغ کیا کرتی تھیں[۳]

حضرت صفیہؓ

ام المومنین حضرت صفیہؓ کے متعلق امام نوویؒ کا قول ہے:

كَانَتْ عَاقِلَةً مِّنْ عُقَلَاءِ النِّسَآءِ[۴]

صاحبِ عقل و دانش خواتین میں سے تھیں

ام درداءؓ

حضرت ابو درداءؓ کی بیوی ام درداءؓ کے علم و فضل کا پایہ اتنا اونچا تھا کہ امام بخاریؒ نے ان کے عمل سے اپنی کتاب صحیح بخاری میں استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

كَانَتْ اُمُّ الدَّرْدَاءِ تَجْلِسُ فِىْ صَلَاتِهَا جِلْسَةَ الرَّجُلِ وَ كَانَتْ فَقِيْهَةً[۵]

ام درداء تشہد میں اسی طرح بیٹھتی تھیں جس طرح مرد بیٹھتا ہے اور وہ فقیہ تھیں (اس لیے ان کا عمل قابلِ حجت ہے)۔

۱۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/۱۶۰
۲۔ ابن حجر، تہذیب التہذیب: ۱۲/۳۶۷
۳۔ ابن سعد، طبقات: ۸/۴۷۶
۴۔ نووی، تہذیب الاسماء والصفات: ۲/۳۴۹
۵۔ بخاری، کتاب الاذان، باب سنۃ الجلوس فی التشہد

ان کے متعلق علامہ ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے:

كَانَتْ مِنْ فُضَلَاءِ النِّسَاءِ وَ عُقَلَائِهِنَّ وَ ذَوَاتِ الرَّأْيِ مِنْهُنَّ مَعَ الْعِبَادَةِ وَالنُّسُكِ[1]

عقل و فضیلت اور رائے و تدبیر رکھنے والی عورتوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ عبادت گزار اور متقی بھی تھیں۔

امام نوویؒ نے تو ان کے فقہ و فہم پر سب ہی اہل علم کو متفق بتایا ہے:

وَ اتَّفَقُوْا عَلٰى وَصْفِهَا بِالْفِقْهِ وَ الْعَقْلِ وَالْفَهْمِ وَالْجَلَالَةِ[2]

لوگوں کا ان کی فقہ و عقل اور فہم و بزرگی پر اتفاق رہا ہے۔

فاطمہ بنت قیسؓ

فاطمہ بنت قیسؓ کے تفقہ اور علم کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ وہ حضرت عمرؓ اور حضرت عائشہؓ سے ایک فقہی مسئلہ پر عرصہ تک بحث کرتی رہیں، لیکن وہ ان کی رائے نہیں بدل سکے۔ اس سے بھی آگے یہ کہ امت کے بہت سے ائمہ نے ان کی رائے کو ترجیح دی ہے۔

امام نوویؒ نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے:

كَانَتْ مِنَ الْمُهَاجِرَاتِ الْاَوَّلِ ذَاتِ عَقْلٍ وَافِرٍ وَ كَمَالٍ[3]

وہ ان لوگوں میں سے ہیں، جنہوں نے ابتدائی دور میں ہجرت کی تھی اور انتہائی عقل و کمال کی مالک تھیں۔

اُمِّ سلیمؓ

حضرت انسؓ کی والدہ ام سلیمؓ بڑے اونچے درجہ کی صحابیہ تھیں، جن کی بزرگی کا ذکر حافظ ابن حجرؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے: ''وَمَنَاقِبُهَا كَثِيْرَةٌ وَ شَهِيْرَةٌ'' ان کے فضائل و مناقب بہت زیادہ اور کافی مشہور ہیں۔''[4]

---

[1] الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۴۸۸۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/ ۳۱۱
[2] نووی، تہذیب الاسماء والصفات: ۴/ ۳۸
[3] نووی، تہذیب الاسماء والصفات: ۲/ ۳۵۳
[4] ابن حجر، تہذیب التہذیب: ۱۲/ ۴۱۹

امام نوویؒ شہادت دیتے ہیں:

كانت من فاضلات الصحابيات[۱]	علم و فضل رکھنے والی صحابیات میں سے ایک تھیں۔

ام عطیہؓ

اسی قسم کی شہادت امام نوویؒ نے ام عطیہؓ کے بارے میں بھی دی ہے۔ فرماتے ہیں:

وَهِيَ مِنْ فَاضِلَاتِ الصَّحَابِيَاتِ وَالْغَازِيَاتِ مِنْهُنَّ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ[۲]	ان کا شمار فضیلت و بزرگی رکھنے والی اور حضورؐ کے ساتھ جہاد میں شریک ہونے والی صحابیات میں ہوتا ہے۔

حفصہ بنت سیرینؒ

ام عطیہؓ سے احادیث روایت کرنے والوں میں حفصہ بنت سیرینؒ بھی ہیں۔ یہ بارہ سال کی عمر ہی میں قرآن کی تعلیم سے فارغ ہوچکی تھیں[۳] یہ بصرہ کی تھیں۔ بصرہ ہی کے ایک مشہور قاضی اور فقیہ ایاس بن معاویہؒ کہتے ہیں:

مَا اَدْرَكْتَ اَحَدًا اُفَضِّلُهٗ عَلٰى حَفْصَةَ[۴]	میں نے کسی ایسے شخص کو نہیں پایا جسے حفصہ بنت سیرین پر فضیلت دے سکوں۔

بنت سعید بن المسیّب

تابعین کے امام سعید بن المسیبؒ نے اپنی لڑکی کا عقد اپنے ہی ایک شاگرد سے کرا دیا تھا۔ شادی کے دوسرے دن وہ حلقہ درس میں شریک ہونے کی تیاری کرنے لگے تو صاحب زادی نے کہا اِجْلِسْ اُعَلِّمُکَ عِلْمَ سَعِیْدٍ (تشریف رکھیے، سعید بن میسّب

---

۱ نووی، تہذیب الاسماء والصفات: ۲/ ۳۱۳

۲ نووی، تہذیب الاسماء والصفات: ۲/ ۳۶۴

۳ ابن حجر، تہذیب التہذیب: ۱۲/ ۳۶۰

۴ ابن حجر، تہذیب التہذیب: ۱۲/ ۴۰۹

جو تعلیم آپ کو دے سکتے ہیں وہ میں یہیں دے دوں)۔[۱]

امام مالکؒ کی صاحب زادی کے علم و فضل کا یہ حال تھا کہ طالب علم اگر موطا پڑھتے ہوئے کہیں لغزش کھاتا تو وہ اپنے کمرہ کے اندر سے دروازہ کھٹکھٹاتیں، امام موصوف کو ان کے علم پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ پڑھنے والے سے کہتے، **اِرْجِعْ فَالْغَلَطُ مَعَکَ**[۲] (دہراؤ، تم غلطی کر رہے ہو)۔

بعض دیگر خواتین

کسی دور کے علمی وفکری ارتقاء کا صحیح اندازہ چند نامور ہستیوں کے ذریعے نہیں کیا جاسکتا، اس کے لیے غیر معروف اشخاص بلکہ عوام کی ذہنی سطح کے مطالعہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی کے بعد ہم اس زمانہ کے عام معیار کے متعلق کوئی رائے قائم کرنے میں حق بہ جانب ہوں گے۔ اسی لیے ہم نے اوپر کے صفحات میں ان خواتین کے تذکرہ کے ساتھ جو اسلامی تاریخ میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں، ایسی خواتین کا بھی ذکر کیا ہے، جن کی ایک سوانح نگار کی نظر میں کچھ زیادہ اہمیت نہیں ہے۔ اب مزید ایسی ہی دو ایک خواتین کا ذکر کرنا چاہتے ہیں، تاکہ عورت کو فکر کی بلندی عطا کرنے میں اسلام نے جو سعی کی ہے، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ کیا جاسکے۔

اُم ورقہ بنت نوفل الانصاریہؓ کے متعلق روایت ہے:

كَانَتْ قَدْ قَرَأَتِ الْقُرْاٰنَ وَأَمَرَهَا اَنْ تَؤُمَّ اَهْلَ دَارِهَا[۳]

وہ قرآن پڑھی ہوئی (حافظہ) تھیں۔ حضورﷺ نے ان کو اپنے گھر والوں کی امامت کا حکم دیا تھا۔

---

۱ المدخل لابن الحاج: ۱/ ۲۱۵ ۲ حوالہ سابق

۳ ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ النساء۔ اس حدیث سے بعض اصحاب نے یہ استدلال کیا ہے کہ عورت نماز میں مردوں کی امامت کرسکتی ہے۔ لیکن جمہور فقہاء اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ ان کے نزدیک ام ورقہ اپنے گھر اور محلّہ کی خواتین کی امامت کرتی تھیں (اس کے جواز پر آگے بحث آ رہی ہے) تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ مولانا خلیل احمد سہارنپوری، بذل المجہود، ۴/ ۲۰۵-۲۱۰، دار الکتب العلمیہ، لبنان۔ دورِ اول میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی کہ مردوں نے عورت کی امامت میں نماز ادا کی ہو۔ اس کا جواز ہوتا تو اس کے شواہد پائے جاتے۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ایک مرتبہ ایک مسئلہ بیان فرمایا تو اُمّ یعقوب نامی بنو اسد کی ایک عورت آپ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا:

لَقَدْ قَرَأْتُ مَا بَيْنَ لَوْحَيِ الْمُصْحَفِ فَمَا وَجَدْتُهُ[1]

مصحف کی دونوں دفتیوں کے درمیان جو کچھ ہے (یعنی پورا قرآن) میں پڑھ چکی ہوں، لیکن آپ کا بیان کردہ مسئلہ کہیں نہیں دیکھا۔

مشہور مالکی امام اشہبؒ نے ایک مرتبہ ایک لونڈی سے سبزی خریدی۔ اس زمانہ کا رواج یہ تھا کہ سبزی کی قیمت رقم کی شکل میں ادا کرنے کے بجائے سبزی فروش کو روٹی دے دی جاتی تھی۔ اشہبؒ کے پاس اس وقت روٹی نہیں تھی، انھوں نے لونڈی سے کہا: شام کو جب روٹی نان بائی کے ہاں سے آجائے تو آ کر لے جانا۔ اس نے کہا: جناب یہ تو ناجائز ہے، کیوں کہ شریعت نے کھانے پینے کی چیزوں میں دست بہ دست تبادلہ کا حکم دیا ہے[2]

تحریر کا رواج

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عورتوں میں پڑھنے کی طرح لکھنا بھی عام ہو چکا تھا اور وہ تحریر کے اصول و آداب سے اس حد تک واقف ہو چکی تھیں کہ ان کے لیے خط و کتابت کرنے اور مختلف مسائل و معاملات کو قلم بند کرنے میں کوئی زحمت نہیں پیش آئی تھی۔ اس کا اندازہ ذیل کے دو واقعات سے کیا جاسکتا ہے:

ربیع بنت معوذؓ کہتی ہیں کہ یہ حضرت عمرؓ کے زمانہ کی بات ہے کہ میں نے انصار کی چند عورتوں کے ساتھ اسماء بنت مخربہ سے ملاقات کی۔ ان کا لڑکا عبد اللہ بن ابی ربیعہ یمن سے ان کے پاس عطر بھیجتا تھا اور وہ اسے فروخت کرتی تھیں۔ جب انہوں نے میری اور میری ساتھیوں کی شیشیوں میں عطر ڈال دیا اور وزن کرلیا تو کہا کہ تمہارے

---

۱ مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب تحریم فعل الواصلۃ الخ۔ بخاری، کتاب اللباس، باب المتنمصات

۲ ابن الحاج، المدخل: ۱/۲۱۵

ذمہ جو واجب الادا ہے وہ لکھ دو۔[۱]

عائشہؓ بنت طلحہ، حضرت عائشہؓ کی بھانجی تھیں، حضرت عائشہؓ سے تعلق اور ان کے علم و فضل کی بنا پر مختلف علاقوں سے لوگ ان کو خطوط اور ہدیے روانہ کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ سے انھوں نے ان خطوط اور تحفوں کا ذکر کیا تو فرمایا: خطوط کا جواب بھی دو اور ہدیہ کے عوض ہدیہ بھی بھیجو۔[۲]

خواتین کی علمی خدمات

خواتین کی اس قابلیت سے سوسائٹی کو کیا فائدہ پہنچا اور ان کی صلاحیتوں نے دین و علم کے کن گوشوں کو تب و تاب بخشی؟ ان سوالات کا جواب تاریخ کے صفحات یہ دیتے ہیں کہ زندگی کے ہر میدان میں ان کے نقوشِ فہم و بصیرت نے رہ نمائی کا کام دیا ہے اور وہ مردوں کے دوش بہ دوش امت کی ہدایت کا فریضہ انجام دیتی رہی ہیں۔

امام ابن قیم فرماتے ہیں:

وَ الَّذِيْنَ حُفِظَتْ عَنْهُمُ الْفَتْوىٰ مِنْ اَصْحَابِ رَسُوْلِ اللّٰهِ مِأَةٌ وَ نَيِّفٌ وَ ثَلَاثُوْنَ نَفْسًا مَا بَيْنَ رَجُلٍ وَ امْرَأَةٍ	رسول اللہ کے صحابہ میں جن لوگوں کے فتاویٰ محفوظ ہیں ان کی تعداد ایک سوتیس سے کچھ زائد ہے، اس میں مرد بھی ہیں اور عورتیں بھی۔

ان میں بھی سات اشخاص ایسے ہیں جن کے فتاویٰ کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ بقول علامہ ابن حزمؒ ان میں سے ہر ایک کے فتووں کو اکٹھا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔ ان سات اشخاص میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ جیسی ہستیوں کے ساتھ حضرت عائشہؓ بھی شامل ہیں۔

مفتیانِ صحابہ کی دوسری صف میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عثمانؓ وغیرہما کے

۱۔ طبقات ابن سعد: ۸ / ۳۰۰

۲۔ بخاری، الادب المفرد، باب الکتابۃ الی النساء و جوابھن، ص ۵۴۰

دوش بدوش حضرت ام سلمہؓ بھی موجود ہیں، ابن حزم کہتے ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کے فتاویٰ کے ذریعے ایک رسالہ مرتب کیا جاسکتا ہے۔

تیسرا گروہ ان اصحاب پر مشتمل ہے جنھوں نے بہت کم فتوے دیے ہیں، ان میں حضرت حسنؓ، ابو ذرؓ اور ابوعبیدہؓ وغیرہم کے ساتھ ام عطیہؓ، حضرت حفصہؓ، حضرت اُم حبیبہؓ، حضرت صفیہؓ، لیلیٰ بنت قائمؓ، اسماء بنت ابی بکرؓ، ام شریکؓ، خولاء بنت تویتؓ، ام درداء، عاتکہ بنت زیدؓ، سہلہ بنت سہیلؓ، حضرت جویریہؓ، حضرت میمونہؓ، حضرت فاطمہؓ، حضرت فاطمہ بنت قیسؓ، ام سلمہؓ، زینب بنت ام سلمہؓ، امّ ایمنؓ، امّ یوسفؓ اور غامدیہؓ کا بھی شمار ہوتا ہے۔[۱]

مختلف عقدہ ہائے حیات کو لے کر ان کی طرف چھوٹوں نے بھی رجوع کیا اور بڑوں نے بھی، مردوں نے بھی اور عورتوں نے بھی، اصحابِ قرب و جوار نے بھی اور دوردراز کے رہنے والوں نے بھی، اور ان خواتینِ امت کی دینی سمجھ بوجھ اور بصیرت و دانائی نے ان گرہوں کو کھولا اور راہِ حق واضح کی۔

حضرت عائشہؓ کی مرجعیت کا اندازہ عائشہ بنت طلحہؓ کی اس تصریح سے کیا جاسکتا ہے:

كَانَ النَّاسُ يَأْتُوْنَهَا مِنْ كُلِّ مِصْرٍ[۲] — حضرت عائشہؓ کے پاس ہر شہر سے لوگ آیا کرتے تھے۔

ظاہر ہے لوگ دور دور سے محض رسمی ملاقات کے لیے تو حاضر نہیں ہوتے ہوں گے، بلکہ اس کا مقصد زیادہ تر علمی استفادہ ہی رہتا ہوگا۔

حدیث کی کتابوں سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے حضرت عمرؓ، حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اور حضرت ابو ہریرہؓ جیسے وسیع النظر اصحاب کی بعض بعض آراء و اجتہادات

---

۱. ابن قیم، اعلام الموقعین: ۱/ ۱۰-۱۲، دار الکتب العلمیۃ، لبنان ۱۹۹۶ء

۲. بخاری، الادب المفرد، باب الکتابۃ الی النساء وجوابہن، ص ۱۴۱ ۵

پر تنقید کر کے ان کے ذہن وفکر کو صحیح رُخ کی طرف موڑا ہے۔

صحابہ میں جو بڑے بڑے حفاظِ حدیث تھے، ان میں حضرت عائشہؓ بھی ہیں۔ آپ کی روایات کی تعداد دو ہزار دو سو دس (۲۲۱۰) ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ، حضرت عبداللہ بن عمرؓ اور حضرت انسؓ کے علاوہ کسی اور صحابی کی روایات اتنی نہیں ہیں[1]

حضور اکرم ﷺ کے اقوال و افعال، سیرت و کردار اور پسند و ناپسند سے اس وسیع واقفیت کا نتیجہ تھا کہ اکابرِ صحابہ تک مسائل دریافت کرنے کے لیے ان کی طرف رجوع کرتے تھے۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جیسے فقیہ و عالم صحابی حضرت عائشہؓ کے علم و واقفیت کے متعلق اپنا اور اپنے جیسے دوسرے ساتھیوں کا تجربہ بیان کرتے ہیں:

مَا اَشْكَلَ عَلَيْنَا اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ حَدِيْثٌ قَطُّ فَسَأَلْنَا عَائِشَةَ اِلَّا وَجَدْنَا عِنْدَهَا مِنْهُ عِلْمًا[2]

ہم اصحاب رسول اللہؐ کو جب کبھی کسی حدیث کے معاملہ میں کوئی مشکل پیش آئی اور ہم نے اس سلسلے میں حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا تو دیکھا کہ ان کو اس کے متعلق علم ضرور ہے۔

فقیہ مدینہ عروہ بن زبیرؒ اور مشہور محدث قاسم بن محمدؒ کے متعلق ابن عماد حنبلی نے لکھا ہے:

وَ كَانَا مِنَ الْاٰخِذِيْنَ عَنْ عَائِشَةَ الَّذِيْنَ لَا يَكَادُوْنَ يَتَجَاوَزُوْنَ قَوْلَهَا الْمُتَفَقِّهِيْنَ لَهَا[3]

یہ ان لوگوں میں ہیں جنھوں نے حضرت عائشہؓ سے اخذ و استفادہ کیا اور جو ان کے قول (رائے) سے کبھی تجاوز نہیں کرتے تھے اور ان ہی کے بتائے ہوئے دائرے کے اندر رہ کر مسائل کا استنباط کرتے تھے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں:

---

[1] ابن رجب، شذرات الذھب: ۱/ ۶۳

[2] ترمذی، ابواب المناقب، باب فضل عائشہؓ

[3] ابن رجب، شذرات الذھب: ۱/ ۱۱۳

وَ قَدُ حَفِظَتُ عَنهُ شَيئًا كَثِيرًا وَ عَاشَتُ بَعُدَهُ قَرِيبًا مِنُ خَمُسِينَ سَنَةً فَاَكُثَرَ النَّاسُ الْاَخذَ عَنهَا وَ نَقَلُوا عَنهَا مِنَ الْاَحكَامِ وَ الْاٰدَابِ شَيئًا كَثِيرًا حَتّٰى قِيلَ اِنَّ رُبعَ الْاَحكَامِ الشَّرعِيَّةِ مَنقُولٌ عَنهَا رَضِىَ اللّٰهُ عَنهَا[1]

حضرت عائشہؓ نے حضورﷺ سے بہت سی باتیں یاد رکھیں اور آپؐ کے بعد تقریباً پچاس سال زندہ رہیں اور لوگوں نے ان سے بہت زیادہ اخذ و استفادہ کیا اور بہت سے احکام و آداب ان سے نقل کیے، حتی کہ کہا جاتا ہے کہ شریعت کے ایک چوتھائی احکام ان سے منقول ہیں۔

حافظ ابن حجرؒ نے ایک دوسرے مقام پر حضرت عائشہؓ سے حدیث کا استفادہ کرنے والے اٹھاسی افراد کا نام شمار کرنے کے بعد لکھ دیا ہے: ''وَخَلُقٌ كَثِيرٌ'' یعنی ان کے علاوہ ایک بہت بڑی تعداد نے آپ سے روایت کی ہے۔[2] ان میں عمرو بن العاصؓ ابوموسیٰ اشعریؓ، اور عبد اللہ بن زبیرؓ جیسے اصحابِ سیاست بھی ہیں اور ابوہریرہؓ، ابن عباسؓ اور ابن عمرؓ جیسے محدث و فقیہ بھی، ان میں سرخیل تابعین سعید بن مسیّبؒ بھی ہیں اور علقمہ بن قیسؒ جیسے نامور فقیہ بھی۔ ان میں آزاد اور غلام بھی ہیں اور مرد اور عورت بھی۔

حضرت صفیہؓ کے علم سے اُمت کو کتنا فائدہ پہنچا، اس کا اندازہ صہیرہ بنت جیفر کے اس بیان سے کیا جاسکتا ہے۔ کہتی ہیں: ہم چند خواتین حج سے فراغت کے بعد مدینہ گئیں اور حضرت صفیہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئیں۔ دیکھا کہ وہاں پہلے ہی سے کوفہ کی چند عورتیں بیٹھی ہوئی ہیں۔ ہم نے ان سے زن و شوہر سے متعلق مختلف مسائل اور حیض اور نبیذ کے احکام دریافت کیے۔[3]

پتہ نہیں، اس طرح کتنے علاقے کے لوگوں نے کتنے مسائل میں ان سے رہنمائی حاصل کی ہوگی۔

---

[1] فتح الباری: ۷/ ۴۷۹

[2] ابن حجر، تہذیب التہذیب: ۱۲/ ۳۸۵

[3] مسند احمد: ۷/ ۴۷۴، حدیث صفیہ ام المومنین، حدیث نمبر ۲۶۳۲۴

حضرت ام سلمہؓ سے احادیث روایت کرنے والے ۳۲ افراد کے نام بنام ذکر کے بعد حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں: ان کے علاوہ اور بھی لوگ ہیں، جنھوں نے ان سے روایت حدیث کی ہے[۱] ان میں صحابہ اور نامور تابعین دونوں ہی شامل ہیں۔

مروان کو ایک مسئلہ معلوم کرنا تھا۔ کہتا ہے:

كَيْفَ نَسْأَلُ اَحَدًا عَنْ شَیْءٍ وَ فِيْنَا اَزْوَاجُ النَّبِیِّ صلی اللہ علیہ وسلم

جب ہمارے اندر ازواجِ مطہرات موجود ہیں تو کسی دوسرے سے کیوں اور کس لیے دریافت کریں۔

چناں چہ اس نے حضرت ام سلمہؓ سے استفسار کرایا تو انھوں نے اس کی مشکل حل کی۔[۲]

صحابہ کرام کے علمی اختلافات اور الجھنوں کے رفع کرنے میں ازواجِ مطہرات کے علم دین نے بڑی مدد دی ہے۔

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

وَ قَدْ كَانَتِ الصَّحَابَةُ يَخْتَلِفُوْنَ فِی الشَّیْءِ فَتَرْوِیْ لَهُمْ اِحْدٰی اُمَّهَاتُ الْمُؤْمِنِيْنَ عَنِ النَّبِیِّ شَيْئًا فَيَاْخُذُوْنَ بِهٖ وَ يَرْجِعُوْنَ اِلَيْهِ وَ يَتْرُكُوْنَ مَا عِنْدَهُمْ لَهٗ[۳]

صحابۂ کرام کے درمیان کسی چیز میں اختلاف ہوتا اور امہات المومنین میں سے کوئی نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سلسلے میں کوئی حدیث بیان کرتیں تو وہ اس کو فوراً قبول کر لیتے اور اپنے تمام اختلافات کو چھوڑ کر اس کی طرف رجوع کرتے۔

ربیع بنت مُعَوَّذؓ سے مسائل دریافت کرنے کے لیے کبھی حضرت عبد اللہ بن عباسؓ حاضر ہوتے ہیں اور کبھی حضرت عبد اللہ بن عمرؓ۔ ان سے احادیث روایت کرنے والوں میں مدینہ کے مشہور فقیہ سلمان بن یسارؒ بھی ہیں اور عمّار بن یاسرؓ کے پوتے ابو عبیدہ،

---

۱ ابن حجر، تہذیب التہذیب: ۱۲ / ۴۰۵

۲ مسند احمد: ۷ / ۴۵۵، حدیث ام سلمہؓ، حدیث نمبر ۲۶۲۰۱

۳ زاد المعاد: ۵ / ۵۳۴

عباد بن ولید اور ابن عمرؓ کے غلام نافع جیسے اربابِ علم و فضل بھی[1]

فاطمہ بنت قیسؓ سے قاسم بن محمدؒ، سعید بن مسیّبؒ، عروہ بن زبیرؒ، ابو سلمہ بن عبد الرحمٰنؒ اور شعبی جیسے اربابِ علم و فضل بھی[2]

ام عطیہؓ کے متعلق علامہ ابن عبد البرؒ کہتے ہیں کہ وہ ایک اونچے درجہ کی صحابیہ تھیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں:

وَ شَهِدَتْ غُسْلَ اِبْنَةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَ حَكَتْ ذٰلِكَ فَاَتْقَنَتْ وَ حَدِيْثُهَا اَصْلٌ فِیْ غُسْلِ الْمَيِّتِ وَ كَانَ جَمَاعَةٌ مِنَ الصَّحَابَةِ وَ عُلَمَاءُ التَّابِعِيْنَ بِالْبَصْرَةِ يَأْخُذُوْنَ عَنْهَا غُسْلَ الْمَيِّتِ وَ لَهَا عَنِ النَّبِیِّ اَحَادِيْثُ رَوٰى عَنْهَا اَنَسُ بْنُ مَالِكٍ وَ مُحَمَّدُ بْنُ سِيْرِيْنَ وَ حَفْصَةُ بِنْت سِيْرِيْنَ[3]

یہ رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی کے غسل میں شریک تھیں اور انھوں نے اس کو بیان کیا ہے اور بہت عمدگی سے بیان کیا ہے اور میت کے غسل کے سلسلے میں ان کی حدیث اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے۔ صحابہ اور علمائے تابعین بصرہ میں ان سے غسل میت سیکھتے تھے۔ اس کے علاوہ نبی ﷺ سے ان کی اور بھی بہت سی حدیثیں ہیں۔ جنہیں انس بن مالک، محمد بن سیرین اور حفصہ بنت سیرین نے روایت کیا ہے۔

عمرہ بنت عبد الرحمٰنؒ کا ذکر آچکا ہے۔ ان کی روایات حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کی نگاہ میں اس قدر اہمیت کی حامل تھیں کہ انھوں نے ابوبکر بن محمد بن حزم کو حکم دیا کہ ان کو قلم بند کریں۔ عمرہ بنت عبد الرحمٰن کی خدمت میں ابو بکر بن حزم ہی نہیں بلکہ امام زہری اور یحییٰ بن سعید جیسے یگانہ ہائے عصر کو استفادہ کے لیے حاضر ہونا پڑا ہے۔[4]

---

[1] ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ۔ ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۳۹۷

[2] ابن حجر، تہذیب التہذیب: ۱۲/ ۳۹۴

[3] ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۵۰۲

[4] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۸/ ۴۸۰

حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کی صاحب زادی عائشہؒ کے حلقۂ تلامذہ میں امام مالکؒ، ایوب سختیانیؒ اور حکم بن عتیبہؒ جیسے فقہاء و محدثین نظر آتے ہیں۔[1]

امام شافعیؒ نے حضرت حسنؓ کی پوتی سیدہ نفیسہ کی خدمت میں حاضر ہوکر علم حدیث حاصل کیا ہے۔[2]

ان چند اشارات کے ذریعے دورِ اول کی خواتین کی علمی خدمات کا محض ایک مجمل سا نقشہ سامنے آسکتا ہے۔ تاریخ نے کسی دور اور کسی طبقہ کے تمام کاموں کا پوری طرح نہ تو کبھی احاطہ کیا ہے اور نہ کرسکتی ہے، لیکن اس کے باوجود اسلامی تاریخ نے جو کچھ مواد چھوڑا ہے، اگر اسی کی مدد سے ان خواتین کے علمی اور فکری کارناموں کی تفصیل فراہم کی جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

---

[1] ابن حجر، تہذیب التہذیب: ۱۲/ ۳۸۶

[2] ابن خلکان، وفیات الاعیان: ۲/ ۱۶۹



عورت ــــ میدانِ عمل میں

اسلام نے عورت کی جدوجہد کو صرف علم و فکر کے میدان تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کی پروازِ عمل کے لیے اس سے وسیع تر فضا مہیا کی ہے۔ وہ جس طرح علم و ادب کی راہ میں پیش قدمی کرسکتی ہے، اسی طرح زراعت اور تجارت میں بھی ترقی کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اس کو مختلف پیشوں اور صنعتوں کے اپنانے اور بہت سی ملّی و اجتماعی خدمات کے انجام دینے کی بھی اجازت ہے۔ اجازت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی سعی وعمل کو برداشت یا گوارا کرلیا گیا ہے، بلکہ حرکت وعمل کے جو داعیات اس کے اندر ابھرتے ہیں اور زندگی کے جو تقاضے سامنے آتے ہیں، ان کو دبانے اور مٹانے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ ان کی تکمیل کی اس کو دعوت دی گئی ہے۔

اس کا اندازہ ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ عبادہ بن صامتؓ کے گھر آرام فرما رہے تھے کہ اچانک مسکراتے ہوئے بیدار ہوئے۔ ان کی بیوی اُمّ حرامؓ نے وجہِ مسرت دریافت کی تو بتایا کہ خواب میں مجھے میری امت کے وہ بلند مرتبہ افراد دکھائے گئے جو خدا کی راہ میں جہاد کے لیے سمندر کا سفر کریں گے، جس کا اجر اتنا بڑا ہے کہ وہ جنت میں بادشاہوں کی طرح تخت پر متمکن ہوں گے۔ اُمّ حرامؓ نے حضورؐ سے درخواست کی: دعا فرمایئے، اللہ تعالیٰ مجھے بھی ان لوگوں میں داخل فرما دے۔ آپؐ نے اس سعادت مند گروہ میں ان کی شمولیت کی دعا کی۔ پھر آپ لیٹ گئے اور دوبارہ اٹھے تو

اس وقت بھی مسرت و شادمانی کے وہی آ ثار نمایاں تھے۔ امّ حرامؓ نے سبب معلوم کیا تو وہی پہلا سبب بتایا۔ امّ حرامؓ نے اس مرتبہ بھی دعا کی درخواست کی تو فرمایا: (پریشان کیوں ہو) ''تمہارا شمار سابقین میں ہے۔''[۱]

غور کیجیے! جہاد اور وہ بھی سمندر پار کرکے۔ زندگی کا انتہائی صبر آزما اور ایثار و قربانی کا طالب عمل، اس میں عورت کی شرکت کی حضوؐر دعا فرما رہے ہیں۔ حالاں کہ جہاد اس پر فرض نہیں ہے۔ اس سے اسلام کے مزاج اور رجحان کا پتا چلتا ہے۔ وہ یہ نہیں چاہتا کہ عورت اجتماعی سرگرمیوں سے بالکل کنارہ کش رہے اور اپنے دائرہ سے باہر کبھی کوئی خدمت انجام نہ دے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کامیاب سماجی جدوجہد، جفاکشی، سادگی، استقلال اور حالات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ جیسی صفات کا مطالبہ کرتی ہے۔ فطری طور پر عورت کے اندر ان کی کمی ہوتی ہے اور یہ صفات پیدا بھی اس وقت ہوتی ہیں جب کہ انسان کو مخالف قوتوں سے تصادم اور کش مکش کرنا پڑے۔ عورت عائلی زندگی سے فطری تعلق کی بنا پر اس کش مکش سے دور رہتی ہے۔ اس لیے مشکل ہی سے اس کے اندر یہ صفات پیدا ہوتی ہیں، بلکہ اس کے برعکس گھر کی پرسکون زندگی اس کے اندر بڑی آسانی سے تکلف و تصنع، آسائش و راحت، نازک طبعی اور غیر مستقل مزاجی جیسی خصوصیات ابھار دیتی ہے، اسلام نے کوشش کی ہے کہ یہ مذموم صفات اس کے اندر راہ نہ پانے پائیں اور وہ اس قابل ہوسکے کہ زندگی کے شدائد کا استقلال کے ساتھ مقابلہ کرسکے۔ چناں چہ اسی غرض سے شریعت نے اس کو پُر مشقت اور سادہ زندگی کی تعلیم دی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے دو طبقوں کے متعلق فرمایا کہ وہ جہنمی ہیں، جن میں سے ایک ہے:

وَ نِسَآءٌ کَاسِیَاتٌ عَارِیَاتٌ	وہ عورتیں جو لباس پہننے کے باوجود عریاں
مُمِیلَاتٌ مَائِلَاتٌ رُؤُوسُهُنَّ	رہتی ہیں، جو مٹک مٹک کر چلتی ہیں اور جو

---

[۱] بخاری، کتاب الجهاد، باب غزوة المرأة فی البحر

كَاَسْنِمَـةِ الْبُـخْتِ الْمَائِلَـةِ لاَ يَدْخُلْنَ الْجَنَّةَ وَلاَ يَجِدْنَ رِيْحَهَا وَ اِنَّ رِيْحَهَا لَتُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ كَذَا وَ كَذَا[1]

اونٹ کے کوہان کی طرح اپنے شانوں کو ہلا ہلا کر ناز و ادا کا اظہار کرتی ہیں، وہ جنت میں داخل نہیں ہوں گی، بلکہ اس کی خوشبو بھی نہیں سونگھ سکیں گی، حالاں کہ جنت کی مہک دور دور تک پھیلی ہوگی۔

حضرت معاویہؓ نے ایک مرتبہ تقریر کرتے ہوئے مصنوعی بالوں کی ایک لٹ اپنے ہاتھ میں لے کر مدینہ والوں سے سوال کیا۔

اَيْنَ عُلَمَائُكُمْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم يَنْهٰى عَنْ مِثْلِ هٰذَا وَ يَقُوْلُ اِنَّمَا هَلَكَتْ بَنُوْ اِسْرَائِيْلَ حِيْنَ اتَّخَذَ هٰذِهٖ نِسَاؤُهُمْ[2]

کہاں ہیں تمھارے علماء؟ (کیوں وہ اس پر تنقید نہیں کرتے؟) میں نے اس کے استعمال سے رسول ﷺ کو منع کرتے ہوئے سنا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: بنو اسرائیل اس وقت تباہ ہوئے جب کہ ان کی عورتوں نے اسے اختیار کیا۔

یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے کہ عورت کے ایک عمل سے پوری قوم تباہ ہوجائے، لیکن حضور ﷺ کا منشا یہ نہیں ہے کہ یہ عمل ان کی تباہی کا واحد ذریعہ بنا تھا بلکہ آپ ایک متعین عمل کے ذریعے اس ذہن و مزاج کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں جو قوموں کو تیزی کے ساتھ ہلاکت و بربادی کی طرف لیے جاتا ہے۔ اگر کوئی قوم سادگی کے بجائے تصنع اور تکلف کی عادی اور جفا کشی کے بجائے عیش و راحت کی طالب بن جائے تو کش مکشِ حیات میں وہ کبھی ثابت قدم نہیں رہ سکتی۔

شریعت ان ہی اسبابِ تباہی سے عورت کو محفوظ رکھنا چاہتی ہے، تاکہ زندگی کے کارزار میں اس کو نامرادیوں کا سامنا نہ کرنا پڑے اور وہ کامیابی کے ساتھ اپنے فرائض پورے کر سکے۔

حضرت جابر بن عبد اللہؓ کہتے ہیں کہ میری خالہ کو ان کے شوہر نے طلاق

---

[1] مسلم، کتاب اللباس والزینۃ، باب النساء الکاسیات الخ

[2] بخاری، کتاب اللباس، باب وصل الشعر۔ مسلم، کتاب اللباس والزینۃ

دے دی (طلاق کے بعد ان کو عدت کے دن گھر ہی میں گزارنے چاہیے تھے۔ لیکن انھوں نے عدت کے دوران ہی میں) اپنے کھجور کے چند پیڑ کاٹنے (اور فروخت کرنے کا) ارادہ کیا تو ایک صاحب نے سختی سے منع کیا۔ (کہ اس مدت میں گھر سے نکلنا جائز نہیں ہے) وہ حضور اکرم ﷺ کی خدمت میں استفسار کے لیے گئیں تو آپ نے جواب دیا:

اُخْرُجِیْ فَجُدِّیْ نَخْلَکِ لَعَلَّکِ اَنْ تَصَدَّقِیْ مِنْہُ اَوْ تَفْعَلِیْ خَیْرًا[1]

کھیت جاؤ اور اپنے کھجور کے درخت کاٹو (اور فروخت کرو) اس رقم سے بہت ممکن ہے تم صدقہ و خیرات یا اور کوئی بھلائی کا کام کرسکو (اس طرح یہ تمہارے لیے اجر آخرت کا سبب ہوگا)۔

ان الفاظ کے ذریعے نبی ﷺ نے حضرت جابرؓ کی خالہ کو انسانیت کی بہی خواہ اور فلاح و بہبود کی ترغیب دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شریعت، عورت کو اس قابل دیکھنا چاہتی ہے کہ وہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کی خدمت کرسکے اور اس کے ہاتھوں بھلے کام انجام پائیں۔

گھر سے باہر سعی و جہد کی اجازت

اس حدیث سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ پاکیزہ مقاصد کے حصول اور امورِ خیر کی تکمیل کے لیے عورت گھر سے باہر نکل سکتی ہے اور یہ کہ دورِ اول کی خواتین ضرورت پر بازار اور کھیت وغیرہ آیا جایا کرتی تھیں، کیوں کہ اگر پہلے سے کوئی عمومی ممانعت ہوتی تو حضرت جابرؓ کی خالہ کھیت جانے کا قصد ہی نہ کرتیں اور بحث بھی یہ نہ چھڑتی کہ فلاں مخصوص حالت میں ان کا گھر سے نکلنا جائز ہے یا نہیں؟

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی المبتوتۃ تخرج بالنہار و رواہ مسلم و ابن ماجہ۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ عورت معاشی ضرورت کے تحت زمانۂ عدت میں گھر سے باہر نکل سکتی ہے۔ یہی امام مالک، امام شافعی اور امام نووی کا مسلک ہے۔ نووی، شرح مسلم جلد ۵، جزء ۱۰، ص ۹۱

بعض دوسری روایات سے یہ بات اور واضح ہوگئی ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا احکام حجاب کے نازل ہونے کے بعد کا واقعہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عمرؓ نے حضرت سودہؓ کو باہر دیکھ کر تنقید کی تو وہ (خاموشی سے) گھر واپس چلی آئیں اور حضورؐ سے اس کا تذکرہ کیا۔ اس کے فوراً بعد آپؐ پر نزولِ وحی کی سی کیفیت طاری ہوگئی۔ جب یہ کیفیت ختم ہوئی تو آپؐ نے فرمایا:

اِنَّہٗ اَذِنَ لَکُنَّ اَنْ تَخْرُجْنَ لِحَاجَتِکُنَّ[1] بے شک اللہ تعالیٰ نے تمہیں اپنی ضروریات کے لیے گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی ہے۔

اس کی عملی سرگرمیوں نے تو اس امر کے قطعی اور یقینی شواہد فراہم کردیے ہیں کہ اس نے امورِ خانہ داری کے علاوہ دوسری بہت سی مصروفیات اندرونِ خانہ و بیرونِ خانہ جاری رکھیں اور اسلامی معاشرہ کبھی ان میں حائل نہیں ہوا۔

کاشت کاری

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی خالہ کا واقعہ کھیتی باڑی کے کاموں سے ان کے تعلق کا پتہ دیتا ہے، جس کا ذکر ابھی گزر چکا ہے۔

سہل بن سعدؓ ایک خاتون کا ذکر کرتے ہیں، جن کی اپنی کھیتی تھی اور وہ پانی کی نالیوں کے اطراف میں چقندر کی کاشت کیا کرتی تھیں۔ جمعہ کے دن سہل بن سعدؓ اور بعض دیگر صحابہ ان سے ملاقات کے لیے جاتے تو وہ چقندر اور آٹے سے تیار کردہ حلوہ ان کو کھلاتیں[2]

حضرت ابوبکرؓ کی صاحبزادی اسماءؓ اپنا ابتدائی حال بیان کرتی ہیں کہ حضرت زبیرؓ سے میرا بیاہ ہوچکا تھا۔ لیکن ان کے پاس پانی لانے والے ایک اونٹ اور ایک گھوڑے

۱؎ بخاری، کتاب التفسیر، سورۃ الاحزاب، باب قولہ لا تدخلوا بیوت النبی الخ۔ مسند احمد، ۷/ ۸۴، حدیث عائشہ، حدیث نمبر ۲۳۷۶۹

۲؎ بخاری، کتاب الجمعۃ، باب قولہ تعالیٰ فاذا قضیت الصلوٰۃ الخ

کے سوا نہ تو کسی قسم کا مال تھا نہ خادم اور نہ کوئی دوسری چیز۔ میں خود ہی ان کے گھوڑے کو چارہ دیتی، پانی پلاتی اور اس کا ڈول بھرتی (گھر کا کام کاج بھی مجھ ہی کو کرنا پڑتا، چناں چہ) مجھے خود ہی آٹا گوندھنا اور روٹی پکانی پڑتی۔ میں روٹی اچھی نہیں پکا پاتی تھی۔ پڑوس میں انصار کی کچھ عورتیں تھیں جو اپنی دوستی میں بڑی مخلص ثابت ہوئیں، وہ میری روٹی پکا دیا کرتی تھیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیرؓ کو میرے مکان سے دو میل کے فاصلہ پر ایک زمین کاشت کرنے اور فائدہ اٹھانے کے لیے دے رکھی تھی۔ میں اس زمین سے کھجور کی گٹھلیاں لایا کرتی تھی۔ ایک دن میں اپنے سر پر کھجور کی گٹھلیوں کی ٹوکری لیے آ رہی تھی کہ راستہ میں رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوگئی۔ آپؐ نے مجھے بلایا، تاکہ اپنی سواری کے پیچھے بٹھا لیں۔ لیکن چوں کہ آپؐ کے ساتھ انصار کے بعض افراد بھی تھے اس لیے مجھے مردوں کے ساتھ چلنے میں شرم محسوس ہوئی، ساتھ ہی حضرت زبیر بھی یاد آ گئے کہ وہ انتہائی غیور انسان ہیں، اس کو پسند نہیں کریں گے۔ چناں چہ میں پس و پیش کرنے لگی تو حضورؐ نے بھانپ لیا اور آگے بڑھ گئے۔[۱]

تجارت

خواتین کی تعلیم و تربیت اور اس کے نتائج کے تحت ایک سبزی فروش باندی کا تذکرہ آ چکا ہے۔

قیلہؓ (ام بنی انمار) نامی ایک صحابیہ نے نبی ﷺ سے عرض کیا "انی امرأة ابیع و اشتری" میں ایک عورت ہوں جو مختلف چیزیں فروخت کرتی اور خریدتی رہتی ہوں (یعنی تاجر ہوں) اور پھر آپؐ سے خرید و فروخت سے متعلق مسائل دریافت کیے۔[۲]

حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت کا واقعہ گزر چکا ہے کہ اسماء بنت مخرمہؓ کو ان کے لڑکے عبداللہ بن ابی ربیعہ یمن سے عطر روانہ کرتے تھے اور وہ اس کا کاروبار کرتی تھیں۔[۳]

---

[۱] بخاری، کتاب النکاح، باب الغیرة

[۲] ابن سعد، طبقات: ۳۱۰/۸۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۲۹۱/۸

[۳] طبقات ابن سعد، جلد ۸، صفحہ ۲۲۰، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، ۳۹۶/۴

عمرہ بنت طبیخؒ کہتی ہیں کہ ایک مرتبہ اپنی لونڈی کے ساتھ بازار جا کر میں نے مچھلی خریدی اور اس کو جھولے میں رکھا (لیکن چوں کہ جھولا چھوٹا تھا) اس لیے مچھلی کا سر اور دُم باہر نکلی ہوئی تھی۔ حضرت علیؓ کا ادھر سے گزر ہوا تو دیکھ کر پوچھا: کتنے میں خریدی ہے؟ یہ تو بہت بڑی بھی ہے اور نفیس بھی۔ اس سے گھر کے سب لوگ سیر ہوکر کھا سکتے ہیں[1]

صنعت وحرفت

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی بیوی ریطہ صنعت وحرفت سے واقف تھیں۔ اس کے ذریعے اپنے اور اپنے خاوند اور بچوں کے اخراجات بھی پورے کرتی تھیں۔ ایک دن آں حضرتﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا:

اِنِّیْ اِمْرَأَۃٌ ذَاتُ صَنْعَۃٍ اَبِیْعُ مِنْھَا وَ لَیْسَ لِیْ وَ لاَ لِزَوْجِیْ وَلاَ لِوَلَدِیْ شَیْءٌ

میں ایک کاریگر عورت ہوں۔ چیزیں تیار کرکے فروخت کرتی ہوں (اس طرح میں کما سکتی ہوں، لیکن) میرے شوہر اور بچوں (کا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے اس لیے) ان کے پاس کچھ نہیں ہے۔

اور دریافت کیا کہ کیا وہ ان پر خرچ کرسکتی ہیں۔ آپ نے جواب دیا، ہاں! تم کو اس کا اجر ملے گا[2]

اسی قسم کا ایک اور واقعہ ابن سعد نے ذکر کیا ہے۔ خولہ بنت ثعلبہؓ سے ان کے شوہر نے ایک مرتبہ غیرارادی طور پر کہہ دیا کہ آج سے تمھاری حیثیت میری ماں کی سی ہے۔ بعد میں دونوں مسئلہ دریافت کرنے رسول اللہﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ چوں کہ اس وقت تک اس مسئلہ میں کوئی حکم نازل نہیں ہوا تھا، اس لیے آپ نے شوہر کو حکم دیا کہ اجازت ملنے تک تم اپنی بیوی سے الگ رہو۔ یہ سن کر بیوی نے کہا:

---

[1] ابن سعد، طبقات: ۸ / ۴۸۸

[2] ابن سعد. الطبقات: ۸ / ۲۹۰۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸ / ۱۴۸

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ مَا لَهٗ مِنْ شَیْءٍ وَمَا يُنفِقُ عَلَيْهِ اِلَّا اَنَا[1]

اللہ کے رسول! ان کے پاس تو خرچ کے لیے کچھ بھی نہیں ہے، میں ہی ان پر خرچ کرتی ہوں (پھر وہ مجھ سے الگ رہ کر کس طرح زندگی گزار سکتے ہیں؟)

بہ ظاہر خولہ بنت ثعلبہؓ کا کوئی ذریعۂ آمدنی ہوگا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ انھوں نے کوئی صنعت اختیار کی ہو، جس کی آمدنی سے وہ اپنے اور اپنے شوہر کے مصارف برداشت کرتی ہوں۔

حقوق کی حفاظت

اسلامی معاشرہ نے عورت کو جو حقوق و مراعات عطا کیے ہیں ان سے اس نے فائدہ بھی اٹھایا ہے اور جہاں کہیں دیکھا کہ اس کے حقوق تلف کیے جا رہے ہیں، یا اس پر کسی قسم کی زیادتی ہو رہی ہے تو اس نے اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے پوری بصیرت کے ساتھ جدوجہد بھی کی ہے اور اسلامی قانون نے ایسے تمام مواقع پر اس کو کامیاب بنایا ہے۔

حضرت عائشہؓ کی روایت ہے۔ ایک صاحب نے اپنی لڑکی کا نکاح ایک مال دار شخص سے کر دیا، لیکن لڑکی اس کو پسند نہیں کرتی تھی۔ اس نے حضورؐ سے عرض کیا:

اِنَّ اَبِیْ زَوَّجَنِیْ ابْنَ اَخِیْهِ لِیَرْفَعَ بِیْ خَسِیْسَتَهٗ.

میرے والد نے میری شادی اپنے ایک دولت مند بھتیجے سے کردی ہے، تاکہ میرے ذریعے اپنی کشائش کا سامان کریں۔

آپؐ نے فرمایا: اگر تجھ کو یہ عقد پسند نہیں ہے تو تو آزاد ہے۔ اس نے کہا:

قَدْ اَجَزْتُ مَا صَنَعَ اَبِیْ وَ لٰكِنْ اَرَدْتُّ اَنْ تَعْلَمَ النِّسَاءُ اَنْ لَيْسَ لِلْاٰبَاءِ مِنَ الْاَمْرِ شَیْءٌ[2]

میرے والد نے جو اقدام کیا ہے اس کو بحال کرتی ہوں، میں نے چاہا کہ عورتوں کو یہ معلوم ہوجائے کہ ان کی مرضی کے خلاف باپوں کو ان کے نکاح کا حق نہیں ہے۔

---

[1] ابن سعد، طبقات: ۸/۳۷۸

[2] مسند احمد: ۷/۱۹۶۔ حدیث عائشہ، حدیث: ۲۴۵۲۲۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب من زوّج ابنتہ وہی کارہۃ

یہ گویا ایک عورت کا اپنے باپ کی زیادتی کے خلاف کامیاب احتجاج تھا۔

بریرہؓ ایک باندی تھیں، جن کا نکاح مغیث نامی ایک غلام سے ہوا تھا۔ ایک عرصہ بعد بریرہؓ آزاد ہوگئیں تو انھوں نے مغیثؓ کے نکاح میں رہنے سے انکار کر دیا، کیوں کہ شریعت کی رو سے آزاد عورت کا غلام کے عقد میں رہنا ضروری نہیں ہے۔ لیکن مغیث بریرہؓ سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ بریرہؓ کے اس فیصلہ کے بعد زار و قطار روتے ہوئے ان کے پیچھے پیچھے دوڑتے پھرتے تھے۔ رحمتِ عالم نے یہ منظر دیکھ کر بریرہؓ سے کہا:

يَا بَرِيْرَةُ اِتَّقِي اللّٰهَ فَاِنَّهٗ زَوْجُكِ وَ اَبُوْ وَلَدِكِ	بریرہ، خدا سے ڈر (اور اس کی محبت و بے قراری کا خیال کر) وہ کل تک تیرا شوہر رہا ہے اور اس سے اولاد بھی ہوچکی ہے۔

بریرہؓ نے دریافت کیا: اَتَاْمُرُنِیْ بِذٰلِکَ؟ ”کیا آپ مجھے اس کے عقد میں رہنے کا حکم دے رہے ہیں؟“ آپؐ نے جواب دیا: لاَ، اِنَّمَا اَنَا شَافِعٌ ”نہیں! میں اس کا حکم کیسے دے سکتا ہوں؟ میں تو تم سے سفارش کر رہا ہوں۔“ اس نے کہا: فَلاَ حَاجَةَ لِیْ فِیْهِ ”تو مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔“[1]

غور کیجیے! اسلامی حکومت کی باندی، ایک تو اس نازک فرق کو اچھی طرح سمجھتی تھی جو نبی کے حکم اور سفارش کے درمیان ہوتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کو مکمل یقین تھا کہ وہ صحیح طریقہ پر اپنے حق کے لیے جو سعی کرے گی، قانون اس کو ناکام نہیں ہونے دے گا۔

دورِ رسالت میں خواتین، نماز میں شرکت کے لیے مسجد میں آتی تھیں، لیکن بعض اسباب کے تحت حضرت عمرؓ نے محسوس کیا کہ گھروں سے باہر ان کی آمد و رفت مناسب نہیں ہے۔ چوں کہ رسول اللہ ﷺ کی جانب سے اس کی اجازت حاصل تھی، اس لیے قانوناً کوئی پابندی بھی لگانا نہیں چاہتے تھے۔ خود حضرت عمرؓ کی بیوی عاتکہؓ اس

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی مملوکۃ تعتق الخ

اجازت سے فائدہ اٹھا کر جماعت میں شریک ہوتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے ان سے کہا:

وَ اللّٰهِ اِنَّکِ لَتَعْلَمِیْنَ اَنِّیْ مَا اُحِبُّ هٰذَا. "قسم خدا کی، تم جانتی ہو کہ تمہارا یہ فعل مجھے پسند نہیں ہے (لیکن اس کے باوجود تم اس سے باز نہیں آتیں)۔

انھوں نے جواب دیا:

وَاللّٰهِ لاَ اَنْتَهِیْ حَتّٰی تَنْهَانِیْ واللہ جب تک آپ مجھے مسجد جانے سے حکماً نہیں روکیں گے میں رکوں گی نہیں۔

روایات میں آتا ہے کہ انھوں نے حضرت عمرؓ کی زندگی بھر اپنا طریقہ نہیں چھوڑا، جس دن مسجد میں حضرت عمرؓ پر قاتلانہ حملہ ہوا اس دن بھی وہ وہاں موجود تھیں[۱]

بالفاظِ دیگر عاتکہؓ حضرت عمرؓ سے یہ کہہ رہی ہیں کہ بحیثیت شوہر کے آپ کو یہ حق ہے کہ مجھے گھر سے باہر جانے کی اجازت نہ دیں اور مجھ پر اس کی اتباع بھی ضروری ہوگی، لیکن جہاں تک آپ کی خواہش کا تعلق ہے، میں اس کی پابند نہیں ہوں۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ عاتکہؓ کا یہ عمل قابلِ ستائش تھا یا نہیں۔ اس وقت جس حقیقت کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے، وہ ہے ایک عورت کا اتنے معمولی سے حق پر اصرار اور اس کی کامیابی۔ عاتکہؓ شریعت کی ایک رعایت سے فائدہ اٹھانا چاہتی ہیں، لیکن اسے بہتر نہ سمجھنے کے باوجود حضرت عمرؓ کو یہ گوارا نہیں کہ ان کو زبردستی اس سے محروم کردیں۔ حالاں کہ آپؓ، عاتکہؓ کے شوہر اور اس سے بھی آگے خلیفۂ وقت تھے۔ اس لیے آپ کو بجا طور پر اس کا حق تھا کہ بیوی کے جس عمل کو خلافِ مصلحت دیکھیں اس پر قدغن لگا دیں۔ اس چھوٹے سے واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں عورت کے حقوق کا کتنا اور کہاں تک احترام کیا جاتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے آپؐ کی ازواجِ مطہرات نے ایک مرتبہ بہتر اور خوش حال

۱۔ بخاری، کتاب الجمعۃ، باب ہل علی من لم یشہد الجمعۃ غسل الخ مع فتح الباری جلد ۲، ص ۲۶۱

زندگی کا مطالبہ کیا۔ چوں کہ یہ مطالبہ ان کی حیثیت سے فروتر اور خود آپ جس طرزِ زندگی کو اپنائے ہوئے تھے، اس کے منافی تھا، اس لیے آپؐ کو سخت صدمہ ہوا اور آپؐ نے ازواج سے ایک مہینہ تک قطعِ تعلق کا فیصلہ کر لیا۔ اس کی اطلاع جب حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کو ملی تو بے حد پریشان ہوئے اور اپنی صاحبزادیوں (حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ) کو سختی اور نرمی ہر طرح سے سمجھایا کہ تمہارا یہ تقاضا صحیح نہیں ہے۔ اس کے بعد دیگر ازواجِ مطہرات کو بھی سمجھانا شروع کیا۔ یہاں تک کہ حضرت ام سلمہؓ کے پاس پہنچے تو انھوں نے کہا:

مَا لَکُمَا وَ لِمَا هٰهُنَا؟ رَسُوْلُ اللّٰهِ اَعْلٰی بِاَمْرِنَا عَیْنًا وَ لَوْ اَرَادَ اَنْ یَّنْهَانَا لَنَهَانَا فَمَنْ نَسْأَلُ اِذَا لَمْ نَسْأَلُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ هَلْ یَدْخُلُ بَیْنَکُمَا وَ بَیْنَ اَهْلِیْکُمَا اَحَدٌ فَمَا نُکَلِّفُکُمَا هٰذَا[1]

آپ حضرات کا یہاں کیا کام ہے؟ رسول اللہ ہمارے حالات سے بخوبی واقف ہیں۔ اگر آپ ہمیں منع کرنا چاہیں تو منع کر سکتے ہیں (پھر ہم مطالبہ نہیں کریں گے) اگر ہم رسول اللہ سے مطالبہ نہ کریں تو کس سے کریں؟ کیا آپ حضرات اور آپ کی بیویوں کے معاملات میں بھی کوئی شخص اسی طرح مداخلت کرتا ہے؟ آپ تشریف لے جائیں، ہم آپ کو اس کی تکلیف نہیں دے رہے ہیں۔

دیکھیے، خاوند اور بیوی کے تعلقات کے درمیان حضرت ام سلمہؓ بڑے سے بڑے آدمی کی مداخلت کو بھی گوارا نہیں کر رہی ہیں اور شوہر سے جائز راحت و آسائش کے مطالبہ کا ہر عورت کو حق دینا چاہتی ہیں۔

اجتماعی مفاد کے لیے کوشش

ان واقعات سے یہ استدلال تو صحیح ہوگا کہ اسلامی معاشرہ عورت پر ظلم و زیادتی

---

[1] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۸/ ۱۸۰۔ صحیح مسلم، کتاب الطلاق۔ ابن سعد کی بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ام سلمہؓ سے ملاقات کی تھی، لیکن چوں کہ مذکورہ بالا روایت میں حضرت ابوبکرؓ کا بھی ذکر ہے اور ساتھ ہی اس سے ام سلمہؓ کا جواب واضح طور پر سامنے آتا ہے، اس لیے یہاں اسی کو درج کیا گیا ہے۔

کو بہرے کانوں سے نہیں سنتا اور اندھی آنکھوں سے نہیں دیکھتا، بلکہ وہ اس کے حقوق کا پاسبان و محافظ ہوتا ہے اور عدل و انصاف کے لیے اس کی ہر صدا کا جواب دینا اپنا فرض سمجھتا ہے، لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ چودہ سو سال قبل کی اسلامی ریاست میں، جسے ہم نمونتاً پیش کرتے ہیں، عورت کو ہر وقت ایک ظالم حریف سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا اور اس نے اپنی زندگی اس کے جور و ستم کے مٹانے میں لگادی، کیوں کہ یہ ایسا نتیجہ ہے، جس سے اسلامی تاریخ انکار کرتی ہے۔ اس نے ثابت کر دیا ہے کہ اپنے مفاد کے لیے جنگ اسلامی معاشرہ کے مزاج کے خلاف ہے۔ وہ ایک دوسرے سے برسرِ پیکار اور متصادم طبقات اور گروہوں کے بجائے ایسے افراد کا مجموعہ تھا جن کے درمیان الفت و محبت کا رشتہ قائم تھا۔ اس کے خلاف اگر کوئی واقعہ ملتا ہے تو اسے کسی کو ضرر رسانی کی بالارادہ کوشش نہیں قرار دیا جاسکتا، بلکہ اس کی حیثیت اتفاقی حادثہ اور غیر شعوری لغزش سے زیادہ کچھ نہیں ہوگی۔ اس کا ثبوت ہمیں ان بے شمار خدمات سے ملتا ہے جو خواتین نے معاشرہ کے مفاد اور اس کی بقا و تحفظ کے لیے انجام دی ہیں۔ ان خدمات کے پیچھے شخصی منفعت کے بجائے جماعت کی خیر خواہی اور اس کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ کارفرما رہا ہے۔ اس کا ثبوت آپ کو آئندہ باب میں ملے گا۔



☆ اسلامی معاشرے کی تعمیر میں عورت کا کردار
☆ عورت کی فکری صلاحیت
☆ عورت کی عملی صلاحیت
☆ عورت اور منصبِ امامت

اسلامی معاشرہ کی تعمیر میں عورت کا کردار

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ مسلمان خواتین نے اپنے دین کے لیے بڑی بڑی قربانیاں دیں۔ اس کے لیے انھوں نے قریب ترین تعلقات اور رشتوں پر چھری پھیر دی۔ خاندان اور قبیلہ سے جنگ مول لی، مصیبتیں سہیں، گھر بار چھوڑا۔ غرض یہ کہ مفادِ دین سے ان کا جو بھی مفاد ٹکرایا اسے ٹھکرانے میں انھوں نے کوئی تامل اور پس و پیش نہیں کیا اور اپنے رب سے وفاداری کا جو عہد کیا تھا آخر وقت تک اس پر کوئی آنچ نہ آنے دی۔

مسلمان خواتین کی قربانیاں

مکہ کے ابتدائی دور میں جن سعادت مند اور باہمت نفوس نے ایمان قبول کیا تھا ان میں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا خاندان بھی تھا۔ ان کی والدہ سمیہ بنت خُبّاط، ابوحذیفہ بن مغیرہ کی باندی تھیں، ان کو دین سے پھیرنے کے لیے ہر طرح کی اذیت دی جاتی رہی۔ ایک وقت وہ بھی آیا کہ ابوجہل نے جرمِ حق کی پاداش میں نیزہ مار کر ان کو شہید کر دیا، لیکن ان کے پائے ثبات میں کوئی لغزش نہیں آئی۔ یہ پہلی شہادت تھی جو حضور ﷺ کے پیغام پر لبیک کہنے کے نتیجے میں کسی کو نصیب ہوئی۔[1]

---

[1] ابن سعد، طبقات: ۸ / ۲۶۴

حضرت عمرؓ کی بہن فاطمہؓ بنت خطاب ایمان لے آئیں تو حضرت عمرؓ نے ان کو اس قدر زد و کوب کیا کہ لہولہان ہوگئیں، لیکن اس کے باوجود اپنے مولیٰ سے جو عہدِ وفا باندھا تھا اس میں کوئی کم زوری نہ آنے پائی۔ حضرت عمرؓ کی سختی کے جواب میں کہتی ہیں:

يَا ابْنَ الْخَطَّابِ مَا كُنْتَ صَانِعًا فَاصْنَعْهُ فَإِنِّيْ قَدْ اَسْلَمْتُ

ابن خطاب! میں تو ایمان قبول کر چکی، اب جو چاہو کر گزرو (میں اس سے پھر نہیں سکتی)

حضرت عمرؓ نے قرآن کو ہاتھ میں لینا چاہا تو کہا:

دَعْنَا عَنْكَ يَا ابْنَ الْخَطَّابِ اَنْتَ لاَ تَغْتَسِلُ مِنَ الْجَنَابَةِ وَ هٰذَا لاَ يَمَسُّهُ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ[۱]

ابن خطاب اس کو رکھ دو، کیوں کہ تم جنابت سے پاکی نہیں حاصل کرتے اور یہ وہ کتاب ہے، جس کو پاک لوگ ہی چھو سکتے ہیں۔

ابوسفیانؓ کے ایمان لانے سے قبل کا واقعہ ہے کہ وہ نبی ﷺ کی خدمت میں مدینہ حاضر ہوئے تو اپنی بیٹی ام المومنین ام حبیبہؓ سے بھی ملنے گئے۔ گھر میں ذاتِ اقدس کا بستر بچھا ہوا تھا۔ وہ اس پر بیٹھنے لگے تو بیٹی نے فوراً اس کو تہ کر دیا۔ باپ کے لیے یہ حرکت سخت تعجب خیز تھی۔ پوچھا، کیا تم نے اس کو میرے شایانِ شان نہ سمجھ کر ہٹا دیا یا مجھے اس قابل نہ سمجھا کہ اس پر بیٹھوں؟ بیٹی نے جواب دیا: یہ رسولِ خدا کا بستر ہے اور آپ مشرک اور نجس ہیں، میں اس مقدس بستر پر آپ کو بٹھا کر اس کو ناپاک کرنا نہیں چاہتی۔[۲]

قرآن مجید کا حکم ہے کہ خدا کے دشمنوں اور محاربین سے اہل ایمان کو کسی قسم کا تعلق نہیں رکھنا چاہیے۔ ایک مرتبہ حضرت اسماءؓ کی مشرک والدہ قتیلہ بنت عبد العزی، تحفے تحائف لیے ہوئے مکہ سے مدینہ ان کے گھر آئیں، حضرت اسماءؓ نے ماں کے تحفوں

۱۔ حاکم، المستدرک: ۴/ ۶۶، حدیث نمبر ۶۸۹۸۔ امام ذہبی نے اس روایت کی سند پر جرح کی ہے، لیکن مختلف محدثین و مورخین نے تھوڑے سے فرق کے ساتھ اس واقعہ کو کئی ایک سندوں سے نقل کیا ہے۔ جیسے ابن ہشام، السیرۃ النبویہ: ۱/ ۳۸۲۔ حلبی، السیرۃ الحلبیہ: ۲/ ۱۲، ۲۰ بعض حوالے ابن حجر نے نقل کیے ہیں۔ ملاحظہ ہو، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/ ۲۷۱

۲۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۸/ ۱۰۰

کو قبول کرنے، بلکہ ان کو اندر آنے کی اجازت دینے سے قبل رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ کیا میں ان کو اپنے گھر ٹھہرا سکتی ہوں؟ اور یہ کہ وہ مجھ سے مدد اور ہمدردی کی توقع رکھتی ہیں۔ کیا ان کے ساتھ تعاون اور حسنِ سلوک میرے لیے جائز ہے؟ حضور ﷺ نے جواب دیا: ہاں! تمھارے لیے یہ دونوں باتیں جائز ہیں۔[1]

رقیقہ بنت ابی صیفیؓ نے مکہ کے نازک ترین دور میں صدائے حق پر لبیک کہی تھی۔ قریش نے رسولِ اکرم ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا تو انھوں نے ہی آپ کو قبل از وقت متنبہ کیا کہ آپ پر شب خون مارنے کا فیصلہ ہو چکا ہے (لہٰذا آپ اپنی حفاظت کا سامان فرمالیں) چناں چہ آپ راتوں رات مکہ سے مدینہ ہجرت فرما گئے۔

یہ ایمان لا چکی تھیں، لیکن ان کے لڑکے مخرمہ ابھی حالتِ کفر ہی پر قائم تھے۔ اپنی اولاد ہونے کی وجہ سے مومن ماں نے بیٹے کی اس بے دینی کی روش کو ہنسی خوشی برداشت نہیں کیا، بلکہ ماں کی مامتا پر ہمیشہ جذباتِ ایمانی غالب رہے اور مخرمہ کے ساتھ انتہائی سخت روش روا رکھی۔[2]

جن لوگوں نے حضرت عائشہؓ پر افترا پردازی میں حصہ لیا ان میں مسطحؓ بن اثاثہ بھی تھے، ان کی ماں کے ایمانی تقاضوں نے اس کی اجازت نہ دی کہ بیٹے کی اس غلط حرکت کو گوارا کرلیں یا کم از کم تاویل و توجیہ کے پردوں میں اس کو چھپا دیں۔ ابن سعد نے لکھا ہے:

كَانَتْ مِنْ اَشَدِّ النَّاسِ عَلٰى مِسْطَحٍ حِيْنَ تَكَلَّمَ مَعَ اَهْلِ الْاِفْكِ فِىْ عَائِشَةَ.[3]	مسطح نے جب حضرت عائشہؓ پر افترا پردازی کرنے والوں کے ساتھ تہمت باندھنے میں حصہ لیا تو یہ ان پر اور تمام لوگوں سے زیادہ سخت تھیں۔

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب صلۃ الوالد المشرک۔ طبقات، جلد ۸، ص ۱۶۸۔ امام بخاری اور ابن سعد میں سے ہر ایک نے واقعہ کا صرف ایک ایک پہلو بیان کیا ہے، ہم نے دونوں کی روایات کو سامنے رکھا ہے۔

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۸/ ۵۱، ۵۲

[3] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۸/ ۲۲۸

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت ان کے اس غیر شرعی اور ناروا عمل پر پیچ و تاب کھاتی اور غم و غصہ کا اظہار کرتی تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ کے ساتھ باہر سے گھر آ رہی تھیں کہ پیر میں چادر الجھ گئی تو ایک دم وہی اندرونی جذبات اُبھر آئے اور بیٹے کو بد دعا دینے لگیں۔ حضرت عائشہؓ کو اس وقت تک مسطح کی اس حرکت کا علم نہیں تھا اس لیے وہ مدافعت کرنے لگیں، تو انھوں نے ان افواہوں کا ذکر کیا جو مدینہ کی فضا میں گشت کر رہی تھیں[۱]

جنگی خدمات

شریعت نے ریاست کے دفاع اور اس کی حفاظت کی ذمے داری، جیسا کہ اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے، عورت پر نہیں ڈالی ہے۔ لیکن اس کے باوجود خدا کے دین کو سر بلند دیکھنے کی تمنا بعض اوقات اس کو دشمن کے خلاف محاذِ جنگ پر لے آتی اور مردوں کے ساتھ وہ بھی کفر کا علم سرنگوں کرنے میں حصہ لیتی۔

ایک انصاری صحابیہ اُمِّ عمارہؓ نے جنگِ اُحد میں مردوں کی سی ثبات قدمی اور بے باکی کا مظاہرہ کیا۔ سعد بن ربیع کی صاحب زادی ام سعد نے ان سے اس کارنامہ کے متعلق دریافت کیا تو تفصیل سے بتایا کہ میں صبح سویرے ہی مجاہدین کی خدمت کے لیے میدانِ کارزار میں پہنچ گئی تھی۔ ابتدا میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا، لیکن بعد میں جب فتح و نصرت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو ان میں افراتفری اور انتشار پھیل گیا۔ اس وقت حضورِ اکرم ﷺ کے قریب پہنچ کر آپؐ کے دفاع میں تیر اور تلوار چلانے لگی۔ یہاں تک کہ دشمن کی ضرب مجھ پر آن پڑی۔ ام سعد کہتی ہیں کہ میں نے ان کے کندھے پر بہت ہی گہرے زخم کا نشان دیکھا اور پوچھا: کس نے آپ پر اتنا سخت حملہ کیا تھا۔ انھوں نے جواب دیا: ابن قمیئہ نے، خدا اسے غارت کرے! جب مسلمان شکست کھا کر حضورؐ کے پاس سے بھاگ کھڑے ہوئے تو یہ چلاّتا ہوا آیا: بتاؤ، محمد (ﷺ) کہاں ہے؟ اگر وہ

---

[۱] بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک

اس جنگ میں بچ گیا تو میری نجات نہیں۔ یہ میری ہلاکت اور موت ہے۔ یہ سن کر میں اور مصعب بن عمیرؓ اور چند دوسرے اصحاب نے، جو آپ کے ساتھ جمے ہوئے تھے، اس کا سامنا کیا۔ اس مقابلہ میں اس نے مجھ پر یہ وار کیا، جس کا نشان تم دیکھ رہی ہو۔ میں نے بھی تلوار سے کئی ایک حملے اس پر کیے۔ لیکن دشمنِ خدا دو دو زرہیں پہنے ہوئے تھا۔[1]

رسول اللہ ﷺ کی مدافعت میں انھوں نے جس ہمت اور پامردی کا ثبوت دیا اس کی شہادت خود آپؐ نے ان الفاظ میں دی ہے:

مَا الْتَفَتُّ یَمِیْنًا وَلاَ شِمَالاً اِلاَّ وَ اَنَا اَرَاھَا تُقَاتِلُ دُوْنِیْ۔

دائیں بائیں جس طرف بھی میں نے رُخ کیا ام عمارہ کو میری مدافعت میں لڑتے دیکھا۔

ان کے صاحب زادے کو ایک شخص نے گھائل کر دیا، جب اس کا ادھر گزر ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے کہا: امّ عمارہ! یہ ہے تمہارے بیٹے کو زخمی کرنے والا! اور یہ اس پر ٹوٹ پڑیں اور اتنی زور سے تلوار چلائی کہ وہ وہیں گر پڑا۔ حضورؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا: امّ عمارہ! تم نے اپنے بیٹے کا بدلہ لے لیا۔ خود کہتی ہیں: اس کے بعد ہم مسلسل تیر برسانے لگے۔ یہاں تک کہ اس کو ختم کر کے چھوڑا۔ یہ دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا: خدا کا شکر کہ اس نے تجھ کو اس پر غلبہ عطا کیا اور تیری آنکھوں کو ٹھنڈک بخشی اور تیرے لڑکے کا بدلہ تجھ کو دکھایا۔

ایک اور واقعہ بیان کرتی ہیں کہ ایک شہسوار آگے بڑھتے ہوئے آیا اور مجھ پر وار کیا۔ میں نے ڈھال پر اس کو روک کر ناکام بنا دیا۔ جب وہ پیٹھ پھیر کر بھاگنے لگا تو میں نے اس کے گھوڑے پر حملہ کر کے اس کے پیر کاٹ دیے اور وہ پشت کے بل گر پڑا۔ حضورؐ اس کو ملاحظہ فرما رہے تھے۔ آپ نے میرے لڑکے کو آواز دی: امّ عمارہ کے بیٹے! جاؤ اپنی ماں کی مدد کرو۔ چناں چہ وہ دوڑا ہوا آیا اور اس کی مدد سے میں نے اس کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

اس دن ان کے جماؤ اور ثابت قدمی کو دیکھ کر حضورؐ نے فرمایا:

---

[1] ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۳/۹۱۔ ابن سعد، طبقات: ۸/ ۴۱۳

لَمَقَامُ نَسِيبَةَ بِنْتِ كَعْبٍ الْيَوْمَ خَيْرٌ مِّنْ مَقَامِ فُلَانٍ وَ فُلَانٍ. آج نسیبہ بنت کعب (ام عمارہ) کی ثابت قدمی اور استقلال فلاں اور فلاں سے بہتر ہے۔

ذرا اس جرأت اور ہمت کو دیکھئے کہ بدن پر نیزے اور شمشیر کے ایک دو نہیں، بارہ زخم آ چکے ہیں اور ابن قمیہ نے جو وار کیا تھا وہ اتنا گہرا تھا کہ اس کے بھرنے ہی میں ایک سال لگ گیا، لیکن اس کے باوجود حضور ﷺ نے اُحد کے فوراً ہی بعد مشرکین کے مقابلہ کے لیے حمراء الاسد نامی مقام کی طرف چلنے کا حکم دیا تو یہ کمربستہ ہوگئیں، لیکن کافی خون نکلنے کی وجہ سے اس قدر کمزور ہوچکی تھیں کہ مجبوراً نہیں چل سکیں اور مدینہ لوٹ گئیں۔ حضورؐ حمراء الاسد سے واپس ہوئے تو قبل اس کے کہ گھر تشریف لے جاتے، ان کی مزاج پرسی کرائی۔ جب خیریت معلوم ہوئی تو بہت مسرور ہوئے۔

احد کے علاوہ انھوں نے خیبر، حنین اور یمامہ کی جنگ میں بھی شرکت کی تھی۔ یمامہ کے دن لڑتے لڑتے ان کا ہاتھ شہید ہوگیا اور اس کے علاوہ تلوار اور نیزوں کے بارہ زخم ان کے جسم پر دیکھے گئے۔[1]

رومیوں سے مسلمانوں کی جنگ میں عکرمہؓ بن ابوجہل کی بیوی ام حکیمؓ شریک تھیں۔ اجنادین کی لڑائی میں عکرمہؓ شہید ہوگئے، چند دن بعد مرجِ صفر نامی ایک مقام پر ان کا نکاح خالد بن سعیدؓ سے ہوگیا۔ نکاح کے دوسرے دن خالد بن سعیدؓ نے دعوت ولیمہ کی، ابھی لوگ دعوت سے فارغ ہونے بھی نہ پائے تھے کہ رومیوں نے صف بندی شروع کردی۔ جب گھمسان کا رن پڑا تو اُم حکیمؓ جن پر اب تک شب عروسی کے آثار نمایاں تھے، اپنے خیمے کا ایک ڈنڈا لے کر میدان میں کود پڑیں اور دشمن کے سات افراد کو اس دن موت کے گھاٹ اتار دیا۔[2]

---

[1] ان تمام تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو طبقات ابن سعد: ۸/ ۳۱۳-۳۱۵۔ یمامہ میں شرکت کا ذکر ابن عبد البر نے بھی 'الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب' میں کیا ہے۔ ۴/ ۵۰۳

[2] ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، تذکرہ ام حکیم بنت الحارث: ۴/ ۴۸۶۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/ ۳۰۹

اسماء بنت یزید کے ہاتھ سے جنگ یرموک میں نو(۹) رومیوں کو موت کا پیالہ پینا پڑا۔[۱]

ایک انصاری خاتون ام حارث کی ثابت قدمی اور شجاعت دیکھئے کہ جنگ حنین میں اسلامی فوج کے قدم میدان سے اکھڑ چکے ہیں، لیکن یہ چند باہمت نفوس کے ساتھ پہاڑ کی طرح جمی ہوئی ہیں۔[۲]

حضرت انس کی والدہ ام سلیمؓ خنجر لیے ہوئے احد میں آئی تھیں[۳] حنین میں بھی ان کے پاس خنجر تھا۔ اس طرح مسلح ہوکر آنے کا مقصد حضورؐ نے دریافت فرمایا تو جواب دیا:

اِتَّخَذْتُہٗ اِنْ دَنَا مِنِّیْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ بَقَرْتُ بِہٖ بَطْنَہٗ[۴]	میں نے اس کو اس لیے ساتھ رکھا ہے تا کہ اگر کوئی مشرک قریب ہو تو اس سے اس کا پیٹ چاک کردوں۔

رومیوں سے جہاد میں شہرت رکھنے والی نامور شخصیت حبیب بن سلمہؓ سے ان کی بیوی نے ایک جنگ کے موقع پر دریافت کیا۔ بتایئے! کل آپ کہاں ہوں گے؟ جواب دیا: یا تو دشمنوں کی صفوں کے اندر یا جنت میں۔ ان شاء اللہ۔ جواب سن کر بیوی نے بھی پورے عزم کے ساتھ کہا، ان دونوں جگہوں میں سے جہاں بھی آپ ہوں گے توقع ہے کہ میرا مقام بھی وہی ہوگا۔[۵]

غزوۂ خندق میں رسول اللہ ﷺ نے خواتین کو ایک قلعہ میں رکھا تھا تا کہ وہ محفوظ رہ سکیں، لیکن اس کے باوجود یہود تاک لگائے مسلسل قلعہ کے گرد چکر لگا رہے تھے، چناں چہ بالآخر ایک یہودی موقع پا کر قلعہ پر چڑھ ہی گیا۔ حضورؐ کی پھوپھی حضرت

۱۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۸/ ۲۲
۲۔ ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۴۸۲
۳۔ ابن سعد، طبقات: ۸/ ۴۲۵
۴۔ مسلم، کتاب الجہاد، باب غزوۃ النساء مع الرجال
۵۔ جاحظ، البیان والتبیین: ۲/ ۱۷۰

صفیہؓ قلعہ کے اندر موجود تھیں۔ وہ آگے بڑھیں اور اس بد باطن کا سر قلم کر کے نیچے، جہاں دوسرے فتنہ باز موجود تھے، پھینک دیا۔ یہ دیکھ کر وہ بالکل حیران اور ششدر رہ گئے اور کہنے لگے (محمد ﷺ) اتنا غافل نہیں ہے کہ عورتوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دے گا۔ قلعہ میں یقیناً ایسے جری اور شجاع ہیں جو ہمارے ہر ارادہ کو ناکام بنا سکتے ہیں[1]

دشمنانِ دین کو ناکام بنانے میں دورِ اول کی عورت نے جتنا براہِ راست حصہ لیا ہے اس سے کہیں زیادہ بالواسطہ باطل کی قوتوں کا مقابلہ کرتی رہی ہے۔ اگر اس نے محاذِ جنگ پر تیر نہیں چلائے ہیں تو دشمن پر ناوک فگنی کرنے والے ہاتھوں کو ناوک فراہم کیے ہیں۔ اگر اس نے تلوار نہیں اٹھائی ہے تو تیغ زنوں کو تیغ زنی کے قابل بنایا ہے۔ خدا کی راہ میں لڑنے والے زخمی ہوتے تو یہ ان کا مرہم بن جاتی، وہ گر پڑتے تو یہ ان کا سہارا ہوتی، وہ بھوکے اور پیاسے ہوتے تو یہ ان کے لیے کھانا اور پانی لیے دوڑتی۔

ربیع بنت معوذؓ کا بیان ہے:

كُنَّا نَغْزُوْ مَعَ النَّبِيِّ ﷺ فَنَسْقِي الْقَوْمَ وَ نَخْدِمُهُمْ وَ نَرُدُّ الْقَتْلٰى وَالْجَرْحٰى اِلَى الْمَدِيْنَةِ[2]

ہم نبی ﷺ کے ہمراہ جہاد پر جاتی تھیں اور (ہماری خدمات یہ ہوتیں کہ) مجاہدین کو پانی پلاتیں، ان کی خدمت کرتیں اور جنگ میں کام آنے والوں اور زخمی ہونے والوں کو مدینہ لوٹاتیں۔

ایک اور صحابیہ، جو حضورؐ کے ساتھ چھ غزوات میں شریک تھیں، بیان کرتی ہیں:

كُنَّا نُدَاوِي الْكَلْمٰى وَ نَقُوْمُ عَلَى الْمَرْضٰى.[3]

ہم زخمیوں کی مرہم پٹی اور بیماروں کا علاج معالجہ اور ان کی تیمار داری کرتی تھیں۔

---

[1] حاکم، المستدرک: ۴/ ۵۶، حدیث نمبر ۶۸۶۶، ۶۸۶۷۔ ابن حجر، الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ: ۸/ ۲۱۴

[2] بخاری، کتاب الجهاد، باب رد النساء الجرحیٰ والقتلیٰ

[3] مسند احمد: ۶/ ۸۵، ۸۶۔ حدیث ام عطیہ، نمبر ۲۰۲۶۵۔ بخاری، کتاب الحیض، باب شہود الحائض العیدین

ام عطیہؓ اپنے متعلق فرماتی ہیں:

غَزَوْتُ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم سَبْعَ غَزَوَاتٍ اَخْلُفُهُمْ فِیْ رِحَالِهِمْ فَاصْنَعُ لَهُمُ الطَّعَامَ وَ اُدَاوِی الْجَرْحٰی وَ اَقُوْمُ عَلَی الْمَرْضٰی.[1]	رسول اللہ ﷺ کے ساتھ میں نے سات غزوات میں شرکت کی، وہاں میں مجاہدین کے سامان کی نگہداشت کرتی، ان کے لیے کھانا تیار کرتی، زخمیوں کا علاج اور بیماروں کی تیمار داری کرتی۔

احد کے مجروح مجاہدین کی مرہم پٹی اور خدمت کے لیے بہت سی صحابیات جنگ کے بعد مدینہ سے گئی تھیں۔ طبرانی کی روایت ہے:

لَمَّا کَانَ یَوْمُ اُحُدٍ وَ انْصَرَفَ الْمُشْرِکُوْنَ خَرَجَ النِّسَاءُ اِلَی الصَّحَابَةِ یُعِیْنُوْنَهُمْ فَکَانَتْ فَاطِمَةُ فِیْ مَنْ خَرَجَ[2]	جس دن احد کی جنگ ہوئی (اور جنگ کے بعد) مشرکین واپس ہوگئے تو خواتین صحابہ کی معاونت کے لیے روانہ ہوئیں۔ حضرت فاطمہؓ بھی ان ہی میں تھیں۔

چناں چہ حضورؐ اس دن زخمی ہوئے تو حضرت فاطمہؓ ہی نے زخم کو چٹائی کی راکھ سے بھرا تھا[3]

حضرت انسؓ کا بیان ہے کہ جنگ احد میں حضرت عائشہؓ اور ام سلیمؓ نے بھی مجاہدین کی خدمت کی تھی:

لَقَدْ رَأَیْتُ عَائِشَةَ بِنْتَ اَبِیْ بَکْرٍ وَ اُمَّ سُلَیْمٍ وَ اَنَّهُمَا لَمُشَمِّرَتَانِ اَرٰی خَدَمَ سُوْقِهِمَا تُنْقِزَانِ الْقِرَبَ عَلٰی مَتْنِهِمَا ثُمَّ تُفْرِغَانِهٖ	میں نے عائشہ بنت ابی بکرؓ اور ام سلیمؓ کو کمربستہ (لوگوں کی خدمت کرتے ہوئے) دیکھا۔ وہ اس قدر تیزی سے دوڑ دھوپ کر رہی تھیں کہ میں نے ان کی پنڈلیوں پر کے

---

[1] مسلم، کتاب الجهاد والسیر، باب النساء الغازیات الخ۔ مسند احمد: ۶ / ۸۶، حدیث نمبر ۲۰۲۶۸

[2] ابن حجر، فتح الباری: ۸ / ۱۲۳

[3] بخاری، کتاب المغازی، غزوۃ احد، باب ما اصاب النبیؐ من الجراح یوم احد

فِیْ اَفْوَاهِ الْقَوْمِ ثُمَّ تَرْجِعَانِ فَتَمْلَاٰنِهِمَا ثُمَّ تَجِیْئَانِ فَتُفْرِغَانِهِ فِیْ اَفْوَاهِ الْقَوْمِ.[۱]	پازیب دیکھے، وہ اپنی پشت پر پانی سے بھرے ہوئے مشک لاد لاد کر لاتیں اور مجاہدین کو پلاتیں پھر واپس جاتیں اور بھر کر لاتیں اور مجاہدین کی تشنگی دور کرتیں۔

ایک انصاری خاتون ام سلیطؓ کے متعلق حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

اِنَّهَا كَانَتْ تَزْفِرُ لَنَا الْقِرَبَ يَوْمَ اُحُدٍ[۲]	احد کے دن وہ ہمارے لیے پانی سے بھرے ہوئے مشک اٹھا کر لاتی تھیں۔

حمنہ بنت جحشؓ نے بھی اس دن یہ خدمت انجام دی ہے۔ ان کے متعلق روایت ہے:

وَ شَهِدَتْ اُحُدًا فَكَانَتْ تَسْقِی الْعَطْشٰی وَ تَحْمِلُ الْجَرْحٰی وَ تُدَاوِيْهِمْ.[۳]	احد میں وہ شریک تھیں۔ پیاسوں کو پانی پلاتیں، زخمیوں کو منتقل کرتیں اور ان کا علاج کرتیں۔

اُم ایمن کے حالات میں بھی ابن سعد نے اسی قسم کی روایت نقل کی ہے:

وَ قَدْ حَضَرَتْ اُمُّ اَيْمَنَ اُحُدًا وَ كَانَتْ تَسْقِی الْمَاءَ وَ تُدَاوِی الْجَرْحٰی وَ شَهِدَتْ خَيْبَرَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم[۴]	وہ احد میں شریک تھیں اور پانی پلانے اور زخمیوں کی مرہم پٹی کرنے کی خدمت انجام دے رہی تھیں۔ حضورؐ کے ساتھ خیبر میں بھی وہ گئی تھیں۔

جنگ احد میں ام عمارہ (نسیبہ بنت کعب) کے فوجی کردار کا ذکر ان الفاظ میں ہوا ہے:

خَرَجَتْ مَعَهُمْ بِشَنٍّ لَهَا فِیْ اَوَّلِ النَّهَارِ تُرِيْدُ اَنْ تَسْقِیَ الْجَرْحٰی...	وہ زخمیوں کی (مدد کرنے اور ان کو) پانی پلانے کے ارادے سے مشکیزہ لے کر مجاہدین کے ساتھ سویرے ہی میدانِ جنگ

۱۔ بخاری، کتاب المغازی، غزوۃ احد، باب اذھمت طائفتان الخ۔ مسلم، کتاب الجہاد والسیر

۲۔ بخاری، کتاب الجہاد، باب حمل النساء القرب

۳۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/ ۷۰۔ ابن حجر، الاصابۃ: ۸/ ۸۸۔ نیز ملاحظہ ہو: الطبقات الکبریٰ: ۸/ ۲۴۱

۴۔ ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۸/ ۲۲۵

(وقال ابنه) وَ مَعَهَا عَصَائِبُ فِي حَقْوِيهَا قَدْ اَعَدَّتْهَا لِلْجِرَاحِ فَرَبَطَتْ جُرْحِي[۱]

کی طرف روانہ ہوگئی تھیں۔ ان کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ ان کی کمر میں پٹیاں تھیں، جو مجروحین کی مرہم پٹی کے لیے انھوں نے تیار کر رکھی تھیں۔ چناں چہ انھوں نے میرے زخم کو بھی ایک پٹی سے باندھا۔

جنگ خیبر کے سلسلے میں مورخ ابن اسحاق نے صراحت کی ہے:

وَ قَدْ شَهِدَ خَيْبَرَ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ نِسَاءٌ مِنْ نِّسَآءِ الْمُسْلِمِيْنَ[۲]

خیبر میں حضورؐ کے ساتھ مسلمان خواتین میں سے بہت سی خواتین نے شرکت کی۔

حشرج بن زیاد کی دادی، اور پانچ اور عورتیں بھی اس جنگ میں گئی تھیں۔ انھوں نے حضورؐ سے آنے کا مقصد ان الفاظ میں ظاہر کیا:

يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ خَرَجْنَا نَغْزِلُ الشَّعْرَ وَ نُعِيْنُ بِهٖ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَ مَعَنَا دَوَاءٌ لِلْجَرْحٰى وَ نُنَاوِلُ السِّهَامَ و نَسْقِي السَّوِيْقَ.[۳]

اے اللہ کے رسولؐ! ہم اس لیے آئی ہیں کہ صوف بنیں گی اور اس کے ذریعے اللہ کی راہ میں مدد کریں گی۔ ہمارے پاس زخمیوں کے لیے دوا ہے۔ ہم تیر اندازوں کو تیر فراہم کریں گی اور ضرورت پر مجاہدین کو ستو گھول کر پلائیں گی۔

غزوۂ خیبر میں ابو رافعؓ کی بیوی، سلمہؓ[۴] قبیلہ اشہل کی ایک خاتون ام عامرؓ[۵] ایک انصاری عورت اُم خلاء[۶] اور کُعیبہ بنت سعد[۷]، ام رِمثہ[۸] کی بھی شرکت کا ثبوت ملتا ہے۔ ان سب کو جنگ میں رسول اللہ ﷺ کی معیت کا شرف حاصل رہا ہے۔

۱۔ طبقات ابن سعد: ۸/ ۴۱۲-۴۱۶۔ ابن حجر، الاصابۃ: ۸/ ۴۴۱، ۴۴۲

۲۔ سیرۃ ابن ہشام: ۳/ ۳۷۲

۳۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی المرأۃ والعبد یحذیان من الغنیمۃ

۴۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۴۱۸

۵۔ طبقات ابن سعد: ۸/ ۳۲۰

۶۔ طبقات ابن سعد: ۸/ ۳۳۶

۷۔ طبقات ابن سعد: ۸/ ۲۹۱

۸۔ ابن عبدالبر، الاستیعاب: ۴/ ۴۸۹۔ ابن سعد، طبقات: ۸/ ۲۲۷۔ ابن حجر، الاصابۃ: ۸/ ۳۹۱

اس سے اہم تر بات یہ ہے کہ وہ کسی خارجی دباؤ کے تحت یہ خدمات انجام نہیں دیتی تھیں، بلکہ محافظین دین کی رفاقت اور تعاون کو اپنے لیے باعثِ عزت و سعادت سمجھ کر خود ہی پیش کش کرتی تھیں۔ اسی جنگ خیبر کا واقعہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ روانہ ہونے لگے تو قبیلہ غفار کی چند عورتوں نے آ کر عرض کیا:

اِنَّا نُرِیْدُ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَنْ نَخْرُجَ مَعَکَ اِلٰی وَجْھِکَ ھٰذَا فَنُدَاوِیْ الْجَرْحٰی وَ نُعِیْنُ الْمُسْلِمِیْنَ بِمَا اسْتَطَعْنَا۔[1]

اے اللہ کے رسولؐ! اس مبارک سفر میں جس پر آپ جا رہے ہیں ہم بھی آپؐ کے ساتھ چلنا چاہتی ہیں، تاکہ زخمیوں کا علاج کریں اور اپنے بس بھر مسلمانوں کی مدد کریں۔

بعض بعض خواتین میدانِ جنگ سے باہر بھی یہ خدمات دیتی تھیں۔ مثلاً رُفیدہ نامی قبیلۂ اسلم کی ایک انصاری خاتون کے متعلق مورخین نے لکھا ہے کہ:

کَانَتِ امْرَأَۃٌ تُدَاوِی الْجَرْحٰی وَ تَحْتَسِبُ بِنَفْسِھَا عَلٰی خِدْمَۃِ مَنْ کَانَتْ بِہٖ ضَیْعَۃٌ مِّنَ الْمُسْلِمِیْنَ۔

زخمی ہونے والوں کی وہ مرہم پٹی کرتی تھیں اور جو مسلمان محتاجِ خدمت ہوتا کہ اگر اس کی ٹھیک سے دیکھ بھال نہ ہو تو ہلاک ہوجائے۔ ثواب کے خیال سے یہ اس کی خدمت کرتیں۔

چناں چہ مسجد نبویؐ میں ان کا خیمہ تھا۔ حضرت سعد بن معاذؓ جنگ خندق میں مجروح ہوئے تو حضورؐ نے ان کو رفیدہ ہی کے خیمہ میں منتقل کر دیا تھا، تاکہ آپ بہ آسانی ان کی عیادت کرسکیں۔[2]

دین کی مدافعت اور اس کی ترغیب

دین کی مدافعت، خواتین جس طرح شمشیر و سنان کے ذریعے کرتی رہی ہیں، اسی طرح زبان و بیان سے بھی انھوں نے یہ فریضہ انجام دیا ہے۔ حق کی نصرت وحمایت

---

[1] طبقات ابن سعد: ۸/ ۲۳۲، ابن ہشام، السیرۃ النبویۃ: ۳/ ۳۷۲

[2] الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۳۹۸، امام بخاری نے الادب المفرد میں باب کیف اصبحت، صفحہ ۲۱۳، ۲۱۴ کے تحت اس کا ذکر کیا ہے۔ نیز ملاحظہ ہو۔ ابن حجر، الاصابۃ: ۸/ ۱۳۶۔ طبقات ابن سعد میں بجائے رفیدہ کے کعیبہ نام آیا ہے، جلد: ۸/ ۱۳۶

میں نیزہ اور تلوار بھی بلند کیا ہے اور زبان کی قوت بھی صرف کی ہے۔ ان کی پرجوش خطابت وتقریر نے بہت سوں کے لیے اللہ کی راہ میں مرنا اور جینا اور اپنی متاعِ حیات کا لٹانا آسان بنا دیا۔

رسولِ اکرم ﷺ کی پھوپھی اَروٰی بنت عبد المطلب کے متعلق ابن عبد البر نے لکھا ہے:

وَكَانَتْ بَعْدُ تَعْضُدُ النَّبِيَّ ﷺ بِلِسَانِهَا وَ تَحُضُّ اِبْنَهَا عَلٰى نُصْرَتِهٖ وَ الْقِيَامِ بِاَمْرِهٖ[1]

ایمان لانے کے بعد وہ حضورؐ کی معاونت کرتی تھیں۔ اور اپنے لڑکے کو آپؐ کی مدد کرنے اور آپؐ کے مقصد کو لے کر کھڑے ہونے پر ابھارتی تھیں۔

ان کے لڑکے طلیبؓ مکہ کے ابتدائی دور ہی میں ایمان لا چکے تھے۔ ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ چند صحابہ کے ساتھ، جن میں طلیبؓ بھی شامل تھے، نماز ادا کر رہے تھے کہ ابوجہل، ابولہب، عقبہ اور بعض دوسرے سردار اچانک ہلّہ بول بیٹھے اور زبان درازی شروع کر دی۔ اس کے جواب میں صحابہ کرام نے پورے زور سے اپنے ایمان کا اظہار و اعلان کیا اور مدافعت کرنے لگے۔ طلیبؓ نے تو آگے بڑھ کر ابوجہل کو بری طرح زخمی کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مشرکین نے ان کو پکڑ کر باندھ دیا۔ بعض لوگ یہ خبر لے کر اروٰیؓ بنت عبد المطلب کے پاس پہنچے اور کہا: ذرا اپنے بیٹے کی 'حماقت' تو دیکھو کہ محمد (ﷺ) کے پھیر میں آ کر لوگوں کے جور وستم کا نشانہ بن گیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا:

خَيْرُ اَيَّامِ طُلَيْبٍ يَوْمَ يَذُبُّ عَنِ ابْنِ خَالِهٖ وَ قَدْ جَاءَ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ تَعَالٰى[2]

جس دن طلیب اپنے ماموں کے لڑکے کی مدافعت میں کھڑا ہو وہ اس کی زندگی کا بہترین دن ہے، کیوں کہ وہ خدا کی جانب سے حق لے کر آیا ہے (لہٰذا اس کی مدافعت حق کی مدافعت ہوگی)۔

---

[1] الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴ / ۳۴۳۔ ابن حجر، الاصابۃ: ۸ / ۸

[2] حاکم، المستدرک: ۴ / ۵۷، حدیث ۶۸۶۸، اس کی سند پر جرح کی گئی ہے۔

عبد اللہ بن زیدؓ احد کے دن مجروح ہوگئے تو ان کی والدہ عمارہؓ نے مرہم پٹی کی اور بجائے اس کے کہ اپنے لختِ جگر کو تکلیف میں دیکھ کر آرام لینے اور ستانے کا مشورہ دیتیں، حکم دیا:

اِنۡهَضۡ بُنَیَّ فَضَارِبِ الۡقَوۡمَ[۱] بیٹے اٹھو اور تلوار لے کر دشمن قوم پر ٹوٹ پڑو۔

ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے شہدائے احد کے خلاف اشعار کہے تو ہندہ بنت اثاثہؓ نے ان کا شعر ہی میں ترکی بہ ترکی جواب دیا۔[۲]

حضرت خنساء اپنے چار لڑکوں کے ساتھ جنگ قادسیہ میں شریک ہوئی تھیں۔ ان چاروں کو آغازِ شب ہی میں جمع کر کے کہا: "اے میرے بچو! تم نے برضا و رغبت ایمان قبول کیا اور کسی کے دباؤ کے بغیر ہجرت کی۔ قسم بخدا، جس طرح تمہاری ماں ایک ہے، اسی طرح تمہارا باپ بھی ایک ہے، کیوں کہ تمہاری ماں نے نہ تو تمہارے باپ کے ساتھ کوئی خیانت کی نہ تمہارے نانہال کو رسوا کیا، نہ تمہارے حسب کو بٹہ لگایا اور نہ تمہارے نسب کو غبار آلود کیا (یعنی تم ایک شریف اور باعفت ماں کے بطن سے پیدا ہوئے ہو۔ اس لیے تمہارے اعمال بھی شریفوں کے سے اور ارفع و اعلیٰ ہونے چاہئیں) تمہیں معلوم ہے کہ خدا نے کفار سے جنگ کے عوض کس قدر ثواب تیار کر رکھا ہے۔ خوب سمجھ لو! اس فنا ہونے والی دنیا سے دار البقا بہتر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اصۡبِرُوۡا وَ صَابِرُوۡا وَ رَابِطُوۡا وَ اتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ۝ اے ایمان والو! ثابت قدم رہو اور ثابت قدمی میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرو۔ حق کی راہ میں جمے رہو اور اللہ سے ڈرو، شاید تم فلاح پاؤ۔ (آل عمران:۲۰۰)

اگر اللہ نے چاہا اور تم نے سلامتی سے صبح کی تو پوری بصیرت کے ساتھ اور

۱۔ طبقات ابن سعد: ۸/ ۳۰۵

۲۔ سیرۃ ابن ہشام، ۳/ ۸۰-۸۲

خدائے تعالیٰ سے مدد طلب کرتے ہوئے دشمن کے مقابلہ میں نکل جاؤ اور جب گھمسان کا رن پڑے اور جنگ کے شعلے بھڑک اٹھیں تو تم اس کی بھٹی میں (بلا خوف وخطر) کود پڑو۔ جس وقت دشمن کا لشکر پورے جوش اور جذبہ سے لڑائی میں مصروف ہو تو تمہارے حملوں کا نشانہ اس کا سردار رہے۔ اس طرح تم غنیمت اور جنت میں شرف و مرتبہ کے مستحق ہوکر لوٹو گے۔"

ماں کی زبان سے یہ پُرعزیمت تقریر سن کر چاروں لڑکے رجز پڑھتے ہوئے سربکف عرصۂ پیکار میں آ نکلے اور پھر ان کو خاک وخون میں غلطاں ہی دیکھا جاسکا۔

حضرت خنساء کو جب یہ اطلاع دی گئی کہ ان کے چاروں بیٹے اس جنگ میں کام آ گئے تو انہوں نے کہا: "اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مجھے ان کی شہادت کا شرف عطا کیا۔ مجھے امید ہے کہ وہ اپنے دار رحمت میں مجھے ان کے ساتھ جمع کرے گا۔"[1]

جس زمانہ میں حجاج نے حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کا محاصرہ کر رکھا تھا، ان کے تقریباً دس ہزار ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ کر حجاج کے ساتھ جا ملے، یہاں تک کہ ان کے دو لڑکے حمزہ اور خبیب بھی پناہ کے طالب ہوکر حجاج کے پاس چلے گئے۔ عبد اللہ بن زبیرؓ نے جا کر اپنی والدہ اسماء بنت ابی بکرؓ سے اپنی بے بسی کا تذکرہ کیا کہ اور تو اور میری اولاد تک نے میرا ساتھ چھوڑ دیا ہے۔ اب میرے ساتھ گنے چنے افراد رہ گئے ہیں، جو حجاج کے مقابلہ میں دیر تک نہیں ٹھہر سکتے۔ اگر میں اب بھی حجاج کے ہاتھ میں ہاتھ دے دوں تو دنیا کی جو نعمت چاہوں مل سکتی ہے، بتایئے آپ کی کیا رائے ہے؟ ماں نے جواب دیا:

یا بنی انت اعلم بنفسک ان کنت تعلم انک علیٰ حق و تدعوا الیٰ حق فاصبر علیه فقد	بیٹا! تم اپنے آپ کو سب سے بہتر جانتے ہو، اگر تم واقعتاً خود کو حق پر سمجھتے ہو اور حق ہی کی طرف لوگوں کو بلا رہے ہو تو صبر سے کام لو، دیکھو کہ تمہارے بہت سے

---

[1] ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/۳۸۷-۳۸۹۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/۸۹-۹۱

قتل علیه اصحابک ولا تمکن من رقبتک یلعبُ بها غلمان بنی امیة و ان کنت تعلم انک انما اردت الدنیا فلبئس العبد انت اهلکت نفسک و اهلکت من قتل معک و ان کنت علٰی حق فما وهن الدین و الٰی کم خلودک فی الدنیا.

ساتھیوں نے دشمن کے مقابلہ میں لڑتے ہوئے جان دے دی۔ لہٰذا اپنی گردن کو کھلونا بنا کر بنی امیہ کے لونڈوں کے حوالے نہ کردو کہ وہ اس سے کھیلتے رہیں۔ لیکن اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ یہ سارا کھیل تم نے دنیا کے لیے کھیلا ہے تو تم دنیا کے بدترین انسان ہو، کیوں کہ اس طرح تم خود ہلاک ہوئے اور اپنے ساتھ جان دینے والوں کو بھی ناحق ہلاک کیا۔ اگر تم حق پر ہو تو اس کے لیے جان دینا اچھا ہے۔ کیوں کہ جب اس زندگی کو ختم ہونا ہی ہے تو کیوں نہ اللہ کی راہ میں ختم ہو۔ دین کو کمزور کرنے سے تمہیں ہمیشگی تو نصیب نہیں ہوجائے گی۔

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ نے ماں کے جذبات کی تائید کی اور حجاج کے مقابلہ میں لڑتے ہوئے شہید ہوگئے[1]

اظہارِ حق

خواتین نے اپنوں ہی کو حق پر ثابت قدم رکھنے کی کوشش نہیں کی، بلکہ معاشرہ میں جہاں کہیں ان کو بگاڑ نظر آیا اس کو بدلنے اور اس کی جگہ خیر و صلاح کو قائم کرنے کی جدوجہد کرتی رہی ہیں۔ سمراء بنت نہیکؓ کے متعلق ابن عبد البرؒ نے لکھا ہے:

كَانَتْ تَمُرُّ فِي الْاَسْوَاقِ وَ تَأْمُرُ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهٰى عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تَضْرِبُ النَّاسَ عَلٰى ذٰلِكَ بِسَوْطٍ كَانَ مَعَهَا.[2]

وہ بازاروں میں گھوم پھر کر بھلائی کا حکم دیتیں اور برائی سے روکتی تھیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک کوڑا ہوتا تھا جس سے وہ لوگوں کو منکر کے ارتکاب پر مارتی تھیں۔

---

[1] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ: جلد ۸، ص ۳۳۰

[2] ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۴۱۹

اس معاملہ میں خواتینِ امت نے نہ تو رعایا کی پروا کی اور نہ فرماں رواؤں اور حاکموں کی۔ ان کے ایمانی جذبات نے جس طرح دین کے کھلے دشمنوں کا مقابلہ کیا ہے اسی طرح دین کے نام لیواؤں کے فسادِ فکر و عمل کو بھی برداشت کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ کلمۂ حق کے اظہار میں نہ تو باطل کی بڑی سے بڑی قوت ان کے لیے مانع بنی اور نہ جابر و سخت گیر حکام کی زیادتی اور سختی۔

حضرت عبد اللہ بن زبیرؓ کو تختۂ دار پر چڑھانے کے بعد حجاج ان کی والدہ اسماءؓ کے پاس گیا اور کہا: آپ کے صاحب زادے نے خدا کے گھر میں بے دینی اور الحاد پھیلایا، جس کی سزا خدا نے اس کو دردناک عذاب کی شکل میں چکھائی ہے۔ حضرت اسماءؓ نے کہا:

كَذَبْتَ، كَانَ بَرًّا بِالْوَالِدَيْنِ صَوَّامًا قَوَّامًا، وَ اللّٰهِ لَقَدْ اَخْبَرَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ اَنَّـهٗ سَيَخْرُجُ مِنْ ثَقِيْفٍ كَذَّابَانَ، الْاٰخَرُ مِنْهُمَا شَرٌّ مِنَ الْاَوَّلِ وَهُوَ مُبِيْرٌ[1]

تو نے جھوٹ کہا (وہ بے دین نہیں تھا) وہ تو اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا، روزے دار اور تہجد گزار تھا (حقیقتاً تو نے اس پر ظلم و زیادتی کی ہے) قسم خدا کی، حضورؐ نے ہم سے کہا تھا کہ قبیلۂ ثقیف سے دو جھوٹے پیدا ہوں گے اس میں بھی دوسرا پہلے سے بدتر ہوگا کیوں کہ وہ ہلاکت اور تباہی مچائے گا۔ (ثقیف کے پہلے جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کو تو دیکھ چکے اور دوسرے تم ہو)

سمیہؓ نامی ایک کنیز تھی جس سے دورِ جاہلیت میں اس کے آقا بیسوائی کراتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کا جابر و ظالم گورنر، زیاد اس کا لڑکا تھا۔ عموماً جیسے بیسواؤں کی اولاد کے حسب نسب کا کوئی علم نہیں ہوتا اسی طرح زیاد کے سلسلۂ پدری کا بھی کوئی پتا نہیں تھا اور وہ نامعلوم الحسب ہی مشہور تھا۔ حضرت معاویہؓ کے سامنے ایک شخص نے شہادت دی کہ ایک مرتبہ جاہلیت میں ابوسفیانؓ کی سمیہ کے ساتھ خلوت ہوگئی تو اس کے نتیجہ میں یہ

---

[1] مسند احمد: ۷/ ۴۹۲ حدیث اسماء بنت ابی بکر الصدیق نمبر ۲۶۴۲۷

پیدا ہوا۔ اس شہادت کی بنا پر حضرت معاویہؓ نے اس کو ابوسفیانؓ کی اولاد اور اپنا بھائی قرار دے لیا۔ زیاد اس سے بہت خوش ہوا اور وہ چاہ رہا تھا کہ اکابر امت سے بھی اس کی تصدیق ہوجائے، چناں چہ حضرت عائشہؓ کو اس نے ایک خط لکھا جس کا سر نامہ یہ تھا۔ ''ابوسفیان کے لڑکے زیاد کی جانب سے ام المومنین عائشہؓ کے نام'' حضرت عائشہؓ اس غیر اسلامی فعل کی کیسے تائید کرسکتی تھیں۔ انھوں نے نہ تو حضرت معاویہؓ کے فیصلہ کا کوئی احترام کیا اور نہ زیاد جیسے سخت گیر اور جور پیشہ گورنر کی کوئی پروا کی اور جواب کا آغاز ان کلمات سے کیا ''ام المومنین عائشہؓ کی طرف سے نامعلوم باپ کے لڑکے زیاد کے نام۔''[1]

اعیانِ حکومت کو نصیحت اور اس کے نتائج

تنقید یا تائید اسی وقت سود مند ہوتی ہے جب کہ اس کے پیچھے خلوص اور خیرخواہی کے جذبات کارفرما ہوں، کسی کے عمل پر گرفت کی جائے یا اس کی تائید اور حمایت، دونوں کو ذاتی نفع وغرض سے پاک ہونا چاہیے، ورنہ نہ تو تائید کا کوئی فائدہ ہوتا ہے اور نہ تردید کا۔ مسلمان خواتین نے جو کچھ کہا اور کیا ذاتی مفاد سے بالاتر ہوکر خالص دین اور ریاست کے مفاد کے لیے کہا اور کیا۔

دین کے نفع وضرر کا پاس ولحاظ، اس کے لیے ہر طرح کی قربانی اور شدید ترین و جاں گسل مواقع پر استقامت، مسلمان عورت کی یہ ایسی صفات تھیں جنھوں نے اس کے خلوص اور وفاداری کو ہر شک وشبہ سے بالاتر کر دیا اور کوئی بھی شخص اس کو دین اور اربابِ دین کی بدخواہ او رغدار نہیں ثابت کرسکا۔ اس نے فرد اور جماعت کے مفاد کے لیے جو

---

[1] طبری، جلد۶، طبقات ابن سعد، جلد۷، ص۱۰۰ اور تاریخ ابن عساکر، جلد۵، صفحہ ۴۱۱، سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ نے ایک حاجت مند کی سفارش میں زیاد کو خط لکھا تو اس کو ابوسفیان کا لڑکا لکھا تھا، لیکن اوپر کی تفصیل ہم نے علامہ ابن اثیر کی کتاب تاریخ الکامل، جلد۳، ص۳۰۱، ۳۰۲ سے لی ہے، جنھوں نے ان واقعات کو نقد وتبصرہ کے بعد زیادہ منقح شکل میں پیش کیا ہے۔ زمانۂ حال کے مصری مورخ شیخ محمد خضری نے بھی ابن اثیر کی تحقیق ہی کو اپنی کتاب 'محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ' صفحہ ۴۷۷ میں درج کیا ہے۔

بھی اقدام کیا اس کو ذاتی غرض اور نفسانی خواہش پر محمول نہیں کیا گیا، بلکہ مخلصانہ جدوجہد سمجھ کر اس کا خیر مقدم کیا گیا۔ عام افراد تو کیا، ذمہ دارانِ ریاست تک نے اس کی تنقید اور نصیحت کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا اور اس سے استفادہ کیا ہے۔

حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ کو لکھا کہ مجھے ایک مختصر سی نصیحت کیجیے (جسے میں ہمیشہ اپنے سامنے رکھ سکوں) اس کے جواب میں حضرت عائشہؓ نے انتہائی مؤثر اور ایک حاکم وقت کو رہنمائی کا کام دینے والا حضورؐ کا یہ ارشاد لکھ کر بھیجا:

مَنِ الْتَمَسَ رِضَا اللّٰہَ بِسَخَطِ النَّاسِ کَفَاہُ اللّٰہُ مُؤْنَۃَ النَّاسِ وَ مَنُ اِلْتَمَسَ رِضَا النَّاسِ بِسَخَطِ اللّٰہِ وَ کَلَہُ اللّٰہُ اِلَی النَّاسِ[1]

جو شخص لوگوں کو ناخوش کر کے اللہ کی رضا تلاش کرے (لوگ اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، کیوں کہ) اللہ تعالیٰ اس کو انسانوں کے شر سے بچا لیتا ہے، لیکن جو شخص اللہ کو خفا کر کے لوگوں کی رضا ڈھونڈے تو اللہ تعالیٰ اس کو ان ہی کے حوالے کر دیتا ہے (اور وہ جس طرح چاہتے ہیں اس پر حکومت کرتے ہیں)۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ مسجد سے نکلے۔ راستہ میں خولہ بنت ثعلبہؓ سے ملاقات ہوگئی۔ وہ وہیں حضرت عمرؓ کو نصیحت کرنے لگیں:

''عمرؓ! ایک زمانہ تھا جب کہ میں نے تم کو عکاظ کے میلہ میں دیکھا تھا کہ تم بچوں کو ڈنڈا لیے ڈراتے دھمکاتے پھرتے تھے۔ اس وقت تم بہت چھوٹے تھے اور اسی کم سنی کی وجہ سے لوگ تم کو عمیر کہہ کر پکارتے تھے۔ اس کے بعد بہت جلد تم جوان ہو گئے اور) لوگ تم کو عمر کہنے لگے۔ اس پر بھی کچھ زیادہ عرصہ گزرنے نہیں پایا کہ اب تمھیں امیر المومنین کہا جا رہا ہے (سوچو، خدا نے تمھیں کہاں سے کہاں پہنچایا اور رعایا کے ساتھ اپنی فطری سختی روا نہ رکھو، بلکہ) رعایا کے معاملہ میں اللہ سے ڈرتے رہو۔ یہ بات ذہن نشین کر لو کہ جس شخص کو خدا کے عذاب کا خوف ہوگا وہ قیامت کو دور نہیں سمجھ سکتا اور جس کو موت کا کھٹکا لگا ہوگا (وہ لا اُبالی زندگی نہیں گزار سکتا، بلکہ) اس کو نیکیوں کے ہاتھ

---

[1] ترمذی، ابواب الزہد، باب ٦٥ (باب بغیر عنوان)

سے چھوٹ جانے کا ہر وقت خدشہ رہے گا۔"

حضرت عمرؓ کے ساتھ اس وقت جارود عبدی بھی تھے۔ انھوں نے خولہؓ سے کہا: "تم نے تو امیر المومنین پر ضرورت سے زیادہ نصیحت شروع کردی۔" حضرت عمرؓ نے ٹوکا اور کہا: "انھیں کہنے دو، کیا تمھیں نہیں معلوم، یہ خولہ بنت ثعلبہ ہیں۔" ایک روایت میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے کہا کہ ان کی بات تو اللہ نے سات آسمانوں پر سنی۔ عمر تو اس کا زیادہ مستحق ہے کہ ان کی بات سنے۔[۱]

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: مہر کی مقدار زیادہ نہ رکھو، اس پر ایک عورت نے کہا کہ آپ کو اس کی تبلیغ کا حق نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ "اگر تم اپنی عورتوں کو مہر میں ایک ڈھیر مال بھی دے دو تو اس سے ایک حبہ بھی نہ لو۔" اس سے معلوم ہوا کہ مہر کی کوئی حد نہیں ہے۔ حضرت عمرؓ نے اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا: "ایک عورت نے عمر سے بحث کی اور غالب رہی۔"[۲]

اس قسم کی تنقیدیں بعض اوقات بہت نتیجہ خیز اور فرد اور جماعت کے لیے بے حد مفید ثابت ہوئی ہیں۔

سودہ بنت عمارہ نے جنگ صفین میں حضرت معاویہؓ کے خلاف حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا۔ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد کا واقعہ ہے کہ یہ حضرت معاویہؓ کے پاس گئیں۔ پہلے تو ماضی میں جو کچھ ہوا اس پر معافی چاہی، پھر کہا: امیر المومنین! آپ لوگوں کے سردار اور ان کے معاملات کے ذمہ دار و نگہبان ہیں، اس لیے ان کے جو حقوق اللہ تعالیٰ نے آپ پر فرض کیے ہیں ان کے متعلق وہ آپ سے ضرور پوچھے گا۔ ہم پر

۱۔ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۳۹۰، ۳۹۱۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/ ۹۳۔ ابن حجر، الاصابۃ: ۸/ ۱۱۴، ۱۱۵۔ اس میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے شوہر اوس بن صامت نے ان سے ظہار کیا تھا (انھیں ماں سے تشبیہ دی تھی) اس پر انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنی پریشانی کا اظہار کیا۔ اس کے بعد اس سلسلے کا حکم نازل ہوا، جو سورۂ مجادلہ کے شروع میں ہے۔

۲۔ اخرجہ عبد الرزاق و ابو یعلیٰ۔ (ابن حجر، فتح الباری: ۱۰/ ۲۵۶)

ایسے گورنر متعین ہوکر آتے ہیں جو آپ کے غلبہ و اقتدار کو مستقل اور وسیع کرنے کے ساتھ ہم کو کھیتی کی طرح کاٹ پھینکتے اور گایوں کی طرح روند ڈالتے ہیں۔ یہ ہمارے حقوق ٹھیک سے ادا نہیں کرتے۔ ہم کو خراب سے خراب تر چیز چکھاتے ہیں اور بڑی سے بڑی اور نفیس سے نفیس شئے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہ دیکھئے، ابن ارطاۃ حاکم بن کر آیا تو اس نے ہمارے قبیلہ کے افراد کا خون بہانا شروع کر دیا اور میرا مال چھین لیا۔ آپ کی اطاعت ہم پر فرض ہے، ورنہ ہمارے اندر اتنا کس بل اور بچاؤ کی قوت ہے کہ ہر ظلم کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔ اگر آپ اس کو معزول کر دیں تو ہم آپ کے مشکور ہوں گے، ورنہ ہم آپ کو بھی دیکھیں گے۔ حضرت معاویہؓ نے کہا: ''کیا تو مجھے اپنی قوم کے ذریعے دھمکی دے رہی ہے؟ قسم خدا کی، میں نے تو ارادہ کیا ہے کہ تجھ کو کانٹوں بھری سواری پر بٹھا کر اسی کے پاس لوٹاؤں، تاکہ وہ اپنا فیصلہ تجھ پر نافذ کرے۔'' اس پر سودہ خاموش ہوگئیں۔ پھر کچھ دیر بعد دو شعر پڑھے جن کا ترجمہ یہ ہے:

> ''اللہ تعالیٰ اس روح پر رحمت نازل فرمائے، جس کو ایک قبر نے اپنے آغوش میں لے لیا ہے اور جس کے ساتھ عدل و انصاف بھی دفن ہو چکا ہے۔ اس نے حق کے ساتھ معاہدہ کیا تھا کہ اس کے عوض دولتِ دنیا نہیں حاصل کرے گا۔ اس طرح حق اور ایمان اس میں جمع ہوگئے تھے۔''

حضرت معاویہؓ نے پوچھا: وہ کون؟ کہا: علیؓ بن ابی طالب۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا: تجھ پر اس عدل و انصاف کا کوئی نشان نظر نہیں آتا؟ اس نے جواب دیا: میں یہ بے دلیل نہیں کہہ رہی ہوں۔ میرے پاس ان کے انصاف کا ثبوت موجود ہے۔ ایک دن میں ان کی خدمت میں ان کے ایک محصِّل صدقات کی شکایت لے کر پہنچی۔ وہ اس وقت کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ نماز سے فارغ ہوئے تو محبت بھرے انداز میں پوچھا: کیا تمھاری کوئی ضرورت ہے؟ میں نے محصِّل کی زیادتی کا ذکر کیا تو رونے لگے اور

آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کر کہا: اے میرے اللہ! تو جانتا ہے، میں نے اپنے گورنروں کو تیری مخلوق پر ظلم و ستم ڈھانے اور تیرے حقوق کو ترک کرنے کا حکم نہیں دیا۔" اس کے بعد فوراً جیب سے چمڑے کا ایک ٹکڑا نکالا اور اس پر اس کی معزولی کا حکم لکھ بھیجا۔ اس میں کسی قسم کی تاخیر روا نہ رکھی (لہٰذا آپ کی حکومت کو بھی ایسے ہی عدل پرور ہونا چاہیے کہ کسی بھی شخص پر کسی قسم کا ظلم نہ ہونے پائے)۔

حضرت معاویہؓ نے حکم دیا کہ اس کے ساتھ عدل و انصاف کیا جائے۔ اس نے پوچھا: کیا انصاف میرے ہی ساتھ مخصوص ہے یا میری قوم بھی اس میں شریک ہے؟ حضرت معاویہؓ نے کہا: تمھیں اپنے علاوہ دوسروں سے کیا مطلب؟ اس نے کہا: انصاف ہو تو سب کے ساتھ ہو، ورنہ یہ بہت ہی مذموم بات ہوگی کہ ایک کے ساتھ انصاف کیا جائے اور دوسروں پر جور و ظلم روا رکھا جائے۔ اگر آپ میرے کل قبیلہ کے ساتھ عدل نہیں کر سکتے تو مجھے بھی انصاف کی کوئی ضرورت نہیں، میری قوم جس خستہ حالت میں پڑی ہوئی ہے، میں بھی پڑی رہوں گی۔"

حضرت معاویہؓ نے کہا: ابن ابی طالب نے تم کو جری بنا دیا ہے۔ پھر ماتحتوں کو حکم دیا کہ گورنر کو لکھ دو کہ اس کے مطالبات پورے کیے جائیں۔[1]

اسی طرح عکرشہ بنت اطرش بھی حضرت معاویہؓ کے دربار میں ان کے گورنروں کی شکایت لے کر پہنچی اور بے باکانہ کہا کہ "اس سے پہلے ہمارے اغنیا سے زکوٰۃ لی جاتی اور ہمارے غریبوں میں تقسیم کر دی جاتی تھی، لیکن اب نہ تو شکستہ حال کی شکستگی دور ہوتی ہے اور نہ محتاج کی محتاجی رفع کی جاتی ہے۔ اگر یہ سب کچھ آپ کے ایماء اور مشورے سے ہو رہا ہے تو آپ جیسے شخص سے (توقع یہ کی جاتی ہے کہ) تنبیہ ہوتے ہی فوراً چونک اٹھیں گے اور توبہ کریں گے اور اگر اس میں آپ کی رائے اور مشورہ کا دخل نہیں ہے، بلکہ گورنروں کی اپنی طرف سے ظلم و زیادتی ہے (تو یہ بھی آپ جیسی ذمہ دار شخصیت

---

[1] العقد الفرید: ۲/۱۰۲-۱۰۴

کے منافی ہے کہ) وہ امانت داروں کو چھوڑ کر خائنوں سے تعاون حاصل کرے اور ظالموں کو خدمات پر مامور کردے۔" حضرت معاویہؓ نے معذرت کی کہ کبھی کبھی ایسے خراب حالات سے ہم کو سابقہ پڑتا ہے کہ قانون پر عمل کرنے سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس نے کہا: سبحان اللہ! آپ کیسی بات کر رہے ہیں۔ اس دانائے غیب نے ہم پر کوئی ایسا فرض متعین ہی نہیں کیا ہے جس پر عمل سے دوسروں کو ضرر پہنچے۔

بالآخر حضرت معاویہؓ نے اس قبیلہ کی زکوٰۃ کو اسی کے مستحق افراد کے اندر تقسیم کرنے اور اس کے ساتھ عدل و انصاف کیے جانے کا فرمان جاری کیا۔[1]

اس جرأت و ہمت کو دیکھئے کہ ریاستوں کے سب سے بڑے سربراہ اور ذمے دار کے سامنے بے خوف و خطر حق کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جس دین پر وہ ایمان رکھتی ہے، جس نظریۂ حیات کو وہ درست اور صحیح سمجھتی ہے اور جس روشنی سے وہ کفر و باطل کی ظلمتوں میں راہ نمائی حاصل کرتی ہے، ناممکن ہے کہ وہ باطل کی تاریک شب کو اس پر قبضہ جمانے کی اجازت دے۔ اگر وہ اس کی اجازت دیتی ہے تو اپنے دین و ایمان کی موت کا اعلان کرتی ہے، اس عزم و ارادے کا انکار کرتی ہے، جس عزم کا اس کا ایمان تقاضا کرتا ہے، اس وفاداری اور خیر خواہی سے منہ موڑتی ہے، جس کا اس نے اپنے مولیٰ سے، اپنے معاشرہ سے اور خود اپنے ضمیر سے عہد کیا تھا، اس لیے وہ اپنی ذمے داری سمجھتی ہے کہ سوسائٹی میں باطل کے جراثیم کو پنپنے اور دین و ایمان کی غارت گر قوتوں کو قدم جمانے کا موقع نہ دے۔ چناں چہ اسلامی تاریخ گواہ ہے کہ وہ عملاً بھی شر پسند اور حق دشمن افکار و کردار سے ہمیشہ چوکس رہی اور اس کا مقابلہ کرتی رہی اور زندگی کے چھوٹے بڑے مسائل میں اگر کسی پر اعتماد کیا بھی تو پوری بصیرت اور آگہی کے بعد کیا۔ ایسا نہیں ہوا کہ آنکھیں بند کر کے ہر کس و ناکس کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا ہو، بلکہ رہزن و رہبر کے درمیان فرق کرنے کے بعد ساتھ دینے یا نہ دینے کا اس نے فیصلہ کیا ہے۔

---

[1] العقد الفرید: ۲ / ۱۱۲

حضرت ابوبکرؓ نے حج میں قبیلۂ احمس کی ایک عورت کو دیکھا کہ وہ بالکل بول ہی نہیں رہی ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اس نے حج کے دوران خاموش رہنے کی نذر مان رکھی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس سے کہا کہ یہ تو کوئی ثواب کا کام نہیں ہے، بلکہ جاہلانہ حرکت ہے۔ لہٰذا اس نذر کو توڑ اور ضرورت پر بات کر۔ اس نے دریافت کیا: آپ کون ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: میں مہاجرین میں کا ایک فرد ہوں۔ اس نے دوبارہ سوال کیا؟ کون سے مہاجر؟ کہا: مہاجرین قریش! پوچھا: قریش کے کس قبیلہ سے؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: تم بڑی سوال کرنے والی نکلیں۔ میں ابوبکرؓ ہوں۔ اس نے کہا (اچھا، تو آپ ہمارے خلیفہ ہیں) بتائیے، جاہلیت کے بعد ہم کو جو راہِ راست نصیب ہوئی ہے کب تک ہم اس پر قائم رہیں گے؟ کہا: جب تک تمہارے امام اس پر قائم رہیں۔ اس نے پوچھا: امام سے کون لوگ مراد ہیں؟ حضرت ابوبکرؓ نے کہا: اے اللہ کی بندی! کیا تیری قوم میں ایسے سردار نہیں گزرے، جن کے احکام تمہارے لیے واجب الاتباع ہوتے، وہ حکم دیتے تو تم اس کی فوراً تعمیل و اطاعت کرتیں؟ اس نے کہا: ہاں! حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: وہی تو اب بھی لوگوں کے سردار و امام ہیں[1]

حضرت ابوبکرؓ نے مسئلہ بتایا تو یہ عورت اس کو قبول کرنے سے پہلے یہ تحقیق کرنا ضروری سمجھتی ہے کہ کون میری راہ نمائی کر رہا ہے؟ کیا اس کی فہم و بصیرت اور سیرت و کردار اس قابل ہے کہ اس پر بھروسہ کیا جائے؟ کیا اس کی ہدایت سے میں راہِ صواب پاسکتی ہوں؟ جب اسے پتا چلتا ہے کہ وقت کا خلیفہ ہم سے ہم کلام ہے تو فوراً اس کا ذہن مسائلِ سیاست کی طرف منتقل ہو جاتا ہے اور وہ اس کھوج اور کرید میں لگ جاتی ہے کہ جس دورِ سعادت سے وہ گزر رہی ہے کیا اس سے وہ ہمیشہ بہرہ ور ہوتی رہے گی یا کوئی وقت ایسا بھی آنے والا ہے، جب کہ یہ دولت اس سے چھن جائے گی؟ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ عام مسلمان خواتین تک کو کس قدر دین کی بقا و تحفظ کی فکر

---

[1] بخاری، کتاب المناقب، باب ایام الجاہلیہ

دامن گیر رہتی تھی اور ان کو اسلام اور اس کے اصولِ عدل و مساوات پر قائم شدہ ریاست کی سربلندی و پائیداری سے کتنی دلچسپی تھی؟ پھر یہ کیسے تصور کیا جاسکتا ہے کہ وہ دین اور اقدارِ دین کے فروغ و زوال اور تباہی اور ترقی سے کنارہ کش رہیں گی یا اس سے اغماض برتیں گی؟

تنقید و احتساب

بنو امیہ کے ابتدائی دورِ حکومت کا ذکر ہے کہ حضرت معاویہؓ کے گورنر اپنے خطبوں میں حضرت علیؓ اور ان کے حامیوں پر لعن طعن کرتے تھے۔ ان کی اس روش پر کوفہ کے ایک صحابی حجر بن عدیؓ، برملا تنقید فرماتے اور ساتھ ہی حضرت علیؓ اور ان کے اعوان و انصار کی مدح و توصیف کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کے گورنروں نے ان کی زبان بندی کی ہر چند کوشش کی، لیکن کامیاب نہیں ہوئے۔ اس کے برعکس حجر بن عدیؓ کے ہم خیال اور موئدین میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ یہ دیکھ کر حضرت معاویہؓ نے حجرؓ اور ان کے بعض ساتھیوں کی گرفتاری کے احکام جاری کردیے۔ اور جب یہ گرفتار کرکے ان کے پاس لائے گئے تو ان کے قتل کا فیصلہ کر دیا۔ حضرت عائشہؓ کو اس کا علم ہوا تو فوراً عبدالرحمٰن بن حارث کو حضرت معاویہؓ کے پاس بھیجا کہ وہ اس اقدام سے باز آجائیں، لیکن ان کے پہنچنے سے پہلے ہی حجرؓ اور ان کے سات ساتھی شہید کیے جاچکے تھے۔ اس پر حضرت عائشہؓ بے حد خفا ہوئیں اور حضرت معاویہؓ سے سختی سے بازپرس کی۔ عبد الملک بن نوفل روایت کرتے ہیں کہ وہ یہاں تک کہتی تھیں:

لَوْلَا اَنَّا لَمْ نُغَيِّرْ شَيْئًا اِلَّا آلَتْ بِنَا الْاُمُوْرُ اِلٰى اَشَدِّ مِمَّا كُنَّا فِيْهِ لَغَيَّرْنَا قَتْلَ حُجْرٍ[1]	کسی معاملہ کے ہمارے بدلنے سے موجودہ حالات سے بھی زیادہ سخت حالات کے پیدا ہوجانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم حجر کے قتل کے فیصلہ کو بدل کر رکھ دیتے۔

---

[1] طبری، تاریخ الرسل والملوک: ۳/ ۲۳۲۔ ابن الاثیر، الکامل فی التاریخ: ۳/ ۷ ۳۳

ایک دوسری روایت کے الفاظ ہیں:

لَوْلاَ یَغْلِبُنَا سُفَھَاؤُنَا لَکَانَ لِیْ وَ لِمُعَاوِیَۃَ فِیْ قَتْلِ حُجْرٍ شَانٌ.[1]	اگر سفہا کے غلبے کا اندیشہ نہ ہوتا تو حجر کے قتل کے سلسلے میں میرا اور معاویہ کا معاملہ کچھ اور ہی ہوتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح اکابر صحابہ، فتنہ وفساد کے خدشہ سے بعض غیر شرعی امور کو انجام پاتے ہوئے دیکھنے کے باوجود انگیز کر گئے، اسی طرح حضرت عائشہؓ نے بھی اس معاملہ میں بربنائے مصلحت سکوت اختیار کیا، ورنہ وہ کوئی سخت قدم اٹھانا چاہتی تھیں۔

حج کے زمانہ میں حضرت معاویہؓ نے حضرت عائشہؓ سے ملاقات کی تو تہدید آمیز انداز میں پوچھا:

یَا مُعَاوِیَۃُ قَتَلْتَ حُجْرًا وَ اَصْحَابَہٗ وَ فَعَلْتَ الَّذِیْ فَعَلْتَ اَمَا خَشِیْتَ اَنْ اَخْبَأَ لَکَ رَجُلاً یَقْتُلُکَ.	معاویہ! تم نے حجر اور ان کے ساتھیوں کو قتل کیا اور وہ سب کچھ کیا جو کرنا چاہا۔ کیا تمھیں اس بات کا خوف نہیں ہوا کہ میں بھی کسی شخص کو پوشیدہ طور پر تمھارے قتل پر لگا سکتی ہوں؟

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت معاویہؓ نے معذرت کرتے کرتے بڑی مشکلوں سے ان کی خفگی کو ختم کیا۔[2]

رائے اور مشوروں کا حق اور اس سے استفادہ

یہ تاریخی شہادتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ اسلامی معاشرہ کے سود و زیاں اور نفع وضرر سے مسلمان عورت کسی تماشائی کی طرح غیر متعلق نہیں رہ سکتی۔ کیوں کہ معاشرہ کے بناؤ اور بگاڑ اور صلاح وفساد سے اس کا بہت ہی گہرا اور قریبی تعلق ہوتا ہے۔ معاشرہ کا نقصان اس کا اپنا نقصان اور معاشرہ کا فائدہ اس کا اپنا فائدہ ہے۔ وہ معاشرہ کو خیر کی

---

[1] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ: جلد ۴، جزء ۸، ص ۴۵

[2] ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ: جلد ۴، جزء ۸، ص ۴۵

بنیادوں پر قائم رکھنے میں مدد دے گی تو لازماً شر کی راہ پر لے جانے کی مخالفت اور مزاحمت بھی کرے گی۔ بھلائیوں کا خیر مقدم کرے گی تو برائیوں پر احتجاج بھی کرے گی۔ یہ اس کا فطری حق ہے، جو اجتماعی زندگی نے اس کو عطا کیا ہے۔ شریعت اس کے اس حق کو تسلیم کرتی ہے اور زندگی کے مختلف معاملات میں خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی اس کو اپنے جذبات و احساسات، رائے اور خیالات اور پسند و ناپسند کے اظہار کی اجازت عطا کرتی ہے۔ یہ اظہار اپنے حدود کے اندر زبان و بیان، تحریر و انشاء، غرض جس ذریعے سے بھی ہو شریعت اس پر کوئی قدغن نہیں لگاتی۔

جہاں تک اس کے ذاتی مسائل کا تعلق ہے مثلاً نکاح، خلع وغیرہ تو ان کے متعلق شریعت نے صاف اور واضح الفاظ میں بتا دیا ہے کہ کوئی بھی شخص اس پر اپنا فیصلہ لاد نہیں سکتا۔ جو بھی اقدام کیا جائے گا اس کی رضا اور خوشی کے بعد کیا جائے گا۔

لاَ تُنۡکَحُ الۡاَیِّمُ حَتّٰی تُسۡتَأۡمَرَ وَلاَ تُنۡکَحُ الۡبِکۡرُ حَتّٰی تُسۡتَأۡذَنَ.[۱]	شادی شدہ عورت کا نکاح (بیوگی یا طلاق کے بعد) اس وقت تک نہیں کیا جائے گا جب تک کہ اس سے مشورہ نہ لے لیا جائے اور دوشیزہ کا نکاح بھی اس سے اجازت لیے بغیر نہیں کیا جائے گا۔

ایک دوسری روایت ہے:

لاَ تُنۡکِحُوۡا الۡیَتَامٰی حَتّٰی تَسۡتَأۡمِرُوۡهُنَّ.[۲]	یتیم لڑکیوں کا نکاح ان سے رائے اور مشورہ کرنے سے پہلے نہ کردو۔

'یتامیٰ' کا لفظ یہاں بہت ہی اہم اور معنی خیز ہے۔ شفیق و مہربان اور خیر خواہ باپ کے نہ ہونے کی صورت میں بہت ممکن ہے کہ کوئی ظالم سرپرست بے آسرا لڑکی کو

---

[۱] بخاری، کتاب النکاح، باب لاَ ینکح الاب وغیرہ البکر والثیب الابرضاھا۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب 'مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ' بحث 'نکاح کا حق' مزید تفصیل کے لیے دیکھی جائے 'اسلام کا عائلی نظام' بحث 'نکاح میں ولی کی شرط' ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۱۱۰۰۲۵

[۲] دارقطنی، کتاب النکاح، ص ۳۸۵

ظلم و زیادتی کا نشانہ بنالے اور شریعت نے اس کو اپنے متعلق فیصلہ کا جو حق دیا ہے اس سے محروم کردے۔ اس لیے خصوصی طور پر اس سے رائے اور مشورے کی ہدایت کی گئی ہے، تاکہ ہر حال میں عورت اپنی مرضی کی آپ مالک رہے۔ چناں چہ جب کبھی اس کی مرضی کے علی الرغم کوئی اقدام کیا گیا تو حضورؐ نے اس کو بدل کر رکھ دیا۔

ان معاملات کا تعلق تو اس کی اپنی شخصیت سے ہے۔ اس سے بھی آگے حضورؐ اکرم ﷺ کی ہدایت ہے۔

آمِرُوا النِّسَآءَ فِیْ بَنَاتِهِنَّ[1] — عورتوں سے ان کی لڑکیوں کے معاملہ میں مشورہ لو۔

یہ حدیث بتاتی ہے کہ زندگی کے جن شعبوں سے متعلق وہ تجربات رکھتی ہے اور ان کے نفع و نقصان سے بہتر طور پر واقف ہے، ان کے سلسلہ میں اس کے افکار و خیالات خصوصی توجہ اور اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، اس طرح کے تمام امور میں اسے نظر انداز کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے، بلکہ ان معاملات میں اس کی رائے اور مشورہ سے فائدہ اٹھانے میں پیش قدمی کرنی چاہیے۔

نبی کریم ﷺ کا ایک عام اسوہ اور طرزِ عمل حضرت حسن بصریؒ بتاتے ہیں:

كَانَ النَّبِیُّ ﷺ يَسْتَشِيْرُ حَتَّى الْمَرْأَةَ فَتُشِيْرُ عَلَيْهِ بِالشَّیْءِ فَيَأْخُذُ بِهٖ[2] — نبی ﷺ مشورہ کرتے تھے یہاں تک کہ عورت سے بھی، اور وہ کبھی ایسی رائے دیتی جسے آپؐ اختیار فرماتے تھے۔

یہ اسوہ زندگی کے کسی ایک یا چند پہلوؤں کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ اس کا تعلق ہر نوعیت کے مسائل اور تمام پہلوؤں سے ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں تاریخ کے صفحات میں جگہ جگہ ملتا ہے۔

حدیبیہ کی مشہور صلح، قریش اور مسلمانوں کے درمیان جن شرائط پر ہوئی تھی، ابتدا میں ان سے مسلمانوں کی اکثریت ناخوش تھی۔ ان میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب الاستئمار

[2] ابن قتیبہ، عیون الاخبار: ۱/ ۲۷

مسلمان اس سال عمرہ کیے بغیر لوٹ جائیں گے۔ اس شرط کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کو حدیبیہ ہی کے مقام پر احرام کھولنے اور قربانی کرنے کا حکم دیا، لیکن صحابہ کرامؓ کے جذبات اس وقت اتنے بدلے ہوئے تھے کہ اس حکم کی تعمیل ہوتی نظر نہ آئی۔ آپؐ نے افسوس کے ساتھ حضرت ام سلمہؓ سے اس کا ذکر کیا تو انھوں نے صحابہ کی نفسیات کی رعایت کرتے ہوئے انتہائی دانش مندانہ مشورہ دیا کہ آپ کسی سے مزید گفتگو نہ فرمایئے، بلکہ جو مراسم ادا کرنے ہیں ان کو آگے بڑھ کر ادا کیجیے۔ پھر دیکھئے، کس طرح لوگ اس پر عمل نہیں کرتے۔ چناں چہ آپ ﷺ نے ان کے مشورے پر عمل کیا تو صحابۂ کرام نے بھی آپ کو دیکھ کر فوراً پیروی شروع کردی[1]

اس طرح حضرت ام سلمہؓ کی درست اور صائب رائے نے آن کی آن میں یہ نازک صورتِ حال ختم کرکے رکھ دی۔

عورت کے جنازے کے لیے تابوت کے استعمال کا مسلمانوں میں رواج نہیں تھا۔ حضرت اسماء بنت عمیسؓ نے اس کو حبشہ میں نصاریٰ کے ہاں دیکھا تھا۔ انھوں نے اس کا مشورہ دیا اور وہ قبول کیا گیا۔[2]

حضور اکرم ﷺ کے بعد خلفاء راشدین کا طریق عمل بھی آپ کے اسوہ ہی کی تائید کرتا نظر آتا ہے۔ ابن سیرینؒ حضرت عمرؓ کے متعلق بیان کرتے ہیں:

اِنْ كَانَ عُمَرُ لَيَسْتَشِيْرُ فِي الْاَمْرِ حَتّٰى اِنْ كَانَ لَيَسْتَشِيْرُ الْمَرْاَةَ فَرُبَّمَا اَبْصَرَ فِي قَوْلِهَا اَوْ يَسْتَحْسِنُهُ فَيَاْخُذُ بِهٖ[3]

عمر پیش آمدہ مسائل میں (اصحاب الرائے لوگوں سے) مشورہ کرتے، حتی کہ (ان مسائل میں سمجھ بوجھ رکھنے والی) کوئی عورت ہوتی تو اس سے بھی۔ بسا اوقات اس کی رائے میں خیر وخوبی کا کوئی پہلو دیکھتے یا کوئی مستحسن چیز پاتے تو اس کو اختیار کرتے۔

---

[1] بخاری، کتاب الشروط، باب الشروط فی الجہاد والمصالحۃ مع اہل الحرب الخ

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۸/۲۸۱

[3] بیہقی، السنن الکبری: ۱۰/ ۱۱۳

شفاء بنت عبد اللہؓ کے تذکرہ میں علامہ ابن عبد البرؒ لکھتے ہیں:

اَسۡلَمَتِ الشِّفَاءُ قَبۡلَ الۡھِجۡرَۃِ فَھِیَ مِنَ الۡمُھَاجِرَاتِ الۡاُوَل وَ بَایَعَت النَّبِیَّ وَ کَانَتۡ مِنۡ عُقَلاءِ النِّسَاءِ وَفُضَلائِھِنَّ...وَ کَانَ عُمَرُ یُقَدِّمُھَا فِی الرَّأیِ وَ یَرۡضَاھَا وَ یُفَضِّلُھَا۔[1]

شفاءؓ ہجرت سے پہلے ایمان لاچکی تھیں، ان کا شمار ہجرت کرنے والی خواتین میں ہوتا ہے۔ انھوں نے نبی ﷺ سے بیعت بھی کی تھی۔ عقل و فہم اور فضیلت رکھنے والی عورتوں میں تھیں۔ حضرت عمرؓ ان کو رائے اور مشورے میں آگے بڑھاتے اور ان کو خوش رکھتے اور ان کو (اوروں پر) فضیلت دیتے تھے۔

حضرت علیؓ کی خلافت کے ابتدائی ایام کا واقعہ ہے کہ انھوں نے کمیل نخعی کو حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کے پاس بھیجا۔ وہ انھیں حضرت علیؓ کی خدمت میں لے آئے۔ حضرت علیؓ نے ان سے کہا کہ وہ ان کا ساتھ دیں اور حمایت میں کھڑے ہوں۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے جواب دیا کہ میں اہل مدینہ کے ساتھ ہوں۔ ان سے الگ نہیں رہوں گا۔ وہ جو بھی قدم اٹھائیں گے میں اس کے خلاف نہیں جاؤں گا۔ حضرت علیؓ نے ان سے ضمانت چاہی تو انھوں نے اس سے انکار کر دیا۔

رات میں حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے حضرت علیؓ کی صاحب زادی حضرت ام کلثوم سے کہا کہ وہ حضرت علیؓ کے ساتھ ہیں، البتہ ان کی حمایت میں نہیں کھڑے ہوں گے اور وہ عمرہ کے لیے جانا چاہتے ہیں۔

اسی اثنا میں یہ بات پھیل گئی کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ شام روانہ ہوگئے ہیں۔ حضرت علیؓ کو اس سے تشویش ہوئی۔ وہ فوراً بازار گئے اور سواروں کو چاروں طرف دوڑایا کہ شام ہونے سے پہلے ان کو گرفتار کرلیا جائے۔ حضرت ام کلثوم کو اس کا علم ہوا تو وہ سواری پر آئیں اور حضرت علیؓ سے کہا کہ جو بات آپ تک پہنچی ہے وہ صحیح نہیں ہے۔ میں ان کی ضمانت لیتی ہوں۔ وہ آپ کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔ اس پر حضرت

---

[1] الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۴۲۳، ۴۲۴۔ ابن اثیر، اسد الغابۃ: ۷/ ۱۶۲

علیؓ کو اطمینان ہوگیا، انھوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور لوگوں سے کہا کہ وہ واپس ہوجائیں۔[۱]

جس زمانہ میں حضرت عائشہؓ حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص لینے کی تیاری کررہی تھیں، اپنی ایک تقریر میں فرماتی ہیں:

كَانَ النَّاسُ يَتَجَنُّوْنَ عَلى عُثْمَانَؓ وَ يَزْرُوْنَ عَلٰى عُمَّالِهٖ فَيَسْتَشِيْرُوْنَنَا فِيْمَا يُخْبِرُوْنَنَا عَنْهُمْ فَنَنْظُرُ فِيْ ذٰلِكَ فَنَجِدُهٗ بَرِيًّا تَقِيًّا وَ فِيًّا وَ نَجِدُهُمْ فَجَرَةً غَدَرَةً يُحَاوِلُوْنَ غَيْرَ مَا يُظْهِرُوْنَ[۲]

عثمانؓ پر لوگ بے بنیاد الزام لگاتے اور ان کے عمال کی عیب گیری کرتے تھے اور ہمارے پاس مدینہ آ کر، ان گورنروں کے متعلق جو کچھ وہ ہمیں بتاتے، اس سلسلے میں ہم سے مشورہ کرتے، ہم غور کرتے تو حضرت عثمانؓ کو ہر الزام سے بری، خدا ترس اور اپنی ذمے داریوں کو پورا کرنے والے پاتے اور ان کو فاجر و فاسق دھوکہ باز جھوٹا اور جو کچھ ظاہر کر رہے ہیں، اس کے خلاف سعی و تدبیر کرتے ہوئے دیکھتے۔

ان الفاظ سے ایک تو یہ پتا چلتا ہے کہ حضرت عائشہؓ حکومت اور اس کے ذمے داروں کے اعمال کا دقتِ نظر سے مطالعہ کرتی رہتی تھیں کہ کون سے امور حدودِ عدل و انصاف کے اندر انجام پا رہے ہیں اور کہاں ان حدود سے تجاوز ہو رہا ہے، دوسرے یہ الفاظ ظاہر کرتے ہیں کہ عوام کے مسائل و معاملات سے حضرت عائشہؓ کا بہت ہی گہرا اور قریبی تعلق تھا اور لوگ اہم سیاسی مسائل تک میں ان کی طرف رجوع کرتے تھے اور وہ ان کو سلجھانے کی کوشش کرتی تھیں۔

حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد یہ اہم سوال تھا کہ اب مسلمانوں کا خلیفہ کون ہو؟ اس سلسلے میں بصرہ کی مشہور شخصیت اور اپنے قبیلہ کے سردار احنف بن قیس نے جن اکابر سے مشورہ کیا ان میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے علاوہ حضرت عائشہؓ بھی تھیں۔

۱۔ طبری، تاریخ الرسل والملوک: ۳/ ۵، ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۳/ ۱۰۵

۲۔ الکامل فی التاریخ، جلد ۲، صفحہ ۹۰، طبری، جلد ۵، صفحہ ۷۵

جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان تینوں کی رائے حضرت علیؓ کے حق میں ہے تو مدینہ جا کر حضرت علیؓ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں[1]

عملی تعاون

مختلف سیاسی و غیر سیاسی مسائل میں عورت کی رائے اور فہم سے اسلامی معاشرہ نے جس طرح فائدہ اٹھایا ہے اسی طرح اپنی تعمیر و تشکیل کے سلسلے میں بھی اس کی عملی صلاحیتوں سے وہ مدد حاصل کرتا رہا ہے۔ عورتوں نے رضا کارانہ جو جنگی خدمات انجام دی ہیں ان کا ذکر اس سے پہلے آچکا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض اوقات ضرورت پر ریاست نے بھی اس سے یہ خدمات حاصل کی ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے خوارج نے دریافت کہ کیا رسول اللہ ﷺ عورتوں کو جہاد پر لے جاتے تھے؟ انھوں نے جواب دیا:

وَ قَدْ کَانَ یَغْزُوْ بِھِنَّ فَیُدَاوِیْنَ الْجَرْحٰی[2]	ہاں آپ ان کو اپنے ساتھ لے جاتے تھے اور وہ زخمیوں اور مریضوں کے علاج معالجہ کا کام انجام دیتی تھیں۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ یَغْزُوْ بِاُمِّ سُلَیْمٍ وَ نِسْوَۃٍ مِنَ الْاَنْصَارِ لِیَسْقِیْنَ الْمَاءَ وَ یُدَاوِیْنَ الْجَرْحٰی[3]	رسول اللہؐ ام سلیم اور انصار کی بعض خواتین کو لے کر جنگ پر روانہ ہوتے تھے، تاکہ وہ پیاسوں کو پانی پلائیں اور زخمیوں کی مرہم پٹی کریں۔

اس کے علاوہ بعض سماجی اور مذہبی کام بھی ان سے لیے گئے ہیں۔ مثلاً اُم ورقہ بنت عبد اللہؓ کے بارے میں بیان کیا گیا ہے:

---

[1] طبری، تاریخ الرسل والملوک: ۵/۱۹۷۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۳/۱۲۷

[2] مسلم، کتاب الجہاد، باب النساء الغازیات یرزق لھن۔ ترمذی، ابواب السیر، باب من یعطی الفیء

[3] ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی النساء یغزون۔ مسلم، کتاب الجہاد۔ ترمذی، ابواب السیر

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ يَزُوْرُهَا فِيْ بَيْتِهَا وَ جَعَلَ لَهَا مُؤَذِّنًا يُؤَذِّنُ لَهَا وَ اَمَرَهَا اَنْ تَؤُمَّ اَهْلَ دَارِهَا[1]	رسول اللہ ﷺ ان سے ملاقات کے لیے ان کے گھر آتے تھے اور آپؐ نے ان کے لیے ایک موذن بھی مقرر کر دیا تھا کہ اذان دیا کرے اور ان کو اپنے گھر والوں کی امامت کا حکم دیا تھا۔

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اپنی ایک لونڈی کو حکم دیتے تھے کہ وہ رمضان کی راتوں کی نماز (تراویح) میں ان کے گھر کی عورتوں کی امامت کرے[2]

شفاء بنت عبد اللہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ:

رُبَّمَا وَلّاهَا (ای عمر) شَيْئًا مِّنْ اَمْرِ السُّوْقِ.[3]	بسا اوقات حضرت عمرؓ ان کو بازار کی کوئی ذمے داری سونپتے تھے۔

یہ واقعات اس بات کا قطعی ثبوت ہیں کہ بعض اوقات مسلمان خواتین پر سیاسی، سماجی اور مذہبی ذمہ داریوں کا بار ڈالا گیا ہے اور انھوں نے اپنے خانگی فرائض کے ساتھ ان ذمہ داریوں سے بھی عہدہ برآ ہونے کی سعی کی ہے۔

---

[1] ابوداؤد، کتاب الصلوٰۃ، باب امامۃ النساء۔ اس حدیث پر تفصیلی بحث گزر چکی ہے۔
[2] ابن حزم، المحلّیٰ: ۳/ ۱۲۸
[3] ابن عبد البر، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ۴/ ۴۲۴

ﷻ

عورت کی فکری صلاحیت

(قانونِ شہادت کے پس منظر میں)

دورِ اول کی مسلمان خواتین نے اسلامی معاشرہ میں جو خدمات انجام دی ہیں، ان کے علاوہ خدمت کے اور بھی میدان ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اس پر کون سی اجتماعی ذمے داریاں ڈالی جاسکتی ہیں؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں دیکھنا چاہیے کہ اسلام، عورت کی فکری و عملی صلاحیتوں کو کس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے اور کن معاملات میں کس حد تک اس پر اعتماد کرتا ہے؟ اس کے بعد ہی یہ فیصلہ ممکن ہوگا کہ وہ کس نوعیت کے کاموں کی اہل ہے اور اسلامی معاشرہ میں اس پر کن ذمہ داریوں کا بار ڈالا جائے گا اور کن ذمے داریوں کا نہیں؟

دنیا میں کام ایک طرح کے نہیں ہوتے۔ چھوٹے بڑے، اہم اور غیر اہم ہر طرح کے ہوتے ہیں اور جو کام جس نوعیت کا ہوتا ہے اس کے انجام دینے کے لیے اسی نوعیت کی صلاحیتیں درکار ہوتی ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر شخص میں ہر قسم کے کام کی صلاحیت نہیں ہوتی، کوئی کسی کام کے لیے موزوں ہے تو کسی دوسرے کام کے لیے ناموزوں ہوگا، کوئی سائنسی تحقیقات کا اہل ہے تو کسی کے اندر عسکری تنظیم کا سلیقہ ہے، کوئی آرٹسٹ بننے کی صلاحیت رکھتا ہے تو دوسرا اپنے اندر انشاء اور خطابت کی قوتیں پاتا ہے، کسی کی جسمانی ساخت اور توانائی محنت اور مشقت برداشت کرے گی تو کوئی اس

کے قابل نہ ہوگا۔ صلاحیتوں کا یہ اختلاف یوں تو ہر دو افراد کے درمیان پایا جاتا ہے، لیکن جہاں انسانوں کی ایک صنف کا دوسری صنف سے مقابلہ کیا جائے تو یہ اختلاف بہت ہی واضح اور نمایاں نظر آنے لگتا ہے۔

عورت کم زور ہے

عورت اور مرد کے درمیان یہ اختلاف شریعت کی نگاہ میں فکری و عملی دونوں پہلوؤں سے ہے۔ چناں چہ عورتوں کے متعلق نبی ﷺ کا ارشاد ہے: ''نَاقِصَاتُ عَقْلٍ وَ دِیْنٍ''[1] (عقل اور دین میں نقص رکھنے والیاں)۔ یہاں 'عقل' سے اس کے قوائے ذہنی کی طرف اشارہ ہے اور 'دین' سے اس کی جسمانی طاقتیں مراد ہیں۔ یعنی ان دونوں پہلوؤں سے مرد کے مقابلہ میں عورت کم زور اور ناقص واقع ہوئی ہے۔

فقہا نے تصریح کی ہے:

اَلرَّجُلُ خَیْرٌ مِّنَ الْمَرْأَۃِ[2] (صلاحیتوں کے لحاظ سے) مرد عورت سے بہتر ہے۔

عورت کی کم زوریوں کی رعایت

شریعت نے اس کی ان کم زوریوں کو صرف تسلیم ہی نہیں کیا ہے، بلکہ زندگی کے ہر پہلو میں ان کی رعایت کی ہے:

۱- ایامِ ماہ واری میں ایک تو اس کی ظاہری نظافت اور پاکیزگی ختم ہو جاتی ہے اور دوسرے اس کے جسمانی نظام میں بھی اختلال رونما ہو جاتا ہے اور وہ کسی ایسے کام کے قابل نہیں رہتی، جس میں زیادہ توجہ اور محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے شریعت نے ان ایام میں نماز جیسا اہم ترین فرض اس پر سے ساقط کر دیا ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا اوپر جو ابھی ارشاد گزرا ہے، اس میں آپ نے اس کے 'نقصِ دین' کی تشریح فرماتے

---

[1] بخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحائض الصوم

[2] ابن الہمام، فتح القدیر: ۷/۲۷۹

ہوئے یہی بتایا کہ اس فطری کم زوری کی وجہ سے اس زمانہ میں اس پر نماز اور روزے کا بار نہیں ڈالا گیا ہے۔

۲- ان سے بھی سخت تر حالات سے اس کو زچگی کے دوران گزرنا پڑتا ہے۔ یوں کہنا چاہیے کہ بعض اوقات وہ موت و حیات کی کشمکش سے گزرتی ہے۔ عورت کے اس نازک مرحلہ سے گزر کر حالتِ اعتدال پر آنے تک شریعت نے نماز سے اس کو منع کر دیا ہے۔

حضرت ام سلمہؓ فرماتی ہیں:

كَانَتِ الْمَرْأَةُ مِنْ نِسَاءِ النَّبِيِّ ﷺ تَقْعُدُ فِي النِّفَاسِ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً لاَ يَاْمُرُهَا النَّبِيُّ ﷺ بِقَضَاءِ صَلٰوةِ النِّفَاسِ.[۱]

نبی ﷺ (کے خاندان) کی عورتوں میں سے بعض بعض چالیس دن تک نفاس کی حالت میں رہتیں، لیکن نبی ﷺ ان کو نفاس کے زمانہ کی نماز قضا کرنے کا حکم نہ دیتے۔

۳- مدتِ حیض و نفاس میں اگر روزے فرض ہوجائیں تو حکم دیا گیا کہ اس مدت میں یہ فرض انجام نہ دیا جائے، بلکہ دوسرے دنوں میں ان کی قضا کی جائے جب کہ وہ ادائی کے قابل ہوجائے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ہم کو زمانۂ حیض کے روزوں کی قضا کا حکم تو دیا جاتا، لیکن نماز کی قضا کا حکم نہیں دیا جاتا تھا۔[۲]

۴- کم و بیش یہی حال اس کا حمل اور رضاعت کی مدت میں رہتا ہے، اس مدت میں روزہ جیسی سخت عبادت کا ادا کرنا اس کے لیے انتہائی دشوار تھا، چناں چہ شریعت نے یہ فرض دوسرے دنوں میں بجا لانے کی اس کو اجازت دی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّ اللّٰهَ وَضَعَ عَنِ الْمُسَافِرِ شَطْرَ

اللہ نے مسافر کی آدھی نماز کی تخفیف کردی (وہ چار رکعت کی جگہ دو رکعت پڑھے گا) اور

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الطہارۃ، باب ماجاء فی وقت النفساء

[۲] مسلم، کتاب الحیض، باب وجوب قضاء الصوم علی الحائض

الصَّلٰوۃِ وَ عَنِ الْحَامِلِ وَ الْمُرْضِعِ الصَّوْمَ[۱]

حاملہ اور دودھ پلانے کے لیے رمضان میں روزوں کی ادائی ضروری نہیں قرار دی (وہ دوسرے مہینوں میں اس کو ادا کر سکتی ہے)۔

۵- شریعت نے کم زوروں اور ناتوانوں کو جہاد کے بارگراں سے مستثنیٰ کر دیا ہے، اسی صف میں آپ کو بوڑھوں اور بچوں کے ساتھ عورت بھی ملے گی۔

عَنْ اَبِیْ هُرَیْرَۃَؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ جِهَادُ الْکَبِیْرِ وَ الصَّغِیْرِ وَ الضَّعِیْفِ وَ الْمَرْأَۃِ الْحَجُّ وَالْعُمْرَۃُ.[۲]

ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ بوڑھے، بچے، کم زور اور عورت کے لیے حج اور عمرہ ہی جہاد ہے۔

۶- اگر وہ حج کے لیے جاتی ہے تو قدم قدم پر اس کے ضعف اور کم توانائی کی رعایت کی جاتی ہے۔ مثلاً ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو مزدلفہ میں رات گزار کر منیٰ کے لیے چلنا چاہیے، لیکن نبی ﷺ نے عورتوں اور بچوں کو سویرے ہی منیٰ کے لیے روانہ ہونے کی اجازت دے دی، تاکہ مجمع کے ساتھ چلنے میں ان کو کوئی زحمت نہ ہو، ساتھ ہی ان کو یہ بھی حق دیا کہ لوگوں کے منیٰ پہنچنے سے پہلے ہی رمی جمرہ سے فارغ ہو جائیں۔[۳]

عورت کی ذہنی صلاحیت

عورت کی فکری صلاحیتوں کے متعلق حضور اکرم ﷺ کا ارشاد گزر چکا ہے کہ اس کی صلاحیتیں مرد سے کم تر ہیں۔

فقہِ حنفی کی مشہور کتاب ہدایہ کے شارح امام اکمل الدین البابرتی نے نبی ﷺ کے اس فرمان کی روشنی میں عورت کی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:

---

[۱] ابن ماجہ، ابواب ماجاء فی الصیام، باب ماجاء فی الافطار للحامل والمرضع وروی بمعناہ الترمذی و ابوداؤد والنسائی

[۲] نسائی، کتاب مناسک الحج، باب فضل الحج

[۳] بخاری، کتاب الحج، باب من قدم ضعفۃ اہلہ الخ

''نفسِ انسانی کی قوتوں کو چار درجوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، پہلا درجہ یہ کہ مطلقاً سوچنے سمجھنے کی استعداد موجود ہو۔ یہ استعداد فطرتاً ہر شخص میں پائی جاتی ہے۔ دوسرا درجہ یہ کہ جزئیات میں حواس کے استعمال سے بدیہی باتیں دریافت ہونے لگیں (مثلاً دیکھ کر رنگ کا اور چکھ کر ذائقہ کا تعین وغیرہ) اور عقل اس قابل ہو کہ ان میں غور وفکر کے ذریعے خالص فکری حقائق کا اکتساب کرنے لگے۔ اس کو اصطلاح میں 'العقل بالملكة' کہتے ہیں۔ اس صلاحیت کے بعد ہی آدمی پر شریعت کی ذمے داریاں عائد ہوتی ہیں۔ تیسرا درجہ یہ ہے کہ بدیہی حقیقتوں سے جو نظریات مستنبط ہو رہے ہوں ان کے ادراک میں کسی قسم کی دقت اور محنت نہ پیش آئے، اس کا نام 'العقل بالفعل' ہے۔ چوتھا درجہ یہ کہ یہ نظریات ہمیشہ ذہن میں اس طرح مستحضر ہوں گویا کہ آنکھوں کے سامنے ہیں۔ اس کو 'عقل مستفاد' کہا جاتا ہے۔

اس کے بعد لکھتے ہیں:

وَ لَيُسَ فِيُمَا هُوَ مُنَاطُ التكليفُ وَ هُوَ الُعَقُلُ بِالُمَلَكَةِ فِيُهِنَّ نُقُصَانٌ بِمُشَاهَدَةِ حَالِهِنَّ فِيُ تَحُصِيُلِ الُبَدِيُهِيَّاتِ بِاِسُتِعُمَالِ الُحَوَاسِّ فِي الُجُزُئِيَاتِ وَ بِالتَّنُبِيُهِ اِنُ نَسِيَتُ فَاِنَّهُ لَوُ كَانَ فِيُ ذٰلِكَ نُقُصَانٌ لَكَانَ تَكُلِيُفُهُنَّ دُوُنَ تَكُلِيُفِ الرِّجَالِ فِي الُاَرُكَانِ وَلَيُسَ كَذٰلِكَ وَ

شریعت کی ذمہ داریوں کا دار و مدار جس صلاحیتِ عقل پر ہوتا ہے یعنی 'العقل بالملکہ' (عقل کا دوسرا درجہ) عورتوں میں اس کی کمی نہیں ہے، کیوں کہ ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جزئیات میں حواس کو استعمال کرکے بدیہیات کو پالیتی ہیں اور اگر کسی بات کو فراموش کر جاتی ہیں تو یاد دہانی کے بعد ذہن میں حاضر بھی کر لیتی ہیں۔ اگر اس صلاحیت میں کسی قسم کا نقص ہوتا تو دین کے جن ارکان کی ذمے داری مردوں پر ڈالی گئی ہے عورتوں کو اس سے مختلف ارکان کی تکلیف دی جاتی حالاں کہ صورتِ واقعہ یہ نہیں ہے (بلکہ دونوں پر ایک ہی طرح کی ذمہ داریاں عائد کی گئی ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ) نبی ﷺ

قَوْلُہٗ ﷺ هُنَّ نَاقِصَاتُ عَقْلٍ اَلْمُرَادُ بِهِ الْعَقْلُ بِالْفِعْلِ.[1]

نے ان کے حق میں 'ناقصات العقل' جو فرمایا تو اس سے 'العقل بالفعل' (یعنی عقل کا تیسرا درجہ) مراد ہے۔

عورت اور قانونِ شہادت

بہرحال، شریعت نے مرد کو عقلی حیثیت سے عورت کے مقابلہ میں برتر تصور کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے مرد کی عقل پر عورت کی عقل سے زیادہ اعتماد بھی کیا ہے، اس کی وضاحت کے لیے ہم عورت کی گواہی کے مسئلہ کو لیتے ہیں، کیوں کہ اس مسئلہ کو عورت کی عقل کے نقص پر نبی ﷺ نے بطور دلیل پیش کیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے:

شَهَادَةُ الْمَرْأَةِ مِثْلُ نِصْفِ شَهَادَةِ الرَّجُلِ.[2]

عورت کی گواہی مرد کی گواہی کی نصف ہے۔

قرآن مجید میں پانچ مقامات پر شہادت کے احکام بیان کیے گئے ہیں، جن میں صرف ایک مقام پر عورت کی شہادت کے مرتبہ و حیثیت سے بحث کی گئی ہے۔ چناں چہ لین دین کے سلسلے میں قرض کے احکام بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے:

وَ اسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰى ط

(البقرۃ:۲۸۲)

اور گواہی حاصل کرو اپنے مردوں میں سے دو کی اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ یہ گواہ ان لوگوں میں سے ہوں، جن کو تم بہ حیثیت گواہ کے پسند کرتے ہو (ایک مرد کی جگہ دو عورت اس لیے کہ) اگر ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلادے۔

قرآن مجید نے عورت کی شہادت کے سلسلے میں جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان سے کئی ایک سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ تنہا خواتین کی شہادت معتبر ہے یا نہیں؟ اگر معتبر

---

[1] العنایۃ مطبوع علی حاشیہ فتح القدیر: ۷/ ۳۴۵،۳۴۶

[2] بخاری، کتاب الحیض، باب ترک الحائض الصوم

ہے تو کیا تمام معاملات میں یا صرف بعض میں، اور یہ کہ ہر معاملہ میں نصابِ شہادت کیا ہے؟ یعنی گواہی دینے والیوں کی کتنی تعداد ضروری ہے؟ اور اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ خواتین کی شہادت قابلِ قبول ہونے کے لیے ان کے ساتھ مرد کا ہونا ضروری ہے تو اس وقت بھی بعینہٖ یہی سوالات ابھرتے ہیں کہ یہ مشترک شہادت کیا ہر قسم کے مسائل میں فیصلہ کی بنیاد بن سکتی ہے یا صرف بعض مسائل ہی کا فیصلہ اس کے ذریعے ہوسکتا ہے؟

ان سوالات پر مسلمان فقہاء نے کافی تفصیل سے بحث کی ہے۔ ہم ان کے خیالات کو اپنے الفاظ میں پیش کرتے ہیں، تاکہ ان کی روشنی میں عورت کی ذہنی صلاحیتوں کے متعلق اسلام کا نقطۂ نظر سمجھنے میں آسانی ہو۔[1]

تنہا عورتوں کی گواہی

امت کے تقریباً تمام فقہا متفق ہیں کہ ایسے مخصوص نسوانی مسائل کے فیصلہ کے لیے تنہا عورتوں کی شہادت کافی ہے، جن کا علم مردوں کو نہیں ہوسکتا۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

اَلْوِلَادَةُ وَ عُيُوْبُ النِّسَاءِ مِمَّا لَمْ اَعْلَمْ مُخَالِفًا لَقِيْتُهٗ اَنَّ شَهَادَةَ النِّسَاءِ فِيْهِ جَائِزَةٌ لَا رَجُلَ مَعَهُنَّ[2]

جن (اہل علم حضرات) سے میں نے ملاقات کی ان میں کسی کو اس بات کا مخالف نہیں پایا کہ ولادت اور عورتوں کے (قابل ستر مقامات کے) عیوب کے سلسلے میں عورتوں کی شہادت مرد کی شرکت کے بغیر جائز ہے۔

امام زہریؒ کا بیان ہے:

---

[1] ذیل میں شہادت سے متعلق جو خیالات پیش کیے جا رہے ہیں وہ المحلی لابن حزم، جلد۹، ص ۳۹۵ تا ۴۰۰ اور امام ابن قیمؒ کی کتاب الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، صفحہ ۱۳۳ تا ۱۳۸ سے ماخوذ ہیں۔ اگر درمیان میں کسی اور ماخذ سے کوئی بات لی گئی ہے تو وہیں اس کا حوالہ دے دیا گیا ہے۔

[2] کتاب الام: ۷/ ۷۹

مَضَتِ السُّنَّةُ اَنْ تَجُوْزُ شَهَادَةُ النِّسَاءِ فِيْمَا لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ غَيْرُهُنَّ.

یہ سنت چلی آ رہی ہے کہ ایسے تمام معاملات میں تنہا عورتوں کی شہادت جائز ہے، جن کی اطلاع سوائے ان کے کسی اور کو نہیں ہوتی۔

مخصوص نسوانی مسائل کے علاوہ دیگر مسائل حیات میں فقہائے احناف، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور ان کے ہم خیال بعض اور فقہاء نے صرف عورتوں کی شہادت قبول نہیں کی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ، عمر بن عبدالعزیزؒ اور عطاء بن ابی رباحؒ کی بھی یہی رائے ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں:

لَا يَجُوْزُ شَهَادَةُ النِّسَاءِ وَحْدَهُنَّ اِلَّا عَلٰى مَا لَا يَطَّلِعُ عَلَيْهِ غَيْرُهُنَّ مِنْ عَوْرَاتِ النِّسَآءِ وَ حَمْلِهِنَّ وَ حَيْضِهِنَّ.

تنہا عورتوں کی شہادت صرف انہی امور میں جائز ہے جن سے سوائے ان کے اور کوئی واقف نہیں ہوسکتا۔ یعنی عورتوں کے قابلِ ستر مقامات اور حمل اور حیض سے متعلق ان کے بیانات (پر فیصلہ کیا جائے گا۔ اس کے لیے مرد کی شرکت ضروری نہیں سمجھی جائے گی)۔

حضرت علیؓ کے ایک قول سے اسی خیال کی تائید ہوتی ہے، لیکن بعض روایات اس کے خلاف بھی ملتی ہیں۔ چار خواتین نے حضرت علیؓ کے سامنے شہادت دی کہ فلاں عورت نے بچہ کو پیر سے روند کر ہلاک کر دیا ہے تو آپ نے ان کی شہادت قبول کی۔

ایک دوسرا واقعہ ہند بنت طلق بیان کرتی ہیں کہ ہم چند عورتیں ایک جگہ تھیں، وہیں ایک بچہ کپڑے سے ڈھکا پڑا تھا۔ ایک عورت نے ادھر سے گزرتے ہوئے اس کو روند ڈالا۔ بچہ کی ماں نے دعویٰ کیا کہ اس نے میرے بچہ کو ہلاک کر دیا۔ اس کی گواہی حضرت علیؓ کے سامنے دس عورتوں نے دی جن میں میں بھی شامل تھی۔ حضرت علیؓ نے اس عورت پر دیت لازم کردی۔

اسی طرح حضرت عمرؓ کے متعلق ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نکاح، طلاق، حدود اور خون کے معاملات میں عورت کی شہادت کو صحیح نہیں سمجھتے تھے، لیکن ایک دوسری روایت ہے کہ چار عورتوں نے حضرت عمرؓ کے سامنے گواہی دی کہ فلاں شخص نے نشہ کی حالت میں اپنی بیوی کو طلاق دے دی۔ آپ نے بیوی کو شوہر سے جدا کر دیا۔

بعض فقہاء کا رجحان یہ معلوم ہوتا ہے کہ نسوانی معاملات میں تنہا خواتین کی گواہی جس بنیاد پر قبول کی جاتی ہے یعنی یہ کہ ان کا علم صرف خواتین ہی کو ہوسکتا ہے، اس نوعیت کے حالات جہاں کہیں بھی اور جن مسائل میں پیدا ہو جائیں ان کی شہادت قبول کی جانی چاہیے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے جو متضاد روایات منقول ہیں ان کے درمیان اس رائے کے ذریعے تطبیق دی جاسکتی ہے کہ انھوں نے تنہا خواتین کی شہادت ایسے حالات میں قابل رد قرار دی ہے جب کہ مردوں کو عورتوں سے زیادہ واقعات کے مطالعہ کے مواقع ہوں اور ان کی شہادت پر صرف ان صورتوں میں فیصلہ کیا ہے، جن میں ان کی شہادت قبول کیے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا اور نہ قبول کرنے میں حقوق کے ضائع ہونے کا اندیشہ تھا۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

تُقْبَلُ شَهَادَةُ النِّسَاءِ فِي الْحُدُوْدِ اِذَا اجْتَمَعْنَ فِي الْعُرُوْسِ وَ الْحَمَّامِ وَ نَصَّ عَلَيْهِ اَحْمَدُ فِي رِوَايَةِ بَكْرِ بْنِ مُحَمَّدٍ عَنْ اَبِيْهِ وَ نَقَلَ ابْنُ صَدَقَة فِي الرَّجُلِ يُوْصِيْ بِاَشْيَاءَ لِاَقَارِبِهٖ وَ يُعْتِقُ وَ لَا يَحْضُرُهٗ اِلَّا النِّسَاءَ هَلْ تَجُوْزُ

اگر خواتین باراتوں اور غسل خانوں میں جمع ہوں اور وہاں کوئی حد کے قابل سانحہ پیش آجائے تو ایسی صورت میں حدود سے متعلق ان کی گواہی قبول کی جائے گی۔ بکر بن محمد نے اپنے والد کے حوالہ سے امام احمد سے اس کی صراحتاً روایت کی ہے۔ ابن صدقہ نے ایک صورت نقل کی ہے کہ اگر ایک شخص اپنے رشتہ داروں کو وصیت کرے اور اپنے غلام کو آزاد کرے، لیکن اس وقت سوائے

شَهَادَتُهُنَّ فِي الْحُقُوقِ وَ الصَّحِيحُ قُبُولُ شَهَادَةِ النِّسَاءِ فِي الرَّجْعَةِ فَاِنَّ حُضُورَهُنَّ عِنْدَهُ اَيْسَرُ مِنْ حُضُورِهِنَّ عِنْدَ كِتَابَةِ الْوَثَائِقِ.[1]

عورتوں کے اور کوئی موجود نہ ہو، کیا اس طرح کے حقوق میں عورتوں کی گواہی جائز ہوگی؟ (امام احمد نے فرمایا، ہاں حقوق میں ان کی گواہی جائز ہے۔[2]) اسی طرح طلاق سے رجوع کے متعلق بھی ان کی شہادت قبول کی جائے گی کیوں کہ دستاویزات کی تحریر کے وقت ان کا حاضر ہونا اتنا آسان نہیں جتنا کہ طلاق سے رجوع کے وقت موجود ہونا آسان ہے (یعنی جب پہلی صورت میں ان کی گواہی قبول کی گئی تو دوسری صورت میں بھی قبول کرنی چاہیے)۔

عطاء بن ابی رباحؒ کہتے ہیں کہ اگر آٹھ خواتین کسی عورت کے زانی ہونے کی شہادت دیں تو میں اسے رجم کردوں گا۔

علامہ ابن حزمؒ دو عورتوں کو ایک مرد کی حیثیت دینے کے بعد ہر حال میں اور ہر قسم کے حقوق و معاملات میں خواتین کی شہادت کو معتبر سمجھتے ہیں۔

قاضی شریح کی بھی غالباً یہی رائے تھی۔ ایک گھر کے ساز و سامان کے متعلق ان کے پاس مقدمہ پیش ہوا۔ فریقین میاں بیوی تھے۔ شوہر کا دعویٰ تھا کہ مال و اسباب اس کا ہے، لیکن چار عورتوں نے گواہی دی کہ یہ بیوی کا ہے۔ بیوی نے اپنے مہر کی رقم شوہر کے حوالے کی تو اس کے عوض شوہر نے یہ مال و اسباب اس کو دیا تھا۔ قاضی شریحؒ نے عورتوں کے اس متفقہ بیان کے مطابق شوہر کے خلاف فیصلہ کیا۔

اسی قسم کی ایک اور روایت آتی ہے کہ انھوں نے مہر کے ایک مقدمہ میں چار خواتین کی گواہی پر شوہر کے خلاف بیوی کے حق میں فیصلہ دیا۔

---

[1] الاختیارات العلمیۃ المطبوع مع الفتاویٰ، طبع قدیم، صفحہ ۲۱۲

[2] قوسین کا اضافہ الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ صفحہ ۱۴۲ سے کیا گیا ہے، اس کے بغیر عبارت کا منشا واضح نہیں ہوتا۔

ایاس بن معاویہؒ نے طلاق کے سلسلے میں دو عورتوں کی گواہی قبول کی ہے۔

حضرت معاویہؓ کے متعلق مروی ہے کہ صرف حضرت ام سلمہؓ کی شہادت پر انھوں نے ایک مکان سے متعلق قضیہ طے کر دیا۔

عورت اور مرد کی مشترکہ گواہی

جن فقہاء نے ہر قسم کے معاملات میں تنہا خواتین کی شہادت کو معتبر مانا ہے ان کے لیے خواتین اور مردوں کی مشترکہ شہادت کو قبول کرنے میں کوئی عذر نہیں ہوسکتا۔ وہ اس کو ضرور ہی قبول کریں گے۔ یہاں اصل سوال ان فقہاء کے بارے میں پیدا ہوتا ہے، جو نسوانی مسائل کے محدود دائرہ ہی کے اندر تنہا خواتین کی شہادت کو معتبر سمجھتے ہیں۔ اس دائرہ سے باہر جب تک عورت کے ساتھ گواہی میں مرد بھی شریک نہ ہوجائے وہ اس گواہی پر اعتماد کے لیے تیار نہیں ہیں۔ فقہاء کے اس گروہ کے درمیان اس پہلو سے اختلاف ہے کہ کن معاملات میں یہ مشترکہ شہادت قبول کی جائے گی اور کن معاملات میں قبول نہیں کی جائے گی؟

مکحولؒ تابعی کہتے ہیں کہ صرف قرض کے سلسلے میں عورتوں کی گواہی پر اعتماد کیا جاسکتا ہے۔ ربیعہؒ کی رائے ہے کہ عورتوں کی شہادت نکاح، طلاق، حدود اور غلاموں کی آزادی کے متعلق تو قابل اعتبار نہیں ہے، البتہ ایسے حقوق اور معاملات جو باہمی رضامندی سے طے پاتے ہیں، ان میں ان کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے۔ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ صرف مالی مسائل میں مردوں کے ساتھ عورتوں کے بیان پر فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ گو کہ مالی مسائل کے تعین میں ان کے درمیان تھوڑا سا اختلاف ہے۔ تمام فقہائے احناف اور عثمان بتیؒ حدود و قصاص کے علاوہ ہر قسم کے مسائل میں عورت اور مرد کی مشترکہ شہادت کو فیصلہ کی بنیاد تسلیم کرتے ہیں۔ ایک روایت سے امام سفیان ثوریؒ کا بھی یہی خیال ظاہر ہوتا ہے۔ ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ قصاص میں بھی مشترکہ گواہی ان کے نزدیک جائز ہے۔ صرف حدود میں وہ اس کو فیصلہ

کے قابل نہیں مانتے۔ طاؤسؒ کہتے ہیں کہ زنا کے علاوہ بقیہ تمام معاملات میں مشترکہ شہادت تسلیم کی جائے گی۔ زنا میں اس لیے نہیں قبول کی جائے گی کہ اس حالت کا بغور دیکھنا عورتوں کے لیے جائز نہیں ہے۔ عطاء بن ابی رباحؒ کی رائے میں زنا اور دوسرے معاملات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ زنا میں بھی اگر تین مرد اور دو عورتیں گواہی دیں تو وہ قبول کی جائے گی۔

شہادت کی اہمیت

فقہاء نے خواہ بعض معاملات میں عورت کی شہادت قبول کی ہو یا کل معاملات میں، لیکن جس حد تک بھی اس کی گواہی پر بھروسہ کیا ہے اس حد تک وہ اس کی ذہنی صلاحیتوں کا اعتراف ہے، کیوں کہ شہادت سادہ سی خبر اور اطلاع کو نہیں کہا جاتا بلکہ شہادت نام ہے کسی واقعہ کو اس کی حقیقی شکل میں مطالعہ کرنے اور اس کی ٹھیک ٹھیک تعبیر اور بیان کا۔ یہ کوئی آسان اور سہل کام نہیں ہے، بلکہ ایک بھاری ذمے داری ہے جو آدمی اپنے سر لیتا ہے۔ اتنی بھاری ذمے داری کہ حاکمِ وقت اس کے مطابق بڑے سے بڑے اقدام کرنے پر مجبور ہے۔ درمختار میں ہے:

وَ حُكْمُهَا وُجُوبُ الْحُكْمِ عَلَى الْقَاضِیْ بِمُوْجِبِهَا بَعْدَ التَّزْكِيَةِ فَلَوِ امْتَنَعَ بَعْدَ وُجُوْدِ شَرَائِطِهَا اَثِمَ لِتَرْكِهِ الْفَرْضَ وَ اسْتَحَقَّ الْعَزْلَ لِفِسْقِهٖ وَ عُذِّرَ لِارْتِكَابِهٖ مَا لاَ يَجُوْزُ شَرْعًا وَ كُفِّرَ اِنْ لَمْ يَرَ الْوُجُوْبَ۔[1]

شہادت کا حکم یہ ہے کہ تحقیق کے بعد قاضی پر اس کے مطابق فیصلہ کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ اگر شرائط کے پائے جانے کے بعد وہ فیصلہ سے رکتا ہے تو گناہ گار ہوگا، کیوں کہ وہ اس طرح ایک فرض کا تارک بن رہا ہے اور اپنے اس فسق کی وجہ سے معزولی کا مستحق ہوگا اور اس کی تعزیر کی جائے گی اس لیے کہ وہ ایسی حرکت کا مرتکب ہو رہا ہے جو شرعاً جائز نہیں ہے اور اگر وہ اس کے مطابق فیصلہ کو واجب ہی نہ سمجھے تو اس کی تکفیر کی جائے گی۔

---

[1] ابن نجیم، الدر المختار مع رد المحتار: ۸ / ۱۷۴

اسی وجہ سے ہمارے فقہاء نے لکھا ہے:

اَهْلِيَةُ الْقَضَاءِ تَدُوْرُ مَعَ اَهْلِيَةِ الشَّهَادَةِ.[1]	جہاں شہادت کی اہلیت ہوتی ہے وہاں قضا کی بھی اہلیت ہوتی ہے۔

یعنی اگر کوئی شخص کسی معاملہ میں شہادت دے سکتا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس معاملہ میں فیصلہ کرنے کا بھی اہل ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن معاملات میں عورت کی شہادت قابل قبول ہے ان میں وہ فیصلہ بھی کرسکتی ہے۔ اس لیے عورت کی شہادت کے معاملہ میں فقہاء کے خیالات کے تجزیہ کی ضرورت محسوس ہوتی ہے، تاکہ یہ بات واضح ہوسکے کہ کن ذمے داریوں کا بوجھ وہ اٹھا سکتی ہے اور کن ذمے داریوں کا بار اس پر نہیں ڈالا جائے گا۔

عورت کی گواہی سے متعلق فقہاء کے خیالات کا تجزیہ

عورت کی شہادت سے متعلق فقہاء کے جو خیالات ابھی پیش کیے گئے ہیں ایک طرف ان سب کا رد کر دینا دشوار بلکہ ناممکن ہے تو دوسری طرف ان کو جوں کا توں قبول کرنا بھی مشکل ہے۔ کیوں کہ کسی ایک پہلو میں کسی فقیہ کا قول عقل و شریعت سے ہم آہنگ نظر آتا ہے تو دوسرے پہلو میں دوسرے فقیہ کی رائے وزنی معلوم ہوتی ہے۔ یہاں کوشش کی جائے گی کہ ان مختلف افکار کی روشنی میں اصولِ دین اور فہم انسانی سے قریب تر رائے دریافت کی جائے۔

امام مالکؒ ہوں یا امام شافعیؒ یا فقہاء کا وہ گروہ جو صرف قرض یا مالی مسائل کی حد تک شہادتِ نسواں کو جائز سمجھتا ہے، اس کی رائے اس تصور پر مبنی ہے کہ عورت کا حافظہ اور فہم اصلاً اس قابل نہیں ہوتا کہ کسی معاملہ میں اس پر اعتبار کیا جائے، مگر چوں کہ بعض حالات میں اس کی عقل و فہم پر اعتماد کیے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں ہوتا، اس لیے مجبوراً اس کی شہادت کی بنیاد پر معاملات کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔ چناں چہ مالکی فقہ کی مشہور

---

[1] کاشانی، بدائع الصنائع: ۷/ ۴

کتاب مدوّنہ میں لکھا ہے:

شَهَادَةُ النِّسَاءِ اِنَّمَا جَازَتْ عَلٰی وَجْهِ الضَّرُوْرَةِ[۱]

عورتوں کی گواہی ضرورت کی بنا پر جائز ہوتی ہے۔

اس نقطۂ نظر کی اساس ایک تو اس بات پر ہے کہ قرآن مجید نے مختلف مسائل ــــ زنا، قذف، طلاق اور اس سے رجوع، وصیت، قرض، لین اور دین ــــ سے بحث کرتے ہوئے شہادت کے احکام بیان کیے ہیں، لیکن صرف قرض کے سلسلے میں عورت کی شہادت کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے خود وہ الفاظ ہیں، جن میں اس کی شہادت کا حکم بیان ہوا ہے:

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّ امْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰهُمَا الْاُخْرٰی ط

(البقرۃ:۲۸۲)

گواہ بناؤ اپنے مردوں میں سے دو کو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ یہ گواہ ان لوگوں میں سے ہوں، جن کو تم گواہ کی حیثیت سے پسند کرتے ہو۔ (ایک مرد کی جگہ دو عورت اس لیے کہ) ایک بھول جائے تو دوسری یاد دلادے۔

ان دونوں باتوں سے ان بزرگوں نے یہ سمجھا کہ قرض یا اس نوعیت کے دیگر مسائل کے علاوہ بقیہ معاملات میں اس کی شہادت جائز نہیں ہے اور قرض کی نوعیت کے مسائل میں بھی اس کی شہادت کے قبول کیے جانے کی وجہ یہ ہے کہ قدم قدم پر ان حالات سے سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ہر وقت صرف مردوں کی شہادت کا فراہم ہونا دشوار ہے۔

پھر آیت کے ظاہر الفاظ کی بنا پر یہ اصول بھی ان حضرات نے وضع کیا ہے کہ عورت کی شہادت اسی وقت قابل قبول ہوگی جب کہ گواہی دینے میں اس کے ساتھ مرد بھی شریک ہو، کیوں کہ عورت کی شہادت کا جواز بر بنائے ضرورت ہے، اس لیے جس

---

[۱] المدونۃ الکبریٰ، جلد ۴، صفحہ ۸۳

شکل میں اور جس حد تک اجازت دی گئی ہے اس سے تجاوز صحیح نہیں ہوگا۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں:

فَلاَ یَجُوزُ مِنْ شَهَادَتِهِنَّ شَیْءٌ وَ اِنْ کَثُرْنَ اِلاَّ وَ مَعُهُنَّ رَجُلٌ[1]

عورتوں کی کسی قسم کی شہادت جائز نہیں ہے خواہ وہ زیادہ ہی کیوں نہ ہوں، الاّ یہ کہ ان کے ساتھ کوئی مرد ہو۔

ہمارے خیال میں یہ تینوں باتیں درست نہیں ہیں۔ پہلی بات اس لیے درست نہیں ہے کہ احکام شریعت دونوں اصنافِ انسانی کے لیے عام ہوتے ہیں، کسی حکم کے ذیل میں صراحت کے ساتھ عورت کا ذکر نہ کیے جانے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہاں اس کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اس طرح تو شریعت کے بیشتر احکام کی وہ مکلّف ہی نہیں رہے گی۔

قرآن مجید کے الفاظ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بھی صحیح نہیں ہے کہ عورت کی شہادت بر بنائے ضرورت قبول کی گئی ہے، کیوں کہ خود اس مسلک کے حاملین تسلیم کرتے ہیں کہ گواہی دینے والے مردوں کے ہوتے ہوئے بھی ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت قبول کی جاسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ میں ایک عملی صورتِ حال سے بحث کی گئی ہے اور وہ یہ کہ قرض کا لین دین ہو یا اسی نوعیت کے دوسرے معاملات، ان سے واسطہ عموماً مردوں ہی کو پڑتا ہے، اس لیے شریعت نے یہاں اصلاً ان کی شہادت کے احکام بیان کیے ہیں۔ عورت کو اپنی خانگی مصروفیات کی بنا پر ان معاملات میں شرکت کا بہت کم موقع ملتا ہے۔ لہٰذا اس کی شہادت کا تذکرہ بھی ضمناً کیا گیا ہے۔

اسی طرح ان حضرات کا یہ استدلال بھی تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ عورت کی شہادت کے قابل قبول ہونے کے لیے کسی نہ کسی مرد کا شریکِ شہادت ہونا ضروری ہے۔ اس لیے کہ اگر اس استدلال کو صحیح قرار دیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ شہادت کی جو دو صورتیں اس آیت میں بیان کردی گئیں ہیں، کسی دعویٰ کے اثبات کی بس وہی دو

---

[1] امام شافعیؒ، کتاب الام: ۷/ ۴۳

صورتیں ہیں۔ حالاں کہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ مانتے ہیں کہ آیت میں جن صورتوں کا ذکر ہے ان سے ہٹ کر اگر کوئی شخص اپنے دعوے پر صرف ایک گواہ پیش کرے اور قسم کھائے تو اس کا دعویٰ ثابت ہو جائے گا۔

حنفیہ نے اس نقطۂ نظر کی خامیاں بھی واضح کی ہیں اور نسبتاً وسیع پس منظر میں اسے دیکھنے کی بھی کوشش کی ہے۔

فقہ حنفی کے خیالات سے اسی اسکول کے ایک بہت بڑے محقق علامہ ابو بکر جصاصؒ نے تفصیل سے بحث کی ہے۔ ذیل کی سطور میں ہم ان کی بحث کو اپنے الفاظ اور اپنی ترتیب کے ساتھ پیش کرتے ہیں:

آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دو مرد موجود نہ ہوں تو اس صورت میں ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ بنایا جائے، بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ گواہ دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہوں، کیوں کہ تمام مسلمانوں کا کم از کم اس حد تک اجماع ہے کہ دو مردوں کی عدم موجودگی میں ایک مرد اور دو عورتیں گواہ بن سکتی ہیں تو گویا یوں کہنا چاہیے کہ قرآن مجید نے شہادت کی دو مختلف صورتیں بیان کی ہیں۔

جب عورت کی یہ حیثیت تسلیم کرلی گئی کہ وہ گواہ بن سکتی ہے تو جس معاملہ میں بھی شہادت کی ضرورت پڑے ہم اس کو بطور گواہ پیش کرسکتے ہیں۔ مثلاً نبی ﷺ کا ارشاد ہے: لاَ نِكَاحَ اِلَّا بِوَلِيٍّ وَ شَاهِدَيْنِ (ایک ولی اور دو گواہوں کے بغیر نکاح جائز نہیں ہے)۔ آیت میں بیان کردہ اصولِ شہادت کے مطابق ہمارے لیے جائز ہوگا کہ نکاح میں یا تو دو مردوں کو گواہ بنائیں یا ایک مرد اور دو عورتوں کو۔ اسی طرح شریعت کے اس ضابطہ اَلْبَيِّنَةُ عَلَى الْمُدَّعِيْ وَالْيَمِيْنُ عَلَى الْمُدَّعٰى عَلَيْهِ (دعویٰ کرنے والے پر دلیل فراہم کرنے کی ذمے داری ہے، بصورتِ دیگر جس کے خلاف دعویٰ دائر کیا جائے وہ قسم کھائے گا) کے تحت اگر کوئی شخص اپنے دعویٰ کی دلیل میں مشترکہ شہادت پیش کرے تو اس کا دعویٰ ثابت ہو جانا چاہیے۔

خود آیت کے الفاظ ــــ 'جب تم ایک مقررہ مدت کے لیے قرض کا معاملہ کرو' دلالت کرتے ہیں کہ عورت کی گواہی صرف مالیات تک محدود نہیں ہے، کیوں کہ قرآن نے ان الفاظ کے ذریعے نہ صرف قرض کے سلسلے میں اس کی شہادت تسلیم کی ہے، بلکہ ادائی قرض کے لیے جو مدت متعین کی جائے اس کے متعلق بھی اس کے بیان پر اعتماد کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہ تو کوئی شخص نہیں کہہ سکتا کہ مدت کا تعلق صرف مالیات سے ہوتا ہے، کیوں کہ کفالتِ نفس اور آزاد انسانوں سے غیر مالی قسم کے منافع کی بھی مدت مقرر ہوسکتی ہے۔ اسی طرح دعویٰ قتل یا معافی قتل کے دعویٰ پر دلیل فراہم کرنے کے لیے حاکم ایک خاص وقت تک مہلت دے سکتا ہے۔ اگر کچھ دیر کے لیے یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ مدت کا تعلق صرف مالیات سے ہے، تب بھی یہ لازم آتا ہے کہ نکاح کے سلسلے میں اس کی شہادت قبول کی جائے، کیوں کہ کسی شخص کے لیے ایک نامحرم عورت سے استمتاع کا حق مہر کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ایک خالص مالی معاملہ ہے۔

اسی طرح ظاہر الفاظ کا تقاضا یہ ہے کہ قرض کی نوعیت رکھنے والے تمام معاملات میں مرد اور عورت کی مشترکہ شہادت کو قبول کیا جائے۔ اب ہمیں دیکھنا چاہیے کہ قرض کا مطلب کیا ہے؟ اس کا مطلب سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ ایک چیز دی تو جائے فی الحال، اور اس کا بدل بعد میں ادا کیا جائے۔ یہ صورت بہت سے معاملات میں پیدا ہوسکتی ہے۔ مثلاً ایک شخص نکاح کے ذریعے کسی نامحرم عورت سے استمتاع کا حق حاصل کرے اور یہ طے کرے کہ اس کا عوض یعنی مہر بعد میں دے گا۔ یا قتل کے سلسلے میں مال پر صلح ہو جائے تو یہ مال قتل کا عوض بن جائے گا۔ کرایوں میں بھی یہی صورت ہوتی ہے کہ ایک چیز اس وقت دی جا رہی ہے جس کا عوض بعد میں ہمیں مل رہا ہے، گویا قرض کا لفظ اپنے مفہوم کے اعتبار سے بہت ہی وسیع ہے۔ اس لیے قرآن کے حکم کے مطابق یہ مفہوم معاملات کی جن جن شکلوں پر حاوی ہو ان سب میں عورت کی شہادت قبول کی جانی چاہیے۔

ہمارے خیالات کی تائید بہت سے عملی نظائر سے بھی ہوتی ہے۔ حضرت حذیفہؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے قابلہ (دایہ) کی شہادت قبول کی۔ ظاہر ہے، ولادت کا تعلق مالیات سے قطعاً نہیں ہے۔ ولادت کے معاملہ میں تمام لوگ متفق ہیں کہ عورت کی گواہی جائز ہے۔ اگر اختلاف ہے تو نصابِ شہادت میں، نہ کہ نفسِ شہادت میں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کی شہادت مالیات کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔

عطاء بن ابی رباحؒ کہتے ہیں کہ حضرت عمرؓ نے نکاح کے سلسلے میں ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت کو جائز قرار دیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ سے بھی اسی قسم کی روایت منقول ہے۔ ابو لبیدؒ کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ نے طلاق کے سلسلے میں عورت کی گواہی کو معتبر مانا ہے۔ عطاءؒ تابعی اور شعبیؒ نے بھی طلاق کے معاملہ میں عورت کی شہادت قبول کی ہے۔ محمدؒ بن حنفیہ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ شادی بیاہ سے متعلق عورتوں کی گواہی جائز ہے۔ قاضی شریحؒ نے غلامی کے معاملہ میں مشترک شہادت کو صحیح مانا ہے۔

ان دلائل کی بنا پر ہمارا خیال ہے کہ مشترک شہادت ہر معاملہ میں قابلِ قبول ہونی چاہیے، الّا یہ کہ شریعت کسی خاص معاملہ میں اس کی شہادت کو ماننے سے انکار کردے، جیسا کہ اس نے حدود و قصاص میں کیا ہے۔ امام زہریؒ روایت کرتے ہیں:

مَضَتِ السُّنَّةُ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ وَالْخَلِيْفَتَيْنِ مِنْ بَعْدِهٖ اَنْ لَّا تَجُوْزُ شَهَادَةُ النِّسَآءِ فِي الْحُدُوْدِ وَلَا فِي الْقِصَاصِ[1]

رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے بعد کے دو خلفاء حضرت ابو بکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کی یہ سنت رہی ہے کہ وہ حدود اور قصاص میں عورتوں کی شہادت کو جائز نہیں سمجھتے تھے۔

عورت کی شہادت پر فقہ حنفی کے ایک اور نامور محقق علامہ ابن الہمامؒ نے ایک دوسرے پہلو سے بحث کی ہے۔ اس بحث میں جو باتیں اوپر گزر چکی ہیں، ان کو حذف کرکے بقیہ اہم نکات یہاں درج کیے جا رہے ہیں، اس سے امید ہے مسئلہ زیادہ

[1] جصاص، احکام القرآن: ۱/ ۶۰۸-۶۱۰

وضاحت کے ساتھ نکھر کر سامنے آسکے گا۔ شہادت کی چار قسمیں ہیں:

(۱) زنا کی شہادت۔ یہ شہادت مکمل ہوتی ہے چار مردوں کے متفقہ بیان سے، چناں چہ قرآن مجید کا ارشاد ہے: فَاسْتَشْهِدُوا عَلَيْهِنَّ أَرْبَعَةً مِّنكُمْ (پس تم گواہ بناؤ زنا کا ارتکاب کرنے والیوں پر اپنے میں سے چار کو)۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے مردوں سے خطاب کرتے ہوئے ''اپنے میں سے چار'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اب اگر تین مردوں اور دو عورتوں کی شہادت قبول کی جاتی ہے تو قرآن کے بتائے ہوئے عدد اور معدود دونوں کے خلاف پڑتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ مشترک شہادت کے عام اصول اور اس آیت میں تعارض ہے۔ یعنی اس اصول کا تقاضا تو یہ ہے کہ ہر معاملہ میں عورت کی شہادت معتبر مانی جائے، لیکن یہ آیت زنا کے سلسلے میں اس کی گواہی قبول کرنے سے روکتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس دوسری آیت کو اس عام اصول پر مقدم کیا جائے گا، کیوں کہ قاعدہ یہ ہے کہ جواز اور حرمت کے درمیان جہاں مقابلہ ہو تو حرمت ہی پر عمل ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ شریعت کا حکم ہے کہ جہاں تک ہوسکے حدود کو رفع کرو، اگر اثباتِ زنا کے لیے یہ ضروری قرار دیا جائے کہ اس کے گواہوں میں صرف مرد ہی ہوں اور عورت نہ ہو تو اس شرط کی وجہ سے زنا کے ثابت کرنے میں اتنی آسانی نہیں رہے گی جتنی آسانی کہ اس شرط کے نہ ہونے کی صورت میں ہوسکتی ہے۔ اس طرح منشائے شریعت کی تکمیل میں آسانی ہوگی۔

تیسری بات یہ کہ قرآن نے جن الفاظ میں عورت کی شہادت قبول کرنے کا حکم دیا ہے۔ یعنی اگر شاہد دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کو گواہ مقرر کرو۔ اس کا مطلب گو یہ نہیں ہے کہ مشترک شہادت کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے اور وہ دو مردوں کی شہادت کا بدل ہے۔ لیکن بہرحال ان الفاظ سے بدلیت کا شبہ پیدا ہوتا ہے۔ چناں چہ بعض علماء اس طرف گئے بھی ہیں اور شبہ کے ہوتے ہوئے حدود میں فیصلہ کرنا

صحیح نہیں ہے۔

(۲) زنا کے علاوہ بقیہ حدود کی شہادت۔ اس میں بھی مذکورہ بالا اسباب کی بنا پر عورت کی شہادت معتبر نہیں ہے۔ البتہ ان کے ثبوت کے لیے بجائے چار کے دو مرد کافی ہیں۔ قصاص کا بھی یہی حکم ہے۔

(۳) شہادت کی تیسری قسم میں حدود و قصاص اور عورت کے مخصوص مسائل کے علاوہ دوسرے تمام معاملات داخل ہیں، خواہ ان کا تعلق مالی حقوق سے ہو یا نہ ہو۔ مثلاً نکاح، طلاق سے رجوع، عدت، استبراءِ رحم، اولاد، حسب و نسب، وقف، صلح، ہبہ، اقرار، وصیت، وکالت، اور غلاموں کا آزاد کرنا وغیرہ۔ ان تمام معاملات میں دو مردوں کی شہادت بھی قابلِ قبول ہے اور ایک مرد اور دو عورتوں کی بھی۔

(۴) رہے ایسے مسائل جن کا علم صرف عورتوں ہی کو ہوسکتا ہے۔ مثلاً ولادت، دوشیزگی، قابلِ ستر مقامات کے عیوب وغیرہ، تو ان میں ایک عورت کی گواہی بھی کافی ہے اور اگر مرد ہوں تو اور بھی اچھا ہے۔[1]

اس بحث کا سب سے وزنی اور قیمتی پہلو یہ ہے کہ حنفیہ نے بعض دوسرے فقہاء کے مقابلہ میں وسعتِ نظر کے ساتھ مسئلہ کا مطالعہ کیا ہے اور نصوصِ شریعت کے پیچھے جو اسباب اور حکمتیں کام کر رہی ہیں ان کو پیش نظر رکھا ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے عورت کی عقل و فہم کو بالکلیہ ناقابلِ اعتبار، یا زندگی کے صرف ایک یا چند پہلوؤں ہی میں لائق توجہ نہیں قرار دیا، بلکہ بیشتر معاملات میں اس پر بھروسہ کیا ہے، لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ فقہِ حنفی اس بات کا کوئی فیصلہ نہیں کرسکی ہے کہ کن مسائلِ حیات میں کس حد تک اس کی ذہنی قوتوں پر اعتماد صحیح ہے؟ اسی وجہ سے ہمیں ان کے خیالات میں کسی قدر تضاد کا احساس ہوتا ہے۔

حنفیہ نے زندگی کے مختلف مسائل کو جس طرح تقسیم کیا ہے اس میں زنا اور

---

[1] ابن الہمام، فتح القدیر: ۷/ ۳۴۳-۳۴۵

مخصوص نسوانی مسائل کے علاوہ بقیہ مسائل کے فیصلے کے لیے کم از کم دو شہادتوں کو ضروری قرار دیا ہے۔ ہم یہاں اس شرط کی قطعیت سے بحث نہیں کر رہے ہیں کہ آیا ہر حال میں دو شہادتیں لازم ہیں، یا ایک شہادت کی بنیاد پر بھی فیصلہ ہوسکتا ہے؟ تھوڑی دیر کے لیے اس شرط کو تسلیم کرتے ہوئے یہ سوال بہرحال پیدا ہوتا ہے کہ نسوانی مسائل اور دیگر مسائل میں کون سا بنیادی فرق ہے، جس کی وجہ سے پہلے قسم کے مسائل میں صرف ایک شہادت کافی ہو جاتی ہے اور دوسری قسم کے لیے ناکافی؟ اس کا جواب فقہ حنفی کے امامِ وقت علاّمہ بدر الدین کاشانی المتوفی ۵۸۷ھ نے دیا ہے۔ پہلے اسے ملاحظہ کیجیے۔ فرماتے ہیں:

> ''سوائے پیغمبر کے کسی بھی شخص کی شہادت سے قطعی اور یقینی علم حاصل نہیں ہوتا، کیوں کہ اس میں بہرحال کسی نہ کسی پہلو سے غلطی کا احتمال باقی رہتا ہے۔ صرف پیغمبر ہی کی شخصیت ایسی ہوتی ہے کہ اس کا بیان ہر شک و شبہ سے بالاتر ہوتا ہے۔ کسی صادق و امین انسان کی گواہی زیادہ سے زیادہ 'ظن غالب' کا فائدہ دے سکتی ہے اور 'ظنِ غالب' کے حصول کے لیے ایک قابل اعتماد آدمی کی شہادت بھی کافی ہے (خواہ وہ مرد ہو یا عورت) قرآن مجید نے شہادت کے جو اصول مقرر کیے ہیں وہ خالص تعبّدی ہیں اور ان کی حکمت عقل کی گرفت میں نہیں آتی۔ اس لیے ان اصولوں کی جو شکلیں شریعت نے متعین کردی ہیں، ہم پر اس کی پابندی لازم ہے اور باقی صورتوں میں مذکورہ بالا قاعدہ پر عمل ہوگا۔ چناں چہ اس نے عورت کی شہادت کی ایک خاص صورت کا ذکر کیا ہے جب کہ وہ مرد کے ساتھ مل کر گواہی دے رہی ہو، لیکن جن معاملات میں صرف عورتیں گواہ ہوں ان کے متعلق قرآن خاموش ہے۔ ان میں ہم اسی قاعدۂ کلیہ پر عمل کریں گے۔ اس کی تائید آں حضور ﷺ کے اسوہ سے بھی ہوتی ہے کہ آپؐ نے ولادت کے سلسلے میں ایک دایہ کی شہادت قبول کی۔''[1]

اس دلیل پر کئی ایک اعتراضات واقع ہوتے ہیں۔ پہلا اعتراض یہ ہے کہ اس دلیل کو اگر صحیح مان لیا جائے تو عورت کے مخصوص مسائل میں ایک عورت کی شہادت تو

---

[1] کاشانی، بدائع الصنائع: ۶/۴۲۱، ۴۲۲

کافی ہونی چاہیے، لیکن ایک مرد کی شہادت ناکافی۔ کیوں کہ شریعت نے گواہی کی جو صورتیں پیش کی ہیں ان میں یا تو مردوں کی گواہی کا ذکر ہے یا ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی کا۔ صرف ایک مرد کی شہادت کا ذکر نہیں ہے۔ لیکن حنفیہ کے پاس اس کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں ہے کہ جن مسائل میں ایک عورت کی گواہی معتبر ہو، ان میں بدرجہ اولیٰ ایک مرد کی گواہی پر اعتبار کیا جانا چاہیے۔

اس اصول کا دوسرا تقاضا یہ ہے کہ جب 'ظن غالب' کے پیدا کرنے میں مرد اور عورت برابر ہیں تو دونوں کو مساوی حیثیت ملنی چاہیے، لیکن حنفیہ نے کسی بھی مسئلہ میں عورت اور مرد کی عقل وفہم کو برابر نہیں سمجھا۔

اس کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ دنیا کے ہر معاملہ کے فیصلہ کے لیے صرف ایک گواہی کافی ہونی چاہیے۔ حالاں کہ قرآن نے مختلف معاملات کے لے نصابِ شہادت مختلف مقرر کیا ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ نصابِ شہادت ایک خالص تعبدی حکم ہے، صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ یہ حکم اپنے اندر بہت ہی نمایاں حکمت رکھتا ہے، جسے خود علامہ کاشانی نے تسلیم کیا ہے:

وَلِاَنَّهٗ اِذَا كَانَ فَرْدًا يَخَافُ عَلَيْهِ السَّهْوَ وَالنِّسْيَانَ لِاَنَّ الْاِنْسَانَ مَطْبُوْعٌ عَلَى السَّهْوِ وَ الْغَفْلَةِ فَشَرْطُ الْعَدَدِ فِى الشَّهَادَةِ لِيُذَكِّرَ الْبَعْضُ الْبَعْضَ عِنْدَ اِعْتِرَاضِ السَّهْوِ وَالْغَفْلَةِ كَمَا قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فِىْ اِقَامَةِ اِمْرَأَتَيْنِ مَقَامَ رَجُلٍ فِى الشَّهَادَةِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدَاهُمَا الْاُخْرٰى۔[1]

کیوں کہ جب ایک فرد ہو تو بھول چوک کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے کہ انسان کی فطرت میں سہو اور غفلت داخل ہے۔ شہادت میں عدد کی شرط اس لیے رکھی گئی ہے کہ اگر بھول ہو جائے یا غفلت پیش آ جائے تو گواہ آپس میں یاد دہانی کرا سکیں جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے شہادت میں ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کو رکھنے کی علت بیان کی ہے۔ ''اگر ان میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلا سکے۔''

---

[1] بدائع الصنائع: ۶/ ۴۲۱

اگر واقعتاً یہ حکمت ہے اور ایسی حکمت کہ اس کو نظر انداز کر کے صرف ایک شہادت کی بنا پر فیصلہ کے ہم مجاز نہیں ہیں تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ مخصوص نسوانی مسائل کے فیصلہ کے لیے کم از کم دو عورتوں کی شہادت ضروری قرار دی جائے، جیسا کہ امام مالکؒ کا مسلک ہے اور اس کی ذہنی صلاحیتوں کو ناقص تسلیم کرنے کے بعد تو چار عورتوں کی شہادت کے بغیر فیصلہ صحیح نہیں معلوم ہوتا، جیسا کہ امام شافعیؒ کی رائے ہے۔ اپنے مسلک کی تائید میں حنفیہ نے جس روایت کا حوالہ دیا ہے، اس سے بحث ہم آگے چل کر کریں گے۔

حنفیہ نے ایک اصول یہ بیان کیا ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کی شہادت قبول نہیں کی جائے گی، کیوں کہ اس کا حافظہ کم زور ہونے کی وجہ سے اس کی شہادت میں غلطی کا احتمال رہتا ہے اور شریعت حدود و قصاص کے اثبات کے لیے انتہائی قطعی اور یقینی دلائل کا مطالبہ کرتی ہے، باقی اور معاملات میں اتنی قطعیت کو وہ لازمی نہیں قرار دیتی۔ اس لیے دلائل میں کسی قدر شبہ کے باوجود ان کے متعلق فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

اس اصول کی رو سے حدود و قصاص کے علاوہ بقیہ مسائل کے فیصلے صرف خواتین کی شہادت پر صحیح ہونے چاہئیں۔ لیکن حنفیہ کے نزدیک مخصوص نسوانی مسائل کے علاوہ کسی بھی مسئلہ میں صرف خواتین کی شہادت اس وقت تک قابل قبول نہیں ہے جب تک کہ ان کے ساتھ گواہی میں کوئی مرد شریک نہ ہو۔ اس اعتراض کا جواب انھوں نے یہ دیا ہے کہ:

اِنَّ الْقِيَاسَ يَقْتَضِيْ قُبُوْلَ ذٰلِكَ لٰكِنَّهٗ تُرِكَ ذٰلِكَ كَيْ لَا يَكْثُرَ خُرُوْجُهُنَّ۔[1]	قیاس تو یہی چاہتا ہے کہ تنہا خواتین کی شہادت بھی قبول کی جائے، لیکن اس پر عمل اس لیے نہیں کیا جاتا کہ گھروں سے باہر ان کی بہت زیادہ آمد و رفت نہ ہونے لگے۔

غور کیجیے، یہ کتنی کمزور دلیل ہے کہ ایک شخص چار پختہ سیرت اور قابلِ اعتماد

---

[1] العنایۃ المطبوع علی حاشیۃ فتح القدیر: ۶/ ۳۴۵

خواتین کے سامنے کسی مفلوک الحال اور محتاج انسان کے لیے وصیت کر جاتا ہے۔ کیا شریعت کے تقاضے اس بات کا حکم دیتے ہیں کہ یہ وصیت محض اس مصلحت کی بنا پر نافذ نہ ہو کہ ان خواتین کو گھر سے باہر نہ نکلنا پڑے یا اس بات کا کہ اس مصیبت زدہ شخص کو مصیبت سے نجات دلانے کے لیے ان کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت دی جائے؟

اصل سوال حنفیہ کے اس دعویٰ کے بارے میں پیدا ہوتا ہے کہ ایک مرد کے قائم مقام دو عورتوں کو کرنے کے باوجود ان کے بیان میں غلطی کا احتمال رہتا ہے۔ کیوں کہ انسانی تجربات سے اس دعویٰ کی تائید نہیں ہوتی۔ فرض کیجیے! خاص عورتوں کے کسی مجمع میں جھگڑا ہوتا ہے جس کے نتیجہ میں ایک عورت ہلاک ہو جاتی ہے۔ اس ہلاکت کے اسباب پر انتہائی ثقہ اور عقل وفہم رکھنے والی آٹھ عورتیں متفقہ بیان دیتی ہیں۔ کیا عقل اور تجربہ یہی کہتا ہے کہ ان کے اس بیان کا وزن اتنا بھی نہیں ہے جتنا کہ چار عام مردوں کی شہادت کا ہوتا ہے؟ اس سے بھی زیادہ حیرت یہ سوچ کر ہوتی ہے کہ کسی مالی معاہدہ پر ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت تو حنفیہ کے یہاں قابل اعتماد ہے، لیکن چوری، زنا، قذف وغیرہ مقدمات میں ایک دو نہیں، بیسیوں عورتوں کی گواہی بھی بھروسہ کے لائق نہیں ہے۔ عورت کی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں یہ انتہائی بدظنی ہے۔ تعجب ہے کہ فقہ حنفی میں یہ کیسے جگہ پا گئی؟ اس فقہ کا امتیازی وصف ہی یہ ہے کہ اس کی تعلیمات عقل کو اپیل کرنے والی ہوتی ہیں۔

علامہ ابن حزمؒ نے حقیقت سے کس قدر قریب تر بات کہی ہے:

وَبِضَرُوْرَةِ الْعَقْلِ يَدْرِیْ كُلُّ اَحَدٍ اَنَّهٗ لَا فَرْقَ بَيْنَ امْرَأَةٍ وَ بَيْنَ رَجُلٍ وَ بَيْنَ رَجُلَيْنِ وَ بَيْنَ امْرَأَتَيْنِ وَ بَيْنَ اَرْبَعَةِ رِجَالٍ وَ بَيْنَ اَرْبَعِ نِسْوَةٍ مِّنْ جَوَازِ تَعَمُّدِ

یہ بات بداہتاً ہر شخص جانتا ہے کہ ایک عورت اور ایک مرد اور دو مرد اور دو عورتوں اور چار مرد اور چار عورتوں کے درمیان اس معاملہ میں کوئی فرق نہیں ہے کہ وہ عمداً جھوٹ بولیں اور اس پر متفق ہو جائیں۔ یہی حال غفلت کا ہے خواہ ایک وقت ہی

الْكِـذْبِ وَ التَّـوَاطِيْ عَلَيْـهِ وَ كَذٰلِكَ الْغَفْلَـةِ وَ لَوْ جِئْنَا اِلٰى هٰـذَا لَكَانَ النَّفْسُ اَطْيَبَ عَلٰى شَهَادَةِ ثَمَانِيَ نِسْوَةٍ مِنْهَا عَلٰى شَهَادَةِ اَرْبَعَةِ رِجَالٍ.[1]

سہی (عورت اور مرد دونوں اس کا شکار ہوسکتے ہیں) اس لحاظ سے چار مردوں کی گواہی کے مقابلہ میں آٹھ عورتوں کی گواہی پر دل زیادہ مطمئن ہوتا ہے۔

علامہ ابن قیمؒ لکھتے ہیں:

اِنَّا لاَ نُسَلِّمُ ضُعْفَ شَهَـادَةِ الْمَـرْأَتَيْنِ اِذَا اجْتَمَعَتَـا وَ لِهٰـذَا نَحْكُمُ بِشَهَادَتِهِمَا مَعَ الرَّجُلِ وَ اَمْكَنَهُ اَنْ يَّأْتِيَ بِرَجُلَيْنِ فَالرَّجُـلُ وَالْمَرْأَتَانِ اَصْلٌ لاَ بَدَلٌ وَالْمَرْأَةُ الْعَدْلُ كَا لرَّجُلِ فِي الصِّدْقِ وَ الْاَمَانَةِ وَالدِّيَانَـةِ اِلَّا اَنَّهَـا لِمَـا خِيْفَ عَلَيْهَـا السَّهْوَ وَالنِّسْيَانَ قَوِيَتْ بِمِثْلِهَـا وَ ذٰلِكَ قَـدْ يَجْعَلُهَـا اَقْـوٰى مِـنَ الرَّجُـلِ الْوَاحِدِ اَوْ مِثْلَـهُ وَلاَ رَيْبَ اَنَّ الظَّنَّ الْمُسْتَفَادَ مِنْ رَجُـلٍ وَاحِدٍ دُوْنَهُمَا وَ دُوْنَ اَمْثَالِهَا.[2]

ہم یہ تسلیم نہیں کرتے کہ دو عورتوں کی شہادت کمزور ہوتی ہے جب کہ وہ اس پر متفق ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم مرد کے ساتھ ان دونوں کی گواہی کی بنیاد پر فیصلہ کرتے ہیں اگرچہ دو مرد گواہوں کا پیش کرنا ممکن ہی کیوں نہ ہو۔ پس ایک مرد اور دو عورتیں اصل ہیں نہ کہ بدل، ایک قابلِ اعتماد عورت سچائی، امانت اور دیانت میں مرد ہی کے مانند ہے، مگر چوں کہ اس پر سہو و نسیان کا اندیشہ کیا جاتا ہے اس لیے اس جیسی دوسری عورت کی تائید اس کو ایک مرد سے زیادہ قوی بنا دیتی ہے یا کم از کم اس کے برابر کر دیتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ایک شخص کی گواہی سے جو گمان حاصل ہوتا ہے وہ ان دونوں یا ان جیسی دوسری عورتوں کی گواہی سے حاصل شدہ گمان سے کم ہوتا ہے۔

حدود میں عورتوں کی شہادت کے قبول نہ کیے جانے پر حنفیہ نے بعض اور دلیلیں جو پیش کی ہیں وہ بھی کم زور ہیں، مثلاً یہ کہ زنا کی شہادت کے سلسلے میں قرآن نے

---

[1] ابن حزم، المحلیٰ: ۹/ ۴۰۳

[2] الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، صفحہ ۱۴۳

مردوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا ہے کہ تم میں سے چار گواہ ہوں، لیکن جیسا کہ ہم اس سے پہلے عرض کر چکے ہیں، اس خطاب میں عورتیں بھی شامل ہیں۔ باقی یہ کہنا کہ عورتوں کو اس حکم میں شامل کرنے سے چار کے عدد میں اضافہ ہوجائے گا، کیوں کہ ایک مرد کی جگہ ایک عورت تو نہیں لی جاسکتی، بلکہ دو عورتوں کو لینا پڑے گا۔ ہمارے خیال میں یہ بات شریعت کے منشا سے کچھ میل نہیں کھاتی، کیوں کہ اہمیت کسی خاص تعداد کی نہیں بلکہ اس تعداد کے ذریعے حاصل ہونے والے یقین کی ہے، اگر دو عورتوں کی شہادت سے ایک مرد کی شہادت کا یقین حاصل ہوتا ہے تو اس کے قبول کرنے میں کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

فقہاء احناف اور دوسرے ان تمام فقہاء کی جنھوں نے حدود و قصاص میں عورت کی شہادت پر اعتبار نہیں کیا ہے، سب سے بڑی دلیل امام زہریؒ کی وہ روایت ہے جو علامہ جصاصؒ کی تقریر کے ذیل میں ہم نے نقل کی ہے، یعنی یہ کہ حضورؐ اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی سنت یہ ہے کہ حدود و قصاص میں عورت کی شہادت قبول نہ کی جائے۔

خود جصاصؒ نے اس روایت کی کوئی سند نہیں پیش کی ہے۔ البتہ ابن الھمامؒ نے اس کو ابن ابی شیبہؒ کے حوالے سے سند کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ابن ابی شیبہؒ نے یہ روایت حفص بن غیاث سے لی ہے، لیکن محدثین ان کو ثقہ اور قابلِ اعتبار قرار دینے کے باوجود مدلّس سمجھتے ہیں[1] اگر ان کی اس کم زوری کو نظر انداز کر دیا جائے تو بھی روایت حجت کے قابل نہیں معلوم ہوتی، کیوں کہ حفص کو یہ روایت حجاج بن ارطاۃ کے واسطہ سے ملی ہے اور حجاج بن ارطاۃ نے اس کو امام زہری سے بیان کیا ہے۔ حجاج بن ارطاۃ پر بھی تدلیس کا متفقہ الزام ہے، اسی لیے بیشتر محدثین کے نزدیک ان کی روایات قابلِ قبول نہیں ہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ یحیٰؒ بن معین اسی سے انکار کرتے تھے کہ

---

[1] تہذیب التہذیب: ۲ / ۳۷۴،۳۷۵

حجاج نے امام زہری کو دیکھا ہے اور ان کے متعلق اتنی خراب رائے رکھتے تھے کہ ہمیں مزید گفتگو کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔

کہتے ہیں کہ حجاج بن ارطاۃ نے خود مجھ سے کہا کہ ذرا امام زہری کا حلیہ بیان کرو، کیوں کہ میں نے انھیں دیکھا نہیں ہے۔[۱]

اسی وجہ سے علامہ ابن حزمؒ نے اس روایت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے۔[۲]

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام ہر معاملہ میں شہادتِ نسواں کو جائز سمجھتا ہے، ہاں اس کی رائے یہ ضرور ہے کہ جن امور کا تعلق براہِ راست مرد کی عملی زندگی سے ہے اور جو عورت کے دائرۂ کار سے خارج ہیں ان کے متعلق اس کی شہادت میں مرد کی شہادت سے کہیں زیادہ سہو و نسیان کا امکان ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی حقیقت تک رسائی میں آدمی کی فکر و فہم کے ساتھ اس کی ذہنی ساخت اور عملی سرگرمیوں کا بھی دخل ہوتا ہے۔ ایک واقعہ کسی کے دامنِ توجہ کو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور وہ اس کی تہ تک پہنچنے اور اس کے مالہ و ماعلیہ سے واقف ہونے کی سعی کرتا ہے، لیکن دوسرے شخص کے لیے اس واقعہ میں کشش اور جاذبیت نہیں ہوتی اور وہ سرسری طور پر اس سے گزر جاتا ہے۔ ایک کاروباری آدمی کا ذہن علمی مسائل میں اتنی مستعدی سے کام نہیں کرتا جتنا کہ ایک طالب علم کا کرتا ہے، بلکہ خود علم کے مختلف شعبوں کا یہ حال ہے کہ ایک شعبہ کے ماہر کو دوسرے شعبہ کی معلومات اخذ کرنے میں دشواری پیش آتی ہے۔ یہی حال عورت کا ہے۔ اس کا ذہنی سانچہ اور اس کے عمل کی دنیا دونوں ہی مرد کے ذہنی سانچہ اور اس کی عملی دنیا سے مختلف ہیں۔ اس لیے وہ اپنے حدود و عمل سے باہر ہونے والے واقعات کا مشاہدہ اور ضبط اتنی عمدگی کے ساتھ نہیں

۱۔ حجاج بن ارطاۃ کے لیے ملاحظہ ہو میزان الاعتدال، جلد ۱، صفحہ ۲۱۳۔ تہذیب التہذیب، جلد ۲، صفحہ ۱۸۱ تا ۱۸۳

۲۔ ابن حزم، المحلی: ۹/ ۴۰۳

کرسکتی جتنی عمدگی کے ساتھ مرد کرسکتا ہے، لیکن اس کے باوجود شریعت نے ان واقعات میں بھی اس کی شہادت قبول کی ہے۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ شریعت عورت کی ذہنی صلاحیتوں پر ان امور میں بھی اعتماد کرتی ہے جو اس کی افتادِ طبع اور عملی سرگرمیوں سے کلی طور پر ہم آہنگ نہیں ہیں۔

رہے وہ معاملات، جن میں وہ شب و روز لگی رہتی ہے اور جو اس کے ذوق اور رجحان سے پوری طرح مطابقت رکھتے ہیں، ان میں شریعت نے اس کی گواہی کو مرد کی گواہی کی سی حیثیت دی ہے، بلکہ شعبیؒ تو کہتے ہیں:

مِنَ الشَّهَادَاتِ مَا لَا يَجُوْزُ فِيْهِ اِلَّا شَهَادَةُ النِّسَاءِ[1]	شہادت کی بعض ایسی قسمیں ہیں جن میں صرف عورتوں ہی کی شہادت جائز ہے۔

کسی واقعہ کا ثبوت صرف ایک یا دو آدمیوں کی زبانی شہادت ہی پر منحصر نہیں ہوتا، بلکہ بہت سے داخلی اور خارجی آثار و علامات اصل حقیقت کی غمازی کرتے ہیں، لیکن یہ علامات زیادہ تر صریح اور قطعی نہیں ہوتے بلکہ اشاراتی ہوتے ہیں۔ اس لیے شریعت نے فیصلہ کی بنیاد انسانوں کی قطعی اور دوٹوک گواہی پر رکھی ہے۔ البتہ بعض مخصوص معاملات کے سوا تمام معاملات میں ان علامات کو بہت زیادہ اہمیت دی ہے۔ اگر یہ علامات کہیں واضح شکل میں موجود ہوں یا احتیاط اور تقویٰ کسی خاص طرح کے فیصلہ کا تقاضا کر رہے ہوں تو اس نے صرف ایک گواہ کو بھی کافی سمجھا ہے۔ عورت کے مخصوص مسائل میں بھی اس کا یہی طریقہ ہے۔

امام زہریؒ فرماتے ہیں: تین مختلف گھرانوں کے درمیان شادی بیاہ کے ذریعے رشتہ قائم ہونے کے بعد ایک عورت حضرت عثمانؓ کے پاس آئی اور اس نے کہا کہ یہ سب میری رضاعی اولاد ہیں اور میں نے ان کو دودھ پلایا ہے۔ حضرت عثمانؓ نے اس کی شہادت کی بنا پر ان کے نکاح فسخ کرا دیے۔

---

[1] الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، صفحہ ۱۳۴

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ رضاعت کے سلسلے میں حضرت عثمانؓ کے فیصلہ ہی پر لوگوں کا عمل ہے۔[1]

روایت حدیث میں عورت پر اعتماد

اسی طرح امت نے زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اس کی روایت کردہ احادیث پر کلّی اعتماد کیا ہے اور مردوں اور عورتوں کی روایات میں کسی قسم کا فرق کیے بغیر دونوں کو یکساں اہمیت دی ہے۔ اس اہمیت کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جاسکتا ہے کہ مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ کی بہن فریعہؓ کے شوہر کے چند اونٹ فرار ہوگئے تھے، وہ ان کی تلاش میں روانہ ہوئے اور پا بھی گئے، لیکن اچانک اونٹوں نے پلٹ کر ان پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجہ میں وہ ہلاک ہوگئے۔ فریعہؓ نے حضورؐ سے اس کا تذکرہ کیا اور کہا کہ میرے شوہر کا انتقال ہوگیا ہے، لیکن انھوں نے نہ تو میرے لیے کوئی نان نفقہ چھوڑا ہے اور نہ اپنے بچوں کے لیے رہنے کی کوئی جگہ، اس لیے میں اپنے بھائیوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ آپؐ کا کیا حکم ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: عدت کے دن تمھیں اسی مکان میں گزارنے ہوں گے، جس میں تمھیں اپنے شوہر کے انتقال کی خبر ملی ہے۔

حضرت عثمانؓ کے سامنے ان کے دورِ حکومت میں اسی قسم کا مسئلہ پیش ہوا۔ لوگوں نے ان کو بتایا کہ فریعہؓ کے ساتھ یہ معاملہ پیش آچکا ہے اور حضورؐ نے ان کو جو حکم دیا تھا وہ معلوم کرلیا جائے۔ فریعہؓ کہتی ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے مجھے بلایا۔ میں پہنچی تو وہ بعض اور لوگوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے اپنے متعلق حضورؐ کا فیصلہ ان کو سنایا تو انھوں نے میری نظیر پر عمل کیا اور جس عورت کا مسئلہ تھا اسے حکم دیا کہ جس مکان میں اس کے شوہر کا انتقال ہوا ہے، اسی میں عدت گزارے۔[2] اس طرح حضرت عثمانؓ نے فریعہؓ کی روایت کو قانونی حیثیت دے دی۔

---

[1] الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، صفحہ ۳۸

[2] ابن سعد، الطبقات الکبریٰ: ۸/ ۳۶۷

بعض بعض احادیث ہم تک ایسی سندوں سے پہنچی ہیں، جن میں کئی کئی خواتین موجود ہیں۔ مثلاً فتن سے متعلق ایک حدیث امام مسلم نے ابوبکر بن ابی شیبہ، سعید بن عمرو، زہیر بن حرب اور ابن ابی عمر سے لی ہے۔ ان چاروں نے سفیان بن عیینہ سے، سفیان بن عیینہ نے امام زہری سے، امام زہری نے عروہ سے، عروہ نے زینب بنت ابی سلمہ سے، انھوں نے حبیبہ سے، انھوں نے اپنی ماں ام حبیبہ سے، اور انھوں نے زینب بنت جحش سے اس کی روایت کی ہے۔[1]

اسی حدیث کو امام ترمذی نے سعید بن عبد الرحمٰن اور بعض دوسرے افراد کے حوالے سے مذکورہ بالا سند ہی سے نقل کیا ہے۔[2]

علمِ حدیث سے ابتدائی واقفیت رکھنے والے بھی جانتے ہیں کہ ابن ابی شیبہ، سعید بن عبد الرحمٰن، سفیان بن عیینہ، امام زہری اور عروہ بن زبیر کس پایہ کے محدث ہیں۔ امام مسلم اور امام ترمذی کا نام ہی ان کی عظمت کا آپ اپنا ثبوت ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہر دور کے اکابر محدثین نے اس روایت کو کس قدر اہمیت دی ہے۔

یہی نہیں بلکہ محدثین نے رواۃِ حدیث کے متعلق خواتین کی جرح و تنقید اور تعدیل و تصویب کو تسلیم کیا اور ان کی رائے کے مطابق کسی راویِ حدیث کی روایات کو قبول یا رد کیے جانے کا فیصلہ کیا ہے۔[3]

یہاں ممکن ہے ایک سوال ذہن میں پیدا ہو۔ وہ یہ کہ جب عقائد و عبادات، عادات و معاملات، اخلاق و قانون، غرض ہر شعبۂ زندگی سے متعلق اس کی روایات کو

---

[1] مسلم، کتاب الفتن و اشراط الساعۃ، فصل مِن اشراط الساعۃ خروج یاجوج و ماجوج

[2] ترمذی، ابواب الفتن، باب ماجاء فی خروج یاجوج و ماجوج۔ اس حدیث کے بعض دوسرے سلسلوں میں حبیبہؓ کا ذکر نہیں ہے، البتہ بقیہ تینوں خواتین کا ذکر ہے۔ امام بخاری نے ابواب المناقب، یا باب علامات النّبوۃ اور دوسرے مقامات پر اسی دوسرے سلسلہ کو نقل کیا ہے۔ امام مسلم نے بھی اس دوسرے سلسلہ کو قبول کیا ہے۔

[3] ملاحظہ ہو علاّمہ ابن جوزی کی کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ، صفحہ ۹۷، ۹۸

ویسی ہی اہمیت دی گئی ہے جیسی کہ مرد کی روایات کو دی گئی ہے تو کیوں زندگی کے تمام مسائل میں اس کی شہادت کو مرد کی شہادت کا درجہ نہیں دیا گیا۔ اس کی وجہ ہمارے خیال میں خالص نفسیاتی ہے۔ حضور اکرمؐ کے ارشادات کے ساتھ انتہائی عقیدت و احترام کا جذبہ شامل ہوتا ہے۔ اس لیے ان میں غفلت اور بے توجہی کا امکان دوسرے عام واقعات کے مقابلہ میں کم سے کم تر ہوتا ہے۔ نبی ﷺ کی تعلیمات اور اسوہ کا مطالعہ ایک مومن جس نگاہ سے کرتا ہے اس نگاہ سے بازار میں ہونے والے واقعات کا نہیں کر سکتا۔ اسی لیے شہادت اور روایت میں خود شریعت نے فرق کیا ہے۔



عورت کی عملی صلاحیت

گزشتہ مباحث سے یہ بات واضح ہے کہ شریعت کی نگاہ میں زندگی کے مسائل دو طرح کے ہیں۔ بعض مسائل وہ ہیں، جن میں عورت کی عقل و فہم پر پورا اعتماد کیا جاسکتا ہے اور بعض مسائل کی نوعیت ایسی ہے کہ ان میں اس کی فہم کے لغزش کھانے کے امکانات زیادہ ہیں۔ عمل کے میدان میں بھی شریعت نے یہی تقسیم برقرار رکھی ہے۔

عورت کی خانگی ذمے داریاں

گھر اور خاندان معاشرے کا بنیادی ادارہ ہے۔ مرد اس ادارہ کا سربراہ ہے۔ عورت اس کی نگرانی میں گھر کی تعمیر و ترقی کی ذمے دار اور مسئول ہے۔ رسولِ اکرم ﷺ کا واضح ارشاد ہے:

اَلْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ عَلٰى اَهْلِ بَيْتِ زَوْجِهَا وَ وَلَـدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ۔[1]

عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کی اولاد کی نگراں ہے اور ان کے متعلق اس سے بازپرس ہوگی (کہ کہاں تک اس نے اُن کے حقوق ادا کیے)۔

اس حدیث کی روشنی میں عورت کی ذمہ داریوں کے متعلق حافظ ابن حجر فرماتے ہیں۔

---

[1] بخاری، کتاب الاحکام۔ باب قولہ اللہ تعالٰی اَطِیْعُوا اللّٰہَ الخ۔ ابوداؤد، کتاب الخراج و الفئی والامارۃ باب ما یلزم الامام من حق الرعیۃ

اِنَّمَا قَيَّدَ بِالْبَيْتِ لِاَنَّهَا لاَ تَصِلُ اِلٰى مَا سِوَاهُ غَالِباً اِلَّا بِاِذْنٍ خَاصٍّ۔[1]

آپ نے اس کی ذمے داری کو گھر کے ساتھ مقید کیا ہے، کیوں کہ گھر کے علاوہ کسی اور مقام تک اس کی رسائی نہیں ہوتی الّا یہ کہ خصوصی اجازت سے فائدہ اٹھا کر وہ پہنچ جائے۔

یعنی عورت کا دائرۂ عمل گھر ہے، اس لیے گھر سے باہر اس کے ذمے دار بنائے جانے کا ذکر نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حدیث میں عورت کی خانگی ذمے داریوں کا ذکر ہے اور ان ذمے داریوں کے سلسلے میں اسے مسئول قرار دیا گیا ہے۔ یہاں اس سے بحث نہیں ہے کہ دیگر ذمے داریوں کی اس میں کس حد تک صلاحیت ہے اور اس کے حدود و شرائط کیا ہیں؟

گھر میں اس کے نگراں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو افراد اس کے زیر اثر ہیں اس کا فرض ہے کہ انھیں راہِ راست پر چلائے اور غلط روی سے باز رکھے اور ان کے نفع و ضرر اور سود و زیاں کی اس طرح نگرانی کرے، جس طرح ایک چرواہا جنگل میں بھیڑوں کی کرتا ہے۔ عورت کا فرض یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ وہ اس دولت اور ساز و سامان کی بھی محافظ اور امین بنائی گئی ہے، جو شوہر نے اس کے تصرف میں دیا ہے۔ نبی اکرم ﷺ صالح بیوی کی ایک صفت یہ بیان فرماتے ہیں:

وَ اِنْ غَابَ عَنْهَا نَصَحَتْهُ فِي نَفْسِهَا وَ مَا لِهٖ۔[2]

اگر شوہر اس کی نگاہوں سے غائب ہوجائے تو وہ اپنے نفس (عصمت) اور اس کے مال کے معاملہ میں اس کے ساتھ خیر خواہی کرتی رہے۔

خانگی امور میں عورت کے اختیارات

اس سے بھی آگے گھر کے تمام داخلی فرائض و واجبات اس کے ذمہ کیے گئے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہؓ اور حضرت علیؓ کے درمیان امور خانہ داری کی تقسیم

---

[1] فتح الباری: ۵/ ۴۹۰

[2] ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب افضل النساء

اس طرح فرمائی تھی کہ حضرت فاطمہؓ اندرونی خدمات اور حضرت علیؓ باہر کے کام انجام دیں گے۔[۱]

عورت کے یہ فرائض، فکر و عمل کی آزادی کا جس حد تک مطالبہ کرتے ہیں، شریعت نے اس حد تک اس کو اپنی صواب دید کے مطابق کام کرنے کی آزادی بھی دی ہے۔ ایک مرتبہ ہند بنت عتبہ نے نبی ﷺ سے اپنے شوہر ابوسفیانؓ کی شکایت کی کہ وہ پیسہ کے معاملہ میں ہاتھ روکے رہتے ہیں اور میرے اور میری اولاد کے تمام اخراجات پورے نہیں کرتے۔ اپنی ضروریات کی تکمیل کی سوائے اس کے کوئی صورت نہیں ہے کہ میں ان کے علم اور اطلاع کے بغیر ہی ان کا مال لیا کروں۔ حضورؐ نے فرمایا: عرف عام کے مطابق تم اپنی اور اپنی اولاد کی ضرورت کے مطابق ان کا مال خرچ کرسکتی ہو۔[۲]

ایک خاص حد کے اندر اس کو شوہر کے مال سے صدقہ و خیرات کا بھی حق ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

اِذَا اَنۡفَقَتِ الۡمَرۡاَۃُ مِنۡ بَیۡتِ زَوۡجِھَا غَیۡرَ مُفۡسِدَۃٍ کَانَ لَھَا اَجۡرُ مَا اَنۡفَقَتۡ وَ لِزَوۡجِھَا اَجۡرُ مَا اکۡتَسَبَ.[۳]

جب عورت اپنے شوہر کے گھر سے خرچ کرتی ہے، غلط طریقہ پر نہیں (بلکہ جائز حدود میں) تو اس کو اس خرچ کا اجر ملتا ہے اور شوہر کو اس کے کمانے کا ثواب حاصل ہوتا ہے۔

حق حضانت

خانگی زندگی میں عورت کی صلاحیتوں پر شریعت کے اعتماد کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ اسے اولاد کے سن شعور کو پہنچنے تک ان کی پرورش اور نگہداشت کے لیے مردوں

---

[۱] ابن القیم، زاد المعاد: ۵/۱۸۶

[۲] بخاری، کتاب النفقات، باب اذا لم ینفق الرجل فللمرأۃ ان تاخذ بغیر علمہ بقدرہ ما یکفیھا او ولدہا بالمعروف۔ مسلم، کتاب الاقضیہ، باب قضیۃ ہند

[۳] بخاری، کتاب الزکوٰۃ۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ۔ ابوداؤد، کتاب الزکوٰۃ باب المرأۃ تصدق من بیت زوجہا واللفظ لہ

سے زیادہ اہل اور موزوں سمجھتی ہے۔

ایک صحابی نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی، اس بیوی سے ان کے ایک بچہ بھی تھا اور وہ اس بچہ کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے، لیکن بچہ کی ماں نے حضورؐ سے اس کے خلاف شکایت کی تو آپؐ نے فرمایا:

اَنْتِ اَحَقُّ بِهٖ مَا لَمْ تَنْكِحِیْ.[1]

تو اس کی زیادہ حق دار ہے جب تک کہ تو دوسرا نکاح نہ کرلے۔

اس حدیث کی شرح میں علامہ شوکانیؒ تحریر فرماتے ہیں:

فِيْهِ دَلِيْلٌ عَلٰى اَنَّ الْاُمَّ اَوْلٰى بِالْوَلَدِ مِنَ الْاَبِ مَا لَمْ يَحْصُلْ مَانِعٌ مِنْ ذٰلِكَ كَالنِّكَاحِ وَهُوَ مُجْمَعٌ عَلٰى ذٰلِكَ[2]

اس حدیث میں دلیل ہے اس بات کی کہ ماں بچہ کی پرورش کی باپ سے زیادہ حق دار ہے جب تک کہ کوئی حقیقی رکاوٹ نہ پیدا ہو جائے مثلاً، ماں کا دوسرا نکاح کرلینا۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس پر سب کا اجماع ہے۔

علاّمہ بدر الدین کاشانیؒ فرماتے ہیں:

اَلْاَصْلُ فِيْهِ النِّسَاءُ لِاَنَّهُنَّ اَشْفَقُ وَ اَرْفَقُ وَ اَهْدٰى اِلٰى تَرْبِيَةِ الصِّغَارِ.[3]

حضانت کا اصلاً حق عورتوں کو حاصل ہے کیوں کہ وہ (مردوں کے مقابلہ میں) زیادہ شفیق اور زیادہ مہربان ہوتی ہیں اور کم سنوں کی تربیت کا سلیقہ اور صلاحیت ان میں زیادہ ہوتی ہے۔

خواتین کی جداگانہ تنظیم

اس سے معلوم ہوا کہ حضانت میں عورت کو مرد پر ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ بچوں کی تربیت اور پرورش وہ بہتر طریقہ سے کرسکتی ہے۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ زندگی کے جس دائرہ میں بھی اس کی خدمات سوسائٹی کے لیے مفید اور کارآمد ہوں، ان میں اس کو آگے بڑھنے کا حق ہے۔ اس مقصد کے لیے اس کو انفرادی سعی کے

---

[1] ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب من احق بالولد۔ حاکم، المستدرک: ۲/۲۰۷

[2] شوکانی، نیل الاوطار: ۷/۱۳۹

[3] کاشانی، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع: ۴/۶۰

ساتھ اجتماعی جدوجہد کی اجازت بھی دی جاسکتی ہے، اس پر شریعت کوئی قدغن نہیں لگاتی۔ یہاں یہ بحث چھیڑنا صحیح نہیں ہوگا کہ نبی ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں آیا خواتین کی کوئی تنظیم تھی یا نہیں؟ کیوں کہ کوئی تنظیم جن اسباب و حالات کے تحت وجود میں آتی ہے وہ اس وقت نہیں پائے جاتے تھے۔ اسی لیے خواتین کی تنظیم کیا معنی مردوں کی بھی کسی تنظیم کی وہاں نشان دہی نہیں کی جاسکتی۔ لیکن اس کے باوجود اس تاریخی حقیقت سے انکار ناممکن ہے کہ مختلف دینی و ملی ضروریات کے تحت خواتین جمع ہوتی تھیں اور بعض اوقات اجتماعی طور پر فکری و عملی مشکلات حضورؐ کے سامنے رکھتیں اور آپ ان کو حل فرماتے۔

ایک مرتبہ ایک صحابیہ نے نبی ﷺ سے خواتین کی راہ میں پیش آنے والی ایک بڑی رکاوٹ کا ذکر کیا اور اس کو دور کرنے کی درخواست کی۔ ایک دوسری روایت کے الفاظ ''قال النساء'' یعنی عورتوں نے کہا۔ غالباً یہ گزارش تو سب ہی کی ہوگی، البتہ انھوں نے اس کو حضورؐ کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے کسی ایک کو اپنا نمائندہ بنایا ہوگا۔ درخواست پیش کرنے والی خاتون کے بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ فرماتی ہیں:

ذَهَبَ الرِّجَالُ بِحَدِيثِكَ فَاجْعَلْ لَنَا مِنْ نَّفْسِكَ يَوْمًا نَأْتِيكَ فِيهِ تُعَلِّمُنَا مِمَّا عَلَّمَكَ اللّٰهُ فَقَالَ اجْتَمِعْنَ فِي يَوْمِ كَذَا وَ كَذَا فِي مَكَانِ كَذَا وَ كَذَا فَاجْتَمَعْنَ فَاتَاهُنَّ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فَعَلَّمَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَهُ اللّٰهُ.[۱]

آپ کی گفتگو اور وعظ و نصیحت سے مرد مستفید ہوتے ہیں (اور ہمیں اس کا موقع نہیں ملتا) لہٰذا آپ اپنے اوقات میں سے ہمارے لیے کوئی دن مقرر کیجیے جس میں ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوں اور آپ ہمیں وہ باتیں بتائیں، جن کی اللہ نے آپ کو تعلیم دی ہے۔ آپؐ نے فرمایا: اچھا تو فلاں دن فلاں جگہ تم جمع ہوجاؤ۔ چناں چہ وہ جمع ہوئیں تو حضورؐ ان کے پاس گئے اور اللہ نے جو دین آپؐ کو سکھایا ہے اس کی آپؐ نے ان کو تعلیم دی۔

اسی طرح ایک مرتبہ مسلمان خواتین نے اپنی ایک ذہنی الجھن رفع کرنے کے لیے اسماء بنت یزید نامی بہت ہی سمجھ دار اور زیرک خاتون کو اپنا ترجمان بنا کر نبی ﷺ کے پاس بھیجا۔ وہ آپؐ کی خدمت میں پہنچ کر عرض کرتی ہیں۔

۱۔ بخاری، کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، باب تعلیم النبیؐ امتہ من الرجال والنساء مما علمہ اللہ الخ

اِنِّیْ رَسُوْلُ مَّنْ وَرَائِیْ مِنْ جَمَاعَةِ نِساءِ الْمُسلِمِیْنَ کُلُّھُنَّ یَقُلْنَ بِقَوْلِیْ وَ عَلٰی مِثْلِ رَایِیْ اِنّ اللّٰہَ تعالٰی بَعَثَکَ اِلَی الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ فَاٰمَنَّا بِکَ وَاتَّبَعْنَاکَ وَ نَحْنُ مَعْشَرُ النِّسَاءِ مَقْصُوْرَاتٌ قَوَاعِدُ بُیُوْتٍ وَ مَوَاضِعُ شَھَوَاتِ الرِّجَالِ وَ حَامِلاَتُ اَوْلاَدِھِمْ وَ اَنَّ الرِّجَالَ فُضِّلُوْا بِالْجُمُعَاتِ وَ شُھُوْدِ الْجَنائِزِ وَ الْجِھَادِ وَ اِذَا خَرَجُوْا لِلْجِھَادِ حَفِظْنَا لَھُمْ وَ رَبَّیْنَا اَوْلاَدَھُمْ. اَفَنُشَارِکُھُمْ فِی الْاَجْرِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ؟ فَالْتَفَتَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ بِوَجْھِہٖ اِلٰی اَصْحَابِہٖ فَقَالَ ھَلْ سَمِعْتُمْ مَقَالَةَ اِمْرَأةٍ اَحْسَنَ سُوَالاً عَنْ دِیْنِھَا مِنْ ھٰذِہٖ؟ فَقَالُوْا: بَلٰی وَاللّٰہِ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ: اِنْصَرِفِیْ یَا اَسْمَاءُ وَ اَعْلِمِیْ مِنْ وَّرَاءَکِ مِنَ النِّسَاءِ اَنَّ حُسْنَ تَبَعُّلِ اِحْدَاکُنَّ لِزَوْجِھَا وَ طَلَبَھَا لِمَرْضَاتِہٖ وَ اِتِّبَاعِھَا لِمُوَافِقَتِہٖ یَعْدِلُ کُلَّ مَا ذَکَرتِ لِلرِّجَالِ۔[1]

میں قاصد ہوں مسلمان خواتین کی ایک جماعت کی طرف سے جو میرے پیچھے ہے۔ سب کی سب وہی کہتی ہیں جو میں کہتی ہوں اور وہی رائے رکھتی ہیں، جو میری رائے ہے کہ اللہ نے آپ کو مردوں اور عورتوں، دونوں کی طرف بھیجا ہے۔ پس ہم سب آپ پر ایمان لائے اور آپؐ کی پیروی کی لیکن ہم طبقۂ خواتین کا یہ حال ہے کہ وہ پابند، پردہ نشیں، گھر میں بیٹھی رہنے والی، مردوں کی خواہشات کی مرکز اور ان کی اولاد کو (پیٹ) میں اٹھانے والی ہیں اور مردوں کو جمعوں میں شرکت اور جنازوں اور جہاد میں حصہ لینے کی بنا پر فضیلت دی گئی ہے۔ جب وہ جہاد پر جاتے ہیں تو ہم ان کے مال و اسباب کی حفاظت اور ان کے بچوں کی پرورش کرتی ہیں تو کیا اسے اللہ کے رسول! اجر وثواب میں ہم بھی ان کے ساتھ شریک ہوں گی؟ حضور ﷺ نے صحابہ کی طرف متوجہ ہوئے اور پوچھا کیا تم نے کسی عورت کو اپنے دین کے متعلق اس عورت سے زیادہ بہتر انداز میں سوال کرتے سنا ہے؟ اس کے بعد رسول اللہؐ نے اسماء کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: اسماء! جاؤ اپنے پیچھے جو عورتیں ہیں ان کو بتادو کہ تمہارا اپنے شوہروں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی رضا جوئی اور ان سے ہم آہنگی کے لیے ان کی اتباع کرنا مردوں کی ان تمام خدمات کے برابر ہے، جن کا تم نے مردوں کے سلسلے میں ذکر کیا ہے۔

---

[1] ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب تذکرۂ اسماء بنت یزید بن السکن: ۴/ ۳۵۰ ونقل الحافظ المنذری عن البزار والطبرانی مختصراً۔ الترغیب والترہیب: ۳/ ۳۴

اس طرح مختلف اوقات میں بعض اور عمومی الجھنوں کو نمائندہ خواتین صنف نسوانی کی طرف سے حضورؐ کے روبرو پیش کرتی رہی ہیں۔ مثلاً ابوداؤد کی روایت ہے:

لَمَّا بَايَعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ النِّسَاءَ قَامَتْ اِمْرَأَةٌ جَلِيْلَةٌ كَاَنَّهَا مِنْ نِسَاءِ مُضَرَ فَقَالَتْ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اِنَّا كُلٌّ عَلٰى اٰبَائِنَا وَ اَبْنَائِنَا وَ اَزْوَاجِنَا فَمَا يَحِلُّ لَنَا مِنْ اَمْوَالِهِمْ قَالَ الرَّطْبُ تَاْكُلْنَهُ وَ تُهْدِيْنَه.[۱]

جب رسول اللہ ﷺ نے عورتوں سے بیعت لی تو ایک بڑی عورت جو قبیلہ مضر کی معلوم ہو رہی تھی، کھڑی ہوئی۔ اس نے کہا، اے اللہ کے نبی ہم (ویسے ہی) اپنے باپوں اور اولاد اور شوہروں پر بوجھ بنی ہوئی ہیں تو کیا ہمیں ان کے مال و دولت سے کچھ خرچ کرنے کا بھی حق ہے؟ آپ نے جواب دیا: ہاں کھجور (کی قسم کی کھانے پینے کی چیزیں) جس کو تم کھا بھی سکتی ہو اور ہدیہ بھی دے سکتی ہو۔

اس حدیث میں اس بات کی تو صراحت نہیں ہے کہ سوال کرنے والی صاحبہ کو تمام خواتین نے اپنی ترجمانی پر مامور کیا تھا لیکن بہت سی خواتین کی موجودگی اور سوال کی نوعیت صاف ظاہر کرتی ہے کہ یہ ان کا ذاتی مسئلہ نہیں تھا۔

نماز کے لیے خواتین کی جماعت

اس قسم کے تاریخی واقعات کے ساتھ جب ہم دین کی اصولی تعلیمات کی طرف رجوع کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ خواتین کی علیحدہ جماعت سازی کی بالکل مخالف نہیں ہیں، بلکہ ان سے اس کی تائید ہوتی ہے، جس کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ عورتیں نماز کے لیے مردوں سے الگ جماعت بنا سکتی ہیں۔ اس سے پہلے یہ روایت گزر چکی ہے کہ نبی ﷺ نے اُمّ ورقہ بنت عبد اللہ کو اپنے گھر والوں کی امامت کا حکم دیا تھا۔ نبی ﷺ کے بعد صحابیات کا بھی اس پر عمل رہا ہے۔ انھوں نے فرض اور نوافل دونوں طرح کی نمازیں با جماعت ادا کی ہیں اور خواتین ہی نے امامت کے فرائض بھی انجام دیے ہیں۔ ام المومنین حضرت عائشہؓ سے متعلق اس سلسلے کی بعض روایات یہاں پیش کی جا رہی ہیں:

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الزکوۃ، باب المرأۃ تتصدق من بیت زوجھا

۱- عَنْ رِبْطَةَ الحَنفِية قَالَتْ امتنا عَائِشَةُ فَقَامَتْ بَيْنَهُنَّ فِي الصَّلَاةِ الْمَكْتُوبَةِ.[۱]

ربطہ الحنفیہ بیان کرتی ہیں کہ حضرت عائشہ نے فرض نماز میں ہماری امامت کی اور وسط میں کھڑی ہوئیں (یعنی مردوں کی طرح امامت کے لیے صف سے آگے نہیں تھیں)۔

۲- عَنْ تَمِيمَةَ بِنْتِ سَلْمَةَ عَنْ عَائِشَةَ اُمِّ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنَّهَا اُمَّتْ نِسَاءً فِي الْفَرِيْضَةِ فِي الْمَغْرِب وَ قَامَتْ وَسْطَهُنَّ وَجَهَرَتْ بِالْقِرَأةِ.[۲]

تمیمہ بنت سلمہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتی ہیں کہ انھوں نے مغرب کی فرض نماز کی امامت کی اور عورتوں کے بیچ میں کھڑی ہوئیں اور جہر کے ساتھ قرأت کی۔

۳- عَنْ عَطَاءٍ عَنْ عَائِشَةَ اَنَّهَا كَانَتْ تُؤَذِّنَ وَ تُقِيْمُ وَ تَؤُمُّ النِّسَاءَ وَ تَقُوْمُ وَسْطَهُنَّ.[۳]

عطا حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ وہ اذان بھی دیتی تھیں اور اقامت بھی کہتی تھیں اور عورتوں کی امامت بھی کرتی تھیں اور امامت کے لیے عورتوں کے وسط میں کھڑی ہوتی تھیں۔

۴- عَنْ عَائِشَةَ أَنَّهَا كَانَتْ تَؤُمُّ النِّسَاءَ فِيْ رَمَضَانَ تَطَوُّعًا وَ تَقُوْمَ فِيْ وَسْطِ الصَّفِ.[۴]

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ وہ رمضان میں نفل نماز (تراویح) میں امامت کرتی تھیں اور صف کے وسط میں کھڑی ہوتی تھیں۔

ام المومنین حضرت ام سلمہؓ کے متعلق حجیرہ بنت حصین کہتی ہیں:

اَمَّتْنَا اُمُّ سَلْمَةَ فِيْ صَلَاةِ الْعَصْرِ وَ قَامَتْ بَيْنَنَا[۵]

حضرت ام سلمہؓ نے عصر کی نماز میں ہماری امامت کی اور صف کے درمیان میں کھڑی ہوئیں۔

ام الحسن (خیرہ) بیان کرتی ہیں:

۱۔ سنن دار قطنی، باب صلوٰۃ النساء جماعۃً و موقف امامھن ۱/۳۸۸۔ بیہقی، السنن الکبریٰ: ۳/۱۳۱۔ المحلی لابن حزم جلد ۳، صفحہ ۱۲۶

۲۔ المحلی لابن حزم: ۳/۱۲۶

۳۔ حاکم، المستدرک: ۱/۳۲۰

۴۔ کتاب الآثار للامام ابی یوسف صفحہ ۴۱، حدیث ۲۱۲

۵۔ دار قطنی، سنن، باب صلوٰۃ النساء جماعۃ و موقف امامھن۔ ابن حزم، المحلی: ۳/۱۲۷

اِنَّ اُمَّ سَلْمَةَ اُمُّ الْمُؤْمِنِيْنَ كَانَتْ تَؤُمُّهُنَّ فِيْ رَمْضَانَ وَ تَقُوْمُ مَعَهُنَّ فِي الصَّفِّ.[1]	ام المومنین حضرت ام سلمہؓ رمضان میں ان کی امامت کرتی تھیں اور صف میں ان کے ساتھ کھڑی ہوتی تھیں۔

سعدہ بنت قمامہ کو ابن عبد البر نے صحابیات میں شمار کیا ہے۔ ان کے متعلق بیان کرتے ہیں۔

اَنَّهَا كَانَتْ تَؤُمُّ النِّسَاءَ وَ تَقُوْمُ فِيْ وَسْطِهِنَّ.[2]	وہ عورتوں کی امامت کرتی تھیں اور ان کے درمیان میں کھڑی ہوتی تھیں۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں:

تَؤُمُّ الْمَرْأَةُ النِّسَاءَ تَقُوْمُ وَسْطَهُنَّ وَ فِيْ رِوَايَةِ ابْنِ حَزْمٍ تَؤُمُّ الْمَرْأَةُ النِّسَاءَ فِي التَّطَوُّعِ وَ تَقُوْمُ وَسْطَهُنَّ.[3]	عورت عورتوں کی امامت کرسکتی ہے اور وہ ان کے درمیان کھڑی ہوگی۔ ابن حزم کی روایت میں یہ الفاظ ہیں کہ عورت نفل نماز میں خواتین کی امامت کرسکتی ہے اور ان کے بیچ میں کھڑی ہوگی۔

نمازِ حقیقت میں تنظیم امت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے، اسی لیے نماز کی امامت کو امامتِ صغریٰ کہا جاتا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد آپ کی جانشینی کا سوال پیدا ہوا تو مہاجرین نے حضرت ابوبکرؓ کا نام پیش کیا اور اس منصب کے لیے آپ کے اہل ہونے کی دلیل یہ دی کہ حضورؐ نے آپؓ کو نماز کی امامت کے لیے اپنی زندگی میں آگے بڑھایا تھا۔ اس دلیل کی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ شریعت خواتین کو اپنی انفرادی اور اجتماعی مسائل کے حل کے لیے اپنی تنظیمیں قائم کرنے سے نہیں روکتی۔ اس طرح کی تنظیموں کو مختلف قسم کے معاشرتی امور انجام دینے کی آزادی دی جاسکتی ہے۔ وہ خواتین کی تعلیم و تربیت اور ان کی فلاح و بہبود کے دوسرے کام بھی کرسکتی ہیں بلکہ خواتین کو اپنی عدالتیں قائم کرنے اور قضا و نفاذِ قوانین کے حقوق دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔

---

[1] ابن حزم، المحلی: ۳/ ۱۲۷

[2] ابن عبد البر، الاستیعاب فی اسماء الاصحاب: ۴/ ۴۱۶۔ ابن حجر، الاصابہ: ۷/ ۱۹۹

[3] بیہقی، السنن الکبریٰ: ۳/ ۱۳۱۔ ابن حزم، المحلی: ۳/ ۱۲۸

عورت کن اجتماعی ذمے داریوں کی اہل ہے؟

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ عورت اپنے فطری دائرے سے باہر کون سی سماجی و معاشرتی خدمات انجام دے سکتی ہے؟

علامہ ابن الہمام حنفی کہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو ناقص العقل کہا ہے (یہ بات مرد کے لحاظ سے کہی گئی ہے) اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کی عقل میں اس حد تک نقص ہے کہ وہ کسی ذمے داری کی اہل ہی نہیں ہے۔ اس کے بعد کہتے ہیں۔

اَلاَ تَریٰ انَّها تَصْلُحُ شَاهِـدَةً وَ نَاظِـرةً فِي الْاَوْقَافِ وَ وَصِيَّـةً عَلَىَ الْيَتَامٰی۔[1]	کیا تم نہیں دیکھتے کہ وہ اوقاف کی نگراں اور متولی ہوسکتی ہے اور یتیموں کی وصی؟ ان کی دیکھ بھال کی اسے وصیت کی جاسکتی ہے؟

فقہ حنفی کی اس تصریح سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہوتی ہے کہ عورت سماجی خدمات کی اہل ہے۔ یہ تصریح کوئی قانونی کلیہ نہیں ہے۔ اس پر قیاس کر کے بعض دوسری معاشرتی ذمے داریوں کا بار بھی اس پر ڈالا جاسکتا ہے، لیکن ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ فقہاء نے جو کچھ کہا ہے اس کی صلاحیتوں کو سامنے رکھ کر کہا ہے لہٰذا اس کو کوئی ذمے داری سونپنے سے پہلے ہر حال میں یہ دیکھنا ہوگا کہ آیا وہ اس ذمے داری کی متحمل ہو بھی سکتی ہے یا نہیں؟ اس کے ساتھ اس کے مزاج اور رجحانِ طبع کی رعایت بھی ضروری ہے، ورنہ اس کی صلاحیتوں کے ضائع ہوجانے کا اندیشہ ہے، بلکہ ہوسکتا ہے کہ اس کی غیر فطری سرگرمیاں معاشرہ کے لیے نقصان دہ اور ضرر رساں ثابت ہوں۔ ویسے بھی یہ انتہائی غیر دانش مندانہ فعل ہوگا کہ کسی شخص کو وہ کام کرنے کے لیے کہا جائے اور مجبور کیا جائے جس کے کرنے کی نہ تو اس میں طاقت ہو اور نہ وہ اس کے ذوق اور رجحان سے مناسبت رکھتا ہو، جو بات ایک فرد کے لیے غلط ہو وہ ایک طبقہ اور ایک صنفِ انسانی کے لیے کیسے صحیح ہوسکتی ہے؟

---

[1] فتح القدیر: ۷/۲۷۹

بعض اصولوں کی پابندی

عورت، سماج اور معاشرہ کی جو بھی خدمت انجام دے اس کو چند بنیادی اصولوں کی پابندی کرنی پڑے گی۔ ان اصولوں کو پسِ پشت ڈال کر وہ کسی بھی جدوجہد میں حصہ نہیں لے سکتی کیوں کہ شریعت کی نگاہ میں اس کی شخصیت کی سلامتی و بقا اور معاشرہ کی فوز وفلاح دونوں ہی ان اصولوں سے وابستہ ہیں۔

(۱) حقیقی پوزیشن پر نظر

ان میں پہلا اصول یہ ہے کہ اس کو ہر حال میں اپنی حقیقی پوزیشن پر نظر رکھنی پڑے گی۔ وہ اصلاً خانگی زندگی کی معمار اور اس کے خوب و زشت کی ذمہ دار ہے، اس لیے نہ تو ریاست اس امر کی مجاز ہے کہ اس سے کوئی ایسا کام لے جس سے اس کی اصل حیثیت مجروح ہوتی ہو اور نہ خود اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ گھر کی دنیا اُجاڑ کر زندگی کے دوسرے گوشوں کی آرائش و زیبائش میں لگ جائے۔ اگر وہ اپنے فرائضِ منصبی کی وجہ سے تمدن و سیاست کی گتھیاں سلجھا نہ سکے تو اسلام کی نگاہ میں یہ کوئی معیوب بات نہیں، لیکن اپنی حقیقی ذمے داریوں کو بالائے طاق رکھ کر زندگی کے دوسرے دائروں میں اس کا جولانیاں دکھانا خود اس کے لیے اور بہ حیثیت مجموعی امت کے لیے نقصان دہ ہے۔ اگر اس کے دست و بازو کی توانائی مشینوں اور اسلحۂ حرب کی تیاری میں صرف نہیں ہوتی، اس کے قدم ملک وملت کی راہ میں غبار آلود نہیں ہوتے تو یہ اس کی ناکامی کی دلیل نہ ہوگی، جب کہ وہ اپنی قوت کے خزانوں کو ایسے دست و بازو اور ایسے دل و دماغ کی تیاری میں صرف کرے، جن میں قوموں کی قسمت کے فیصلہ کا عزم وحوصلہ ہو، جو صحیح معنی میں ملک وملت کے معمار اور اس کی خیر خواہ و خیر اندیش ہوں۔

(۲) خاوند کی اطاعت

اسلامی معاشرت اپنا ایک تفصیلی نقشہ رکھتی ہے۔ اس نقشہ میں مرد کو قوّام تسلیم کیا

گیا ہے، یعنی وہ عورت پر امر و اقتدار کا حق رکھتا ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ (النساء:۳۴) مرد عورتوں پر قوام ہیں۔

اس اصول کے تحت مرد کو یہ حق حاصل ہے کہ ازدواجی زندگی کی فلاح و بہبود کے لیے وہ اپنی بیوی کو جن حدود وقوانین کا پابند بنانا چاہے، بنا سکتا ہے اور جب تک اس کے احکام و ہدایات دین وشریعت اور اللہ کی مرضی سے متصادم نہ ہوں، عورت کے لیے ان کی اتباع ضروری ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ ایک مومن کے لیے اللہ تعالیٰ کے تقویٰ کے بعد صالح بیوی دنیا کی سب سے بڑی بھلائی اور نعمت ہے، صالح بیوی کی ایک صفت آپؐ نے یہ بیان کی۔

اِنْ اَمَرَهَا اَطَاعَتْهُ[1] اگر وہ حکم دے تو اس کی اطاعت کرے۔

ایک مرتبہ آپ ﷺ سے نیک عورت کی صفات دریافت کی گئیں تو ارشاد فرمایا:

اَلَّتِیْ تَسُرُّهٗ اِذَا نَظَرَ وَ تُطِیْعُهٗ اِذَا اَمَرَ وَلَا تُخَالِفُهٗ فِیْ نَفْسِهَا وَ مَالِهَا بِمَا یَکْرَهُ[2]

وہ جو شوہر کو خوش کردے جب وہ اس کو دیکھے اور اس کی بات مانے جب وہ حکم دے اور اپنے نفس اور مال میں کسی ایسی حرکت سے اس کی مخالفت نہ کرے جسے وہ پسند نہ کرتا ہو۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضور اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں:

اِثْنَانِ لَا تَجُوْزُ صَلَاتُهُمَا رُؤُسَهُمَا عَبْدٌ آبِقٌ مِنْ مَوَالِیْهِ حَتّٰی یَرْجِعَ وَ امْرَأَةٌ عَصَتْ زَوْجَهَا حَتّٰی تَرْجِعَ.[3]

دو طرح کے افراد کی نماز ان کے سروں سے اوپر نہیں جاتی (یعنی بارگاہ الٰہی تک اس کی رسائی نہیں ہوتی) وہ غلام جو اپنے آقا سے فرار ہوگیا ہو جب تک کہ وہ لوٹ نہ آئے اور وہ عورت جو اپنے شوہر کی نافرمانی کرے تا آں کہ اس سے رجوع نہ کرے۔

میاں اور بیوی کی قانونی پوزیشن پر رسول اللہ ﷺ کے ان الفاظ سے روشنی پڑتی

---

[1] ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب افضل النساء

[2] نسائی، کتاب النکاح، باب ای النساء خیر۔ مستدرک حاکم: ۲/ ۱۶۸ واللفظ للاول

[3] الترغیب والترہیب قال المنذری رواہ الطبرانی باسناد جید والحاکم: ۳/ ۳۹

ہے جو آپ نے حجۃ الوداع کے موقعے پر ارشاد فرمائے تھے:

اِسْتَوْصُوْا بِالنِّسَآءِ خَيْرًا فَاِنَّهُنَّ عَوَانٌ عِنْدَكُمْ.[1]

عورتوں کے ساتھ انتہائی خیر وخوبی کی روش اختیار کرو کیوں کہ وہ تمھارے پاس اسیر ہیں۔

گویا عورت مرد کے کنٹرول میں اور اس کے حکم کے تابع ہوتی ہے، اس کی اس حیثیت کو آپؐ نے دوسرے مواقع پر اور زیادہ واضح الفاظ میں ظاہر فرمایا ہے:

لاَ يَحِلُّ لِاِمْرَأَةٍ تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ الْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ تَاْذَنَ فِيْ بَيْتِ زَوْجِهَا وَ هُوَ كَارِهٌ وَلاَ تَخْرُجَ وَ هُوَ كَارِهٌ وَلاَ تُطِيْعُ فِيْهِ اَحَدًا وَلاَ تَخْشَ بِصَدْرِهٖ وَلاَ تضربه.[2]

جو عورت اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتی ہو اس کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے شوہر کے گھر میں کسی ایسے شخص کو آنے کی اجازت دے جسے وہ ناپسند کرتا ہو اور وہ گھر سے نکلے جب کہ اس کا نکلنا شوہر کو ناگوار ہو اور (اسے چاہیے) کہ شوہر کے معاملے میں کسی کی اطاعت نہ کرے اور اس کے آنے پر خشونت نہ اختیار کرے اور نہ اس کو مار پیٹ کرے۔

عورت کا مسجد میں نماز پڑھنا فی نفسہٖ جائز ہے لیکن وہ اسی صورت میں مسجد جاسکتی ہے جب اس کو اس کا شوہر اجازت دے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ اس سلسلے میں حضور اکرم ﷺ کی یہ سفارش نقل کرتے ہیں:

اِذَا اسْتَأْذَنَتْ امْـرَأَةُ اَحَدِكُمْ اِلَى الْمَسْجِدِ فَلاَ يَمْنَعُهَـا.[3]

تم میں سے کسی کی بیوی اگر مسجد جانے کی اجازت چاہے تو (اجازت دے دی جائے اور بلا وجہ) اس کو نہ روکے۔

اس حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجرؒ نے ایک مقام پر امام نووی کا یہ قول نقل کیا ہے:

---

[1] ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی حق المرأۃ علی زوجھا۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب حق المرأۃ علی الزوج

[2] حاکم، المستدرک: ۲/ ۲۰۶، ۲۰۷

[3] مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب خروج النساء الی المساجد

اُسْتُدِلَّ بِه عَلٰی اَنَّ الْمَرأَةَ لاَ تَخْرُجُ مِنْ بَیْتِ زَوْجِهَا اِلّاَ بِاِذْنِه لِتَوَجُّهِ الاَمْرِ اِلَی الْاَزوَاجِ بِالْاِذن.[1]

اس حدیث سے استدلال کیا گیا ہے کہ عورت اپنے خاوند کے گھر سے اس کی اجازت ہی سے نکل سکتی ہے کیوں کہ اجازت دینے کا اختیار خاوندوں کو دیا گیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ صرف مسجد جانے کی حد تک ہی وہ شوہر کے اذن کی پابند نہیں ہے، بلکہ کسی بھی صورت میں اس کی اجازت کے بغیر وہ گھر نہیں چھوڑ سکتی۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے امام بخاری نے مذکورہ بالا حدیث پر ان الفاظ میں باب باندھا ہے:

اِسْتِیْذَانُ الْمَرْأَةِ زَوْجَهَا فِی الْخُرُوجِ اِلَی الْمَسجِدِ وَغَیْرِه.[2]

مسجد وغیرہ جانے کے لیے عورت کا اپنے شوہر سے اجازت لینا (ضروری ہے)

عورت کے سفرِ حج کے متعلق نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ عُمَرَ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِیْ اِمْرَأَة لَهَا زَوْجٌ وَ لَها مَالٌ وَلاَ یَاْذن لَها فِی الحَجِّ لَیْسَ لَهاَ اَنْ تَنْطَلِقُ الاّ بِاِذْنِ زَوْجِهَا.[3]

عبد اللہ بن عمرؓ رسول اللہ ﷺ سے ایسی عورت کے متعلق یہ حکم روایت کرتے ہیں، جس کا شوہر ہو اور اس کے پاس (اتنا) مال بھی ہو (کہ وہ اس سے حج کرسکتی ہے، لیکن) اس کا شوہر اس کو حج کرنے کی اجازت نہ دے تو وہ اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر حج کو نہیں جاسکتی۔

ان نصوص کی وجہ سے تقریباً یہ طے شدہ مسئلہ سمجھا جاتا ہے کہ عورت گھر سے باہر جانے کے لیے شوہر کے اِذن کی پابند ہے۔ چناں چہ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں:

---

[1] فتح الباری: ۲/ ۶۲۱

[2] بخاری، کتاب النکاح

[3] سنن دار قطنی: ۲/ ۱۹۹۔ المعجم الصغیر طبرانی مطبوعہ ہند صفحہ ۱۲۰، اس حدیث کے ایک راوی عباس بن محمد کو محدث، ابن قطان نے مجہول الحال کہا ہے یعنی یہ نہیں معلوم کہ وہ ثقہ ہیں یا غیر ثقہ، لیکن اس حدیث کو امام بیہقی نے 'السنن الکبریٰ' جلد ۵، صفحہ ۲۲۳ میں ایک دوسرے سلسلۂ سند سے نقل کیا ہے=

ان منع الرجال نسائهم امر مقرر. [1]

مردوں کو اپنی بیویوں کو (گھر سے باہر جانے سے) منع کرنے کا اختیار ایک ثابت شدہ بات ہے۔

اس مسلمہ اصول کی خلاف ورزی پر فقہ حنفی شوہر کو بیوی کی تعزیز کا بھی حق دیتی ہے۔[2] لیکن بعض مستثنیٰ صورتیں بھی ہیں، جن میں عورت، خاوند کی اجازت کی پابند نہیں ہے۔ فقہاء حنفیہ نے اس طرح کی حسب ذیل صورتوں کی نشان دہی کی ہے۔

قالوا ليس للمرأة ان تخرج بغير اذن الزوج الا باسباب معدودة منها اذا كانت في منزل يخاف السقوط عليها و منها الخروج الى مجلس العلم اذا وقعت لها نازلة و لم يكن الزوج فقيها و منها الخروج الى الحج الفرض اذا وجدت

فقہاء نے کہا ہے کہ چند گنے چنے اسباب کے سوا کسی بھی سبب سے عورت کو اپنے خاوند کی اجازت کے بغیر گھر سے باہر نکلنے کا حق نہیں ہے۔ ان اسباب میں سے ایک یہ کہ وہ ایسے مکان میں ہو جس کے گر پڑنے کا اندیشہ ہو۔ ان ہی میں ایک سبب یہ بھی ہے کہ اسے کوئی مسئلہ پیش آجائے اور شوہر فقیہ نہ ہو تو وہ بلا اجازت علمی مجالس کی طرف رخ کرسکتی ہے، اسی طرح

جس میں عباس بن محمد کی جگہ احمد بن محمد الازرقی ہیں، جس سے طبرانی اور دارقطنی کی روایت کی تائید ہوتی ہے۔ ابن ترکمانی نے 'الجوہر النقی' میں اس حدیث کے دو راویوں پر جرح نقل کی ہے۔ لیکن اس جرح میں محدثین متفق الرائے نہیں ہیں۔ ان دو راویوں میں سے ایک حسان بن ابراہیم ہیں، جن کے متعلق امام نسائیؒ نے لکھا ہے کہ وہ روایت حدیث میں قوی نہیں تھے۔ اس کے برعکس امام احمدؒ جیسے ماہر فن نے ان کی توثیق کی ہے۔ ملاحظہ ہو (میزان الاعتدال جلد ۱، صفحہ ۱۲۲ اور 'تہذیب التہذیب' جلد ۲، صفحہ ۲۴۵، ۲۴۶) دوسرے راوی ابراہیم الصائغ ہیں، جن کو ابن جوزیؒ نے ضعفاء میں شمار کیا ہے۔ لیکن یہ ابن جوزیؒ کے فکری تشدد کا مظہر ہے۔ اکابر محدثین نے ان کی روایات کو قابلِ قبول سمجھا ہے۔ (تہذیب التہذیب جلد ۱، صفحہ ۱۷۳) بہرحال، یہ روایت صحیح ہے۔ امام شافعیؒ کا مسلک بھی یہی ہے کہ عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر حج کو نہیں جاسکتی۔ حنفیہ فرض حج کے لیے تو اجازت کو ضروری نہیں سمجھتے، البتہ ان کے نزدیک بھی شوہر اپنی بیوی کو نفل حج کے لیے جانے سے باز رکھ سکتا ہے۔ ہدایہ مع فتح القدیر جلد ۴ صفحہ ۱۴۸، ۱۴۹

[1] فتح الباری: ۲/ ۶۲۱ [2] فتاویٰ قاضی خاں: ۱/ ۴۰۴

محرما و یجوز للزوج ان یاذن لھا بالخروج ولاَ یصیر عاصیا بالاِذن و منھا الخروج الی زیارۃ الولدین و تعزیتھما و عیادتھما و زیارۃ المحارم۔[1]

بلا اجازت گھر چھوڑنے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس کو فرض حج کے لیے جانا پڑے اور کوئی محرم بھی موجود ہو۔ ایسی صورت میں شوہر اس کو اجازت دے سکتا ہے، اس سے وہ گنہگار نہیں ہوگا، اسی طرح والدین کی ملاقات، ان کی تعزیت، عیادت اور محرم رشتہ داروں سے ملاقات کے لیے جانے میں بھی وہ شوہر کی اجازت کی پابند نہیں ہے۔

فقہ کی اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ ایک مسلمان خاتون، حقوقِ زوجیت اور خدا اور بندوں کے ان بے شمار حقوق کے درمیان ہمیشہ فرق کرے گی جو اس پر ایک مومن فرد کی حیثیت سے عائد ہوتے ہیں۔ جہاں ان مختلف حقوق کے درمیان ٹکراؤ پیدا ہو، وہاں وہ اہم تر حقوق کو کم اہم حقوق پر مقدم رکھے گی۔ یہ ایک انفرادی معاملہ ہے اور اس کا سوال بھی اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ دو مختلف و متضاد احکام کی تعمیل کا براہ راست اس سے مطالبہ کیا جائے۔ اس پہلو سے ہمیں انفرادی اور اجتماعی ذمہ داریوں میں فرق کرنا پڑے گا کیوں کہ اجتماعی ذمے داریوں کا براہِ راست سماج اور معاشرہ مخاطب ہوتا ہے اور فرد پر یہ ذمے داریاں بالواسطہ عائد ہوتی ہیں۔ ہاں اگر کسی وقت سماجی خدمت اس کے لیے فرض عین کی حیثیت اختیار کر جائے تو وہ اس کے انجام دینے کے لیے شوہر کی مرضی کے خلاف گھر کے حدود چھوڑ سکتی ہے۔ لیکن عام حالات میں وہ اس کے حکم کی پابند رہے گی اور شوہر کی اجازت کے بغیر کوئی اجتماعی فریضہ اس کو گھر سے باہر نہیں نکال سکتا۔ انفرادی اور اجتماعی فرائض کے اس بنیادی فرق کو نظر انداز کر کے بعض لوگوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اجتماعی ذمے داریوں کی خاطر عورت کو شوہر کی نافرمانی کا حق ہے حالاں کہ یہ شرعی نقطۂ نظر سے کسی طرح صحیح نہیں ہے۔ علامہ ابن نجیم حنفیؒ اس خیال پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] فتاویٰ قاضی خاں المطبوع علی ہامش الفتاویٰ الھندیہ: ۱/ ۴۰۴، ۴۰۵

و ينبغي للزوج ان يمنع القابلة والغاسلة من الخروج لان في الخروج اضرارا به و هي محبوسة لحقه و حقه مقدم علٰى فرض الكفاية بخلاف الحج الفرض لان حقه لا يقدم على فرض العين.[1]

شوہر کو اس بات کا حق ہے کہ اگر اس کی بیوی دایہ، غاسلہ (میت کو نہلانے والی) ہے تو ان کاموں کے لیے باہر جانے سے روکے، کیوں کہ بیوی کے گھر سے باہر جانے میں اس کا نقصان ہے اور وہ شوہر کے حقوق ادا کرنے کی پابند ہے۔ اس لیے شوہر کا حق فرض کفایہ پر مقدم ہے۔ لیکن فرض حج کا معاملہ دوسرا ہے۔ اس کے لیے وہ اس کی مرضی کے خلاف بھی جاسکتی ہے کیوں کہ شوہر کا حق فرض عین پر مقدم نہیں کیا جاسکتا۔

اس بحث کا تعلق گھر سے باہر عورت کی سرگرمیوں سے تھا۔ گھر کے اندر بھی شوہر اس کی مصروفیات پر پابندی لگا سکتا ہے۔ چناں چہ علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں:

له ان يمنعها من الاعمال كلها المقتضية للكسب لأنها مستغنية عنه بوجوب كفايتها عليه و كذا من العمل تبرعا.[2]

شوہر کو حق ہے کہ بیوی کو ایسے کاموں سے روکے جو کسب معاش کے لیے کیے جاتے ہیں، کیوں کہ شوہر پر اس کا نان نفقہ فرض ہونے کی وجہ سے اس کو کمانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی طرح بطورِ نفل و ثواب کے وہ کسی کا کوئی کام کرنا چاہے تو وہ اس پر بھی پابندی لگا سکتا ہے۔

گویا شوہر کو یہ حق اس بنیاد پر ملا ہے کہ وہ اس کے اخراجات کا کفیل ہے لیکن اگر وہ اس پوزیشن میں نہ ہو تو عورت کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے جدوجہد اور کسب کا حق ملنا چاہیے علاوہ ازیں بقول علامہ ابن عابدینؒ: ''عورت کے بہت سے ایسے اخراجات ہوسکتے ہیں، جن کا بار اٹھانا مرد کے لیے ضروری نہیں ہے۔ ان کے پورا کرنے کے لیے وہ اندرونِ خانہ کوئی پیشہ اپنا سکتی ہے۔'' ابن عابدین نے مزید لکھا ہے کہ خاوند

---

[1] البحر الرائق: ۴/ ۱۹۵، ۱۹۶

[2] البحر الرائق: ۴/ ۱۹۶

اپنی بیوی کو اس لیے بھی محنت ومشقت سے باز رکھ سکتا ہے کہ اس سے اس کی صحت کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے اور شوہر کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی بیوی کو حسین وجمیل اور تندرست وتوانا باقی رکھنے کی کوشش کرے لیکن اس حق کی بنا پر شوہر بیوی کی زیادہ سے زیادہ ایسی مصروفیات پر قدغن لگا سکتا ہے جو اس کے لیے مضرِ صحت ہوں۔ اس وجہ سے علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں کہ قاعدہ اس طرح وضع کیا جاسکتا ہے۔

له منعها عن كل عمل يؤدى الى تنقيص حقه او ضرره او الىٰ خروجها من بيته اما الذى لاَ ضرر له فيه فلا وجه لمنعها[1]

شوہر اپنی بیوی کو ہر اس کام سے منع کرسکتا ہے، جس سے اس کے حق میں کمی آتی ہو، یا اس کو نقصان پہنچتا ہو، یا کوئی ایسا کام ہو، جس کے بجا لانے کے لیے اسے گھر سے باہر نکلنا پڑے۔ باقی رہے ایسے کام جس میں اس کا کوئی نقصان نہیں ہے، تو ان سے منع کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اس اصول کے تحت ممکن ہے یہاں ایک سوال پیدا ہو، وہ یہ کہ عورت اپنے خاوند کے حقوق کی رعایت کرتے ہوئے گھر سے باہر مختلف سرگرمیوں میں کیوں نہیں حصہ لے سکتی؟ اگر وہ حقوق زوجیت میں کوتاہی نہیں کرتی تو جس طرح اس کو گھر کے اندر سعی وعمل کی آزادی ہے، اسی طرح گھر سے باہر بھی ہونی چاہیے، لیکن ہمارے خیال میں یہ سوال صحیح نہیں ہے کیوں کہ شریعت ان دونوں حالتوں میں فرق کرتی ہے۔ وہ گھر کی چہار دیواری کو اس کے دین و اخلاق کی پناہ گاہ سمجھتی ہے اور بیرونِ خانہ اس کے متاعِ اخلاق کے لٹ جانے کا خدشہ محسوس کرتی ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

المرأة عورة فاذا خرجت استشرفها الشيطان.[2]

عورت سراسر پوشیدہ رکھنے والی مخلوق ہے۔ جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی طرف جھانکتا ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

---

[1] ابن عابدین، الدر المختار: ۲/ ۵۲۰-۵۲۲

[2] ترمذی، ابواب الرضاع باب (بغیر عنوان)

اَلنِّسَآءُ عَوْرَةٌ فَاسْتُرُوْهَا بِالْبُيُوْتِ۔[۱] — عورت پوشیدہ رکھی جانے والی مخلوق ہے لہٰذا تم اس کو گھروں میں چھپاؤ۔

یہاں ایک نفسیاتی حقیقت بھی ہے جس کی طرف علامہ ابن الہمام نے اشارہ کیا ہے، وہ یہ کہ اسلام ازدواجی رشتہ کو محکم سے محکم تر دیکھنا چاہتا ہے، لیکن یہ رشتہ اتنا نازک ہے کہ ذرا سے دھکے سے ٹوٹ سکتا ہے۔ کوئی شریف اور باغیرت خاوند گھر سے باہر بیوی کی بکثرت آمد و رفت کو قطعاً برداشت نہیں کرسکتا کیوں کہ اس سے بہت سے فتنوں کے راستے کھلتے ہیں۔

فان فی کثرة الخروج فتح باب الفتنة خصوصاً اذا کانت شابة والزوج من ذوی الهیئات.[۲] — کیوں کہ گھر سے بہت زیادہ آمد و رفت رکھنا فتنہ کے دروازے کو کھولنا ہے، خصوصاً ایسی صورت میں جب کہ وہ جوان ہو اور شوہر باخلاق اور شریف ہو۔

(۳) اختلاط سے اجتناب

یہ توضیحات ہمیں اس نتیجہ تک پہنچاتی ہیں کہ مسلمان خاتون اپنے شوہر کی اجازت اور رضامندی کے ساتھ گھر سے باہر بھی مختلف تعلیمی و دینی اور سماجی خدمات انجام دے سکتی ہے۔ لیکن وہ کسی حال میں اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرسکتی کہ شریعت نے اس کے اور اجنبی مردوں کے درمیان اخلاق اور قانون کی ایک دیوار کھڑی کردی ہے۔ اس کے فرائضِ حیات کو خانگی زندگی میں محصور کرنے کا ایک اہم مقصد یہ بھی ہے کہ نامحرموں سے اختلاط اور میل جول اخلاقی بگاڑ کا ذریعہ نہ بننے پائے۔ اگر عورت خدا کی قائم کردہ دیوار کو توڑ کر کسی میدان میں آگے بڑھتی ہے تو اسلام کی نگاہ میں معصیت اور نافرمانی کے خطرات اسے اپنے نرغے میں لے لیتے ہیں، خواہ اس کی نیت کتنی ہی صاف اور اس کے ارادے کتنے ہی نیک کیوں نہ ہوں۔ کیوں کہ اس طرح وہ اس مقصد کو پامال کرتی ہے، جس کی پامالی شریعت دیکھنا نہیں چاہتی۔

---

[۱] عیون الاخبار جلد ۴، صفحہ ۷۸

[۲] فتح القدیر: ۴/۳۵۸

حضور اکرم ﷺ سے زیادہ خدا ترس کون ہوگا۔ کس کی اخلاقی بلندی آپ کے رفعتِ کردار کا مقابلہ کرسکتی ہے اور ان خواتین کے پاک جذبات آج کون سی عورت کو حاصل ہیں جو آپ سے اسلامی احکام کے اتباع کا عہد کرنے حاضر ہوتی تھیں۔ وفاداری کا عہد مرد تو آپؐ کے ہاتھ میں ہاتھ ملا کر کرتے تھے لیکن ذاتِ اقدس کا دستِ مبارک کبھی کسی نامحرم خاتون کے ہاتھ سے مس نہیں ہوا۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُبَايِعُ النِّسَاءَ بِالْكَلَامِ بِهٰذِهِ الْاٰيٰتِ لَا تُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَ مَا مَسَّتْ يَدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَدَ امْرَأَةٍ اِلَّا امْرَأَةٍ يَمْلِكُهَا.[۱]

نبی ﷺ عورتوں سے اس آیت کے ذریعے لَا تُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْئًا زبانی بیعت لیتے تھے، آپ کا دست مبارک سوائے ایسی عورت کے جو آپؐ کے قبضہ میں ہوتی، (بیوی) کسی عورت کے ہاتھ سے مس نہیں ہوا۔

اس سے زیادہ واضح یہ الفاظ ہیں:

لَا وَاللّٰهِ مَا مَسَّتْ يَدُ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ يَدَ امْرَأَةٍ قَطُّ غَيْرَ اَنَّهٗ يُبَايِعُهُنَّ بِالْكَلَامِ وَ كَانَ يَقُوْلُ لَهُنَّ اِذَا اَخَذَ عَلَيْهِنَّ قَدْ بَايَعْتُكُنَّ كَلَامًا.[۲]

نہیں! قسم خدا کی کبھی حضورؐ کا ہاتھ کسی عورت کے ہاتھ سے مس نہیں ہوا۔ آپ ان سے صرف زبانی بیعت لیتے تھے۔ جب آپ ان سے قول و قرار لے چکتے تو فرماتے (اچھا اب جاؤ) میں نے تم سے گفتگو ہی کے ذریعے بیعت لی ہے۔

بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ خود خواتین نے آپ کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے کر شریعت کی اطاعت کا عہد کرنا چاہا تو آپؐ نے صاف کہہ دیا:

اِنِّیْ لَا اُصَافِحُ النِّسَاءَ اِنَّمَا قَوْلِیْ لِمِاَةٍ كَقَوْلِیْ لِاِمْرَاَةٍ وَاحِدَةٍ.[۳]

میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ میرا سو عورتوں سے خطاب کر کے کہنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی ایک عورت سے خطاب کروں (اس لیے ہر ایک سے علیحدہ عہد لینے کی بھی ضرورت نہیں)۔

---

[۱] بخاری، کتاب الاحکام، باب بیعۃ النساء

[۲] مسلم، کتاب الامارۃ، باب کیفیۃ بیعۃ النساء

[۳] مسند احمد: ۷/۲۶۸۔ نسائی کتاب البیعۃ، باب بیعۃ النساء۔ دار قطنی صفحہ ۴۸۷ و روی بمعناہ الترمذی والحاکم

اس بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ تعلیم و تربیت ہو یا ثقافت و تہذیب یا دفاع و سیاست، ہر میدان میں دونوں صنفوں کا عدم اختلاط ناگزیر ہے۔ اسلام میں نہ تو کسی مشترک کلچرل پروگرام کی کوئی گنجائش ہے، نہ مخلوط تعلیم کی۔ ایک مسلمان خاتون اجنبی مردوں کے ساتھ نہ تو فوجی تربیت اور ملی جلی مشقوں میں شریک ہوسکتی ہے اور نہ کھیل کود اور سیر و تفریح میں۔ بازار اور منڈی سے لے کر ایوان حکومت تک کسی بھی مقام پر دونوں کی آمیزش اور باہمی اتصال قطعاً ناروا اور عظیم جرم ہے۔

حضور ﷺ کے خطبوں میں عورتیں شریک ہوتی تھیں۔ لیکن کبھی وہ مردوں کے پہلو بہ پہلو نہیں بیٹھتی تھیں، بلکہ ہمیشہ ان کی نشست گاہ مردوں سے بالکل الگ ہوتی تھی۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ ایک عید کی نماز کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

فَصَلّٰى ثُمَّ خَطَبَ ثُمَّ اَتَى النِّسَاءَ وَ مَعَهُ بِلَالٌ فَوَعَظَهُنَّ۔[1]	(پہلے) آپؐ نے نماز پڑھی پھر خطبہ دیا، اس کے بعد آپ عورتوں کے پاس تشریف لائے۔ آپؐ کے ساتھ بلالؓ بھی تھے۔ آپؐ نے ان کو نصیحت فرمائی۔

حافظ ابن حجرؒ اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

قوله ثم اتى النساء يشعر بان النساء كن على حدة من الرجال غير مختلطات بهم[2]	حضرت ابن عباسؓ کا یہ قول کہ اس کے بعد آپ عورتوں کے پاس تشریف لائے، بتاتا ہے کہ وہ مردوں سے علیحدہ تھیں، ان کے ساتھ ملی جلی نہیں تھیں۔

اسی سے متعلق ایک اور روایت ہے:

صَلّٰى قَبْلَ الْخُطْبَةِ ثُمَّ خَطَبَ	آپؐ نے خطبہ سے پہلے نماز پڑھی پھر خطبہ دیا۔ اس کے بعد آپؐ نے محسوس کیا کہ

۱؎ بخاری، کتاب العیدین، باب العلم الذی

۲؎ فتح الباری: ۳/۱۴۶

فَرَأٰی اَنَّہٗ لَمْ یُسْمِعِ النِّسَاءَ فَاَتَاھُنَّ فَذَکَّرَھُنَّ.[۱]

آپؐ اپنی بات عورتوں کو نہیں سنا سکے ہیں۔ چناں چہ آپؐ ان کے پاس آئے اور ان کو نصیحت کی۔

یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ خواتین مردوں سے الگ اور اتنی دور تھیں کہ رسول اللہ ﷺ کو شبہ ہونے لگا کہ آپ کی آواز ان تک پہنچ بھی رہی ہے یا نہیں؟ تعلیم ہی نہیں، زندگی کے تمام شعبوں میں شریعت مرد و زن کے اختلاط کو روکنا چاہتی ہے۔ ذیل کے ایک واقعہ سے شریعت کے منشا اور رُخ کو سمجھا جاسکتا ہے۔

دو شخص رسولِ اکرم ﷺ کی خدمت میں ایک مقدمہ لے کر حاضر ہوئے۔ اُن میں سے ایک نے آپؐ سے عرض کیا کہ میرا لڑکا اس کی بیوی سے زنا کا مرتکب ہوگیا ہے، آپؐ اللہ کے حکم کے مطابق اس کا فیصلہ فرما دیجیے، آپؐ نے فرمایا: تمھارے لڑکے کو سو کوڑے لگائے جائیں گے اور ایک سال کے لیے اس کو جلا وطن کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد آپؐ نے عورت سے متعلق انیس نامی ایک صحابی کو عورت کے متعلق حکم دیا:

اُغْدُ عَلٰی اِمْرَأَۃِ ھٰذَا فَسَلْھَا فَاِنْ اِعْتَرَفَتْ فَارْجُمْھَا فَاعْتَرَفَتْ فَرَجَمَھَا.[۲]

جاؤ اس (دوسرے) شخص کی بیوی کے پاس اور اس سے دریافت کرو اگر وہ اپنے جرم کا اعتراف کرلے تو اس کو رجم کردو چناں چہ اس نے اعتراف کیا اور انھوں نے اس کو سنگسار بھی کیا۔

اسلامی عدالت میں عورت اپنا مقدمہ لے جاسکتی ہے اور وقت ضرورت عدالت اسے طلب بھی کرسکتی ہے۔ اسلامی عدالت کو اپنے نمائندے کے ذریعے تحقیق حال کا بھی حق حاصل ہے۔ چناں چہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کو عدالت میں طلب نہیں کیا بلکہ اپنے نمائندے کو تحقیق اور قانون کے نفاذ کا حق دے کر عورت کے پاس روانہ کیا۔ اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط نہ ہوگا کہ اسلام حتی الوسع مشترک مجالس سے بچنا چاہتا ہے۔ چناں چہ امام نسائیؒ نے اس حدیث پر ان الفاظ میں باب باندھا ہے:

---

۱ بخاری، کتاب العلم، باب عظۃ الامام النساء و تعلیمھن۔ مسلم کتاب صلوٰۃ العیدین، واللفظ لمسلم

۲ بخاری، کتاب الحدود، باب، ھل یا مر الامام رجلا فیضرب الحد غائباً عنہ۔ مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا

صَوْنُ النِّسَاءِ عَنْ مَجْلِسِ الْحُكْمِ۔[۱] عدالت گاہوں سے عورتوں کو بچانا۔

علاّمہ زین الدین ابن نجیم حنفی لکھتے ہیں:

ولاَ تكلف الحضور للدعوىٰ اذا كانت مخدرة ولاَ لليمين بل يحضر اليها القاضى او يبعث اليها نائبه يحلفها بحضرة شاهدين.[۲]

دعویٰ کے اثبات اور قسم کے لیے اس کو عدالت میں پیشی پر مجبور نہیں کیا جائے گا جب کہ وہ پردہ نشین ہو بلکہ قاضی خود اس کے پاس جائے گا یا اپنے کسی نائب کو بھیجے گا جو دو گواہوں کے سامنے اس سے قسم لے گا۔

ابن قاسمؒ نے امام مالک سے دریافت کیا کہ اگر عورتوں سے قسم لینے کی ضرورت پیش آئے تو قسم کہاں لی جائے گی؟ امام مالک نے جواب دیا:

أما كل شىء له بال فانهن يخرجن فيه الى المساجد فان كانت امرأة تخرج بالنهار اخرجت نهارا فاحلفت فى المسجد و ان كانت ممن لاَ تخرج اخرجت ليلا فاحلفت فيه قال و ان كان الحق انما هو شىء يسير لاَ بال له احلفت فى بيتها اذا كانت ممن لا تخرج و ارسل القاضى اليها من يحلفها لطالب الحق.[۳]

معاملہ اگر اہم ہے تو (قسم لینے کے لیے) وہ مسجدوں میں لائی جاسکتی ہیں۔ اگر ایسی عورت ہو جو دن میں نکلتی ہو تو دن میں اس کو نکالا جائے گا اور مسجد میں اس سے قسم لی جائے گی اگر وہ دن میں نہ نکلتی ہو تو رات میں اس کو مسجد لے جایا جائے گا اور اس سے قسم لی جائے گی۔ امام مالکؒ نے کہا اگر کوئی معمولی حق ہو اور عورت گھر سے باہر نکلنے کی عادی نہ ہو تو گھر ہی میں قسم کھلائی جائے گی اور قاضی اس کے پاس کسی ایسے آدمی کو بھیجے گا جو حق چاہنے والے کے لیے اس سے قسم لے گا۔

۱۔ نسائی، کتاب آداب القضاۃ

۲۔ الاشباہ والنظائر مطبوعہ ہند صفحہ ۲۴۶

۳۔ المدونۃ الکبریٰ جلد ۴، صفحہ ۷۱، ۱۰۳

حضور اکرم ﷺ کے زمانہ میں خواتین کو فنونِ جنگ کی باقاعدہ تعلیم تو نہیں دی جاتی تھی، لیکن اس کے باوجود یہ ایک امرِ واقعہ ہے کہ وہ اپنے مخصوص ماحول اور جفاکشانہ زندگی کی بنا پر ہمیشہ جنگی خدمات کی اہل رہی ہیں۔ آج بھی وقتِ ضرورت اسلامی ریاست ان کو فوجی تربیت دے کر ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ لیکن ضروری ہے کہ تربیت کا یہ نظام بھی نامحرموں کے اختلاط سے پاک ہو۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ میں ایک غزوہ میں حضور اکرم ﷺ کے ساتھ تھی، یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب کہ میں دُبلی پتلی اور چھریری تھی۔ آپؐ نے صحابہؓ کو آگے بڑھنے کا حکم دیا۔ جب وہ آگے بڑھ گئے تو آپؐ نے مجھ سے کہا، عائشہ! آؤ ہم اور تم دوڑ لگائیں، دیکھو، میں تمھیں پیچھے چھوڑ دیتا ہوں۔ جب مقابلہ ہوا تو میں آگے نکل گئی۔ یہ دیکھ کر آپؐ خاموش ہوگئے۔ پھر ایک عرصہ کے بعد جب کہ میں اس واقعہ کو بھول بھی چکی تھی اور اس وقت میں کسی قدر فربہ ہوگئی تھی، آپؐ کے ساتھ سفر پر گئی۔ آپؐ نے اس مرتبہ بھی صحابہؓ سے کہا کہ تم لوگ ذرا آگے بڑھ جاؤ، جب وہ آگے چلے گئے تو آپؐ نے مجھے دوڑ میں مقابلہ کے لیے بلایا۔ اب کی بار جو مقابلہ ہوا تو آپ سبقت لے گئے۔ آپؐ نے مسکراتے ہوئے فرمایا، یہ اس کا جواب ہے۔[1]

کیا غزوات میں خواتین کی شرکت صنفی اختلاط کی دلیل ہے؟

غزوات میں مسلمان خواتین کی شرکت کی بنا پر یہاں یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ باہمی اختلاط کے بغیر دونوں صنفوں نے محاذ جنگ پر کیسے کام کیا؟ اگر مِل جل کر جہاد میں حصہ لیا تو کیا یہ اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ شریعت کی نگاہ میں صنفی اختلاط کوئی جرم

---

[1] الدر الثمین فی مناقب امہات المومنین، تالیف محبّ الدین الطبری المتوفی ۶۹۴ھ۔ حضرت عائشہؓ کے ساتھ دوڑ میں دو مرتبہ حضورؐ کے مقابلہ کا ذکر امام احمدؒ اور ابوداؤدؒ نے بھی کیا ہے۔ مسند احمد جلد ۶، صفحہ ۳۹ میں مسابقت سے پہلے صرف ایک مرتبہ صحابہ کو آگے روانہ کرنے کا ذکر ملتا ہے لیکن محبّ الدین طبری کی نقل کردہ روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں مرتبہ آپ نے صحابہ کی عدم موجودگی کو ضروری سمجھا۔

نہیں ہے؟ لیکن یہ سوال اس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ ہم کسی استثنائی شکل کو اصول کی حیثیت دے دیں، حالاں کہ دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اصول عمومی ضابطہ اور قانون کا نام ہے اور استثناء کسی عارضی سبب کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اس لیے عمل ہر دور اور ہر حال میں اصول ہی پر ہوگا، الا یہ کہ کسی حقیقی مانع کی وجہ سے وقتی طور پر شریعت ہم کو اس کا پابند نہ قرار دے لیکن جیسے ہی یہ مانع دور ہوجائے ہم اصول کی پیروی پر مجبور ہوں گے۔

حالت جنگ کو حالت امن پر قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ بعض اوقات دونوں میں بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ حالت جنگ میں کسی ایک فرد کو نہیں، پورے ملک اور قوم کو زندگی اور موت کا فیصلہ کرنا پڑتا ہے، اس وقت حالات اتنے نازک ہوتے ہیں کہ بہت سے اصول اور قوانین پر ان کی اصل شکل میں عمل درآمد ممکن نہیں رہتا۔ ان ہنگامی حالات پر عام حالات کو قیاس کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص کسی آتش زدہ شہر میں یہ دیکھ کر کہ مزدور اور مالک صحافی اور سیاست داں تاجر اور صنعت کار سب کے سب آگ فرو کرنے میں لگے ہوئے ہیں، یہ فیصلہ کردے کہ اس شہر میں کوئی نظامِ عمل نہیں ہے۔

یہ سوال بھی بالکل اسی نوعیت کا ہے۔ پھر جب ہم ان حالات کو سامنے رکھتے ہیں جن میں مسلمان خواتین کو نامحرموں کے ساتھ عرصۂ پیکار کی طرف رُخ کرنا پڑا تو یہ سوال اور بھی بے معنی معلوم ہونے لگتا ہے۔

یوں تو جنگ میں عام طور پر حالات معمول کے مطابق نہیں رہ پاتے لیکن کبھی کبھی وہ اس قدر خطرناک اور بھیانک شکل اختیار کرلیتی ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ سے ہل جاتا ہے اور پوری قوم کے سامنے ملک کی سالمیت اور حفاظت سے زیادہ اہم اور کوئی مسئلہ نہیں رہتا۔

رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام کو اپنے غزوات میں ایسے ہی بھیانک حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ایک طرف ان کو ابھی پوری طرح سیاسی استحکام ہی نہیں حاصل ہوا تھا کہ مخالفین سے جنگ کا غیر منقطع سلسلہ شروع ہوگیا۔ دوسری طرف وہ اپنی عددی قوت

اور ساز و سامان کے لحاظ سے بھی بہت پیچھے تھے۔ ان کے مقابلہ میں دشمن پوری طرح مسلح اور تعداد میں کئی چند ہوتے ہوئے بھی میدانِ جنگ میں عورتوں کی کھیپ کی کھیپ اپنے ہمراہ لاتا جو لڑنے والوں کے اندر قومی حمیت اور جوش و جذبہ ابھارتیں اور مرنے مٹنے پر اکساتیں۔ عورتوں کو ساتھ رکھنے کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا کہ وہ طبی خدمات انجام دیں کیوں کہ طب اس وقت تک خصوصاً عرب میں خانگی تجربہ اور عمل ہی کی حیثیت رکھتی تھی۔ اس لیے قدرتی طور پر عورتیں اس سے واقف بھی ہوتیں اور شاید مردوں سے بہتر طریقہ سے اس پر عمل بھی کر سکتی تھیں۔

ان حالات میں مسلمانوں کا اپنی خواتین سے جنگی تعاون حاصل کرنا ایک حقیقی ضرورت تھی۔ اس لیے انھوں نے بعض اوقات جنگ میں خواتین کو بھی اپنے ساتھ رکھا تاکہ جو بھی خدمت وہ انجام دے سکتی ہیں، اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اس کے ساتھ رسول اکرم ﷺ کی یہ کوشش ہوتی تھی کہ غزوات میں خواتین کی شرکت ناگزیر حد سے آگے نہ بڑھنے پائے۔ چناں چہ ہم کتاب کے شروع میں ثابت کر چکے ہیں کہ ان کو جہاد میں حصہ لینے کی کبھی ترغیب نہیں دی جاتی تھی، بلکہ اگر کبھی ان کی جانب سے اس خواہش کا اظہار ہوتا بھی تو ہمت افزائی نہ کی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ بڑی سے بڑی جنگ میں بھی خواتین معدودے چند سے زیادہ نظر نہیں آتی ہیں۔

اس کے باوجود جو خواتین شریک ہونا چاہتیں ان پر پابندی تھی کہ وہ آپؐ کی اجازت کے بغیر شریک نہ ہوں۔ اس پابندی کا مقصد یہ تھا کہ پہلے ہی سے معلوم ہو جائے کہ کس طرح کی عورتیں ساتھ چل رہی ہیں۔ ان کی حفاظت کے کیا انتظامات ہیں؟ اور سب سے اہم بات یہ کہ میدانِ جنگ میں آیا ان کی ضرورت ہے یا نہیں؟ ان تمام پہلوؤں سے اطمینان حاصل کیے بغیر آپ خواتین کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ایک مرتبہ بعض خواتین جہاد کے شوق میں بلا اجازت فوج کے ہمراہ ہو گئیں تو

آپ نے ان کو سخت تنبیہ فرمائی۔ حشرج بن زیاد اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ:

اِنَّهَا خَرَجَتْ مَعَ رَسُوْلِ اللّٰهِ ﷺ فِیْ غَزْوَةِ خَیْبَرَ سَادِسَ سِتِّ نِسْوَةٍ فَبَلَغَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فَبَعَثَ اِلَیْنَا فَجِئْنَا فَرَأَیْنَا فِیْهِ الْغَضَبَ فَقَالَ مَعَ مَنْ خَرَجْتُنَّ وَ بِاِذْنِ مَنْ خَرَجْتُنَّ۔[1]

وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خیبر کی جنگ کے لیے روانہ ہوئیں۔ ان کے ساتھ پانچ دوسری عورتیں بھی تھیں (ان کا بیان ہے کہ) جب آپؐ کو اس کی خبر ہوئی تو آپؐ نے ایک شخص کو بھیج کر ہمیں طلب کیا۔ ہم حاضر ہوئے تو دیکھا، آپؐ کے چہرہ پر غصہ کے آثار ہیں۔ آپؐ نے (ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے) فرمایا، کس کے ساتھ گھر سے نکلیں اور کس کی اجازت سے نکلیں؟

خواتین ایک تو جنگ میں شرکت کی آپؐ سے اجازت حاصل کرتی تھیں اور دوسرے، ان کی یہ شرکت اپنے قبیلہ کے ساتھ یا انتہائی قابلِ اعتماد افراد کے ساتھ ہوتی تھی۔ حشرج بن زیاد کی دادی اور ان کی ساتھیوں پر خفگی کی وجہ یہی تھی کہ انھوں نے ان دونوں باتوں کو نظر انداز کر دیا تھا۔

ام سنان اسلمیہؓ اپنا واقعہ بیان کرتی ہیں:

لَمَّا اَرَادَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ الْخُرُوْجَ اِلَی خَیْبَرَ جِئْتُهٗ فَقُلْتُ یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ اَخْرُجُ مَعَکَ فِیْ وَجْهِکَ هٰذَا اخرزُ السِّقَاءَ وَ اُدَاوِیْ لِلْمَرِیْضِ وَالْجَرِیْحِ اِنْ کَانَتْ جِرَاحٌ وَلَا تَکُوْنُ وَاَبْصِرُ الرَّحْلَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ

جب رسول اللہ ﷺ نے خیبر کی طرف چلنے کا ارادہ کیا تو میں نے آپؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا، حضور! آپ کی اس مہم میں میں بھی ساتھ چلنا چاہتی ہوں۔ وہاں چل کر ضرورت پڑے تو مشک سی دوں گی، اگر کوئی مریض اور زخمی ہو تو اس کا علاج کردوں گی۔ خدا کرے کہ ایسا نہ ہو اور کجاوے (اور دیگر سامان) کی نگرانی کروں گی۔ حضورؐ نے فرمایا: اللہ برکت دے، تم چل

[1] مسند احمد: ۶/ ۳۶۴ حدیث نمبر ۲۱۸۲۷۔ ابوداؤد، کتاب الجهاد، باب فی المرأة والعبد یحذیان من الغنیمة واللفظ للآخر

اُخْرُجِیْ عَلٰی بَرْکَةِ اللّٰهِ فَاِنَّ لَکِ صَوَاحِبَ قَدْ کَلَّمْتِنِیْ وَ اَذِنْتُ لَهُنَّ مَعَ قَوْمِکَ وَ مِنْ غَیْرِهِمْ فَاِنْ شِئْتِ فَمَعَ قَوْمِکِ وَ اِنْ شِئْتِ فَمَعْنَا قُلْتُ مَعَکَ قَالَ فَکُوْنِیْ مَعَ اُمِّ سَلْمَةَ زَوْجَتِیْ قَالَتْ فَکُنْتُ مَعَهَا.[1]	سکتی ہو، تمہارے قبیلہ اور بعض دوسرے قبائل کی عورتیں تمھاری طرح مجھ سے گفتگو کر چکی ہیں اور میں نے ان کو بھی اجازت دے دی ہے۔ اس سفر میں یہ سب تمھاری ساتھی ہوں گی، تم چاہو تو اپنی قوم کے ساتھ رہو اور اگر چاہو تو ہمارے ساتھ بھی چل سکتی ہو۔ میں نے کہا، میں آپؐ ہی کے ساتھ چلوں گی، آپؐ نے فرمایا: اچھا تو میری بیوی ام سلمہؓ کے ساتھ شریک ہوجاؤ۔ ام سنان کہتی ہیں کہ میں ام سلمہؓ کے ساتھ ہوگئی۔

یہ واقعات بتاتے ہیں کہ عموماً خواتین اپنے شوہروں کے ساتھ ہوتیں یا باپ، بھائی اور اولاد جیسے قریب ترین محرم ان کو اپنے ہمراہ محاذِ جنگ پر لے جاتے تھے۔ حضرت عائشہؓ اس سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کا اسوہ بیان فرماتی ہیں:

کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِذَا اَرَادَ سَفَرًا اَقْرَعَ بَیْنَ اَزْوَاجِهٖ وَ اَیَّتُهُنَّ خَرَجَ سَهْمُهَا خَرَجَ بِهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَعَهٗ.[2]	رسول اللہ ﷺ جب سفر کا ارادہ کرتے تو اپنی بیویوں کے درمیان قرعہ ڈالتے اور قرعہ کے نتیجہ میں جس کے حصہ میں شرکت نکلتی آپؐ اس کو اپنے ساتھ لے جاتے۔

میدانِ جنگ میں خواتین کی خدمات کا دائرہ بھی ان کے خویش و اقارب اور عزیزوں کی حد تک محدود رہتا تھا۔ اگر کبھی نامحرموں کے تعاون اور ہمدردی کی ضرورت پڑتی بھی تو ناگزیر حد سے آگے نہ بڑھتی تھیں اور حتی الوسع خلا ملا سے احتراز کرتی تھیں۔ امام نوویؒ عورتوں کی جنگی خدمات کی نوعیت کے متعلق فرماتے ہیں:

و هٰذه المـداواة لمَحارمهن و ازواجهن وما كان منها لغيرهم	عورتوں کا یہ علاج معالجہ ان کے محرموں اور شوہروں کی حد تک رہتا تھا اور جہاں علاج

---

[1] طبقات ابن سعد: ۸ / ۲۹۲

[2] بخاری، کتاب المغازی، باب حدیث الافک

لاَ یکون فیه مس بشرۃ الا فی موضع الحاجة۔[1]

ان کے علاوہ دوسروں کا ہوتا تو اس میں بدن سے مس نہیں ہوتا تھا الاّ یہ کہ کوئی ضرورت پیش آ جائے۔

بہرحال، ہر دور میں اسلامی ریاست کو اس طرح کے ہنگامی اور نازک حالات پیش آ سکتے ہیں۔ مسلمان عورت مذکورہ حدود و شرائط کی پابندی کرتے ہوئے اپنے دین اور ملک و ملت کی بالواسطہ یا بلا واسطہ خدمت کر سکتی ہے۔

---

[1] شرح مسلم جلد ۶، جزء ۱۲، ص ۱۵۸



عورت اور منصبِ امامت

اسلام کے نقطۂ نظر سے عورت جو اجتماعی اور سماجی ذمے داریاں انجام دے سکتی ہے اور اس کے لیے اس نے جو حدود مقرر کیے ہیں، اس کی تفصیل گزشتہ صفحات میں گزر چکی ہے۔ البتہ اسلام اس کے خلاف ہے کہ عورت کے نازک ہاتھوں میں ملت کی قیادت و رہ نمائی کی زمام دے دی جائے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے لیے جن اوصاف و خصوصیات کی ضرورت ہے وہ اس میں طبعاً موجود نہیں ہیں۔ یہ انتہائی غیر فطری بات ہوگی کہ عورت جس دائرہ میں کما حقہ ذمے داری ادا نہیں کرسکتی، اس پر اس کا بارِ گراں ڈال دیا جائے۔ اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کیا نکل سکتا ہے کہ اجتماعی طور پر قوم ہلاکت اور تباہی کی راہ پر چل پڑے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

هَلَكَتِ الرِّجَالُ حِيْنَ اَطَاعَتِ النِّسَاءَ.[۱] — مرد ہلاک ہوئے جب وہ عورتوں کی اطاعت کرنے لگے۔

ایک دوسرا فرمان جو اس سے زیادہ پر زور ہے اور اس معاملہ میں قولِ فیصل کی حیثیت رکھتا ہے، یہ ہے:

لَنْ يُّفْلِحَ قَوْمٌ وَلَّوْا اَمْرَهُمُ امْرَأَةً.[۲] — وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی، جس نے اپنی زمامِ اقتدار عورت کے حوالے کردی ہو۔

---

[۱] حاکم، المستدرک: ۴/ ۲۴۴

[۲] بخاری، کتاب المغازی، باب کتاب النبی الی کسریٰ و قیصر۔ ترمذی، ابواب الفتن، باب (بغیر عنوان) نسائی، کتاب آداب القضاۃ۔ مسند احمد، ۷/ ۱۸، ۲۵، ۳۱۔ حدیث ابی بکرۃ، حدیث نمبر ۱۹۸۸۹-۱۹۹۲۵، ۱۹۹۶۱ وغیرہ۔

رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد بخاری اور دیگر متعدد کتب حدیث میں صحیح سندوں کے ساتھ مروی ہے۔ اس حدیث کی شرح میں امام شوکانیؒ فرماتے ہیں:

فيه دليل على ان المرأة ليست من اهل الولايات ولا يحل لقوم توليتها لان تجنب الامر الموجب لعدم الفلاح واجب[1]	اس میں دلیل ہے اس بات کی کہ عورت سرپرستی اور حکومت کی اہل نہیں ہے اور کسی قوم کے لیے اس کو سرپرست مقرر کرنا جائز نہیں ہے، کیوں کہ عدم فلاح و خسران کو لازم کرنے والے فعل سے پرہیز کرنا ضروری ہے۔

شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اس حدیث کے ذیل میں فرماتے ہیں:

ازیں جا معلوم شد کہ زن قابل ولایت و امارت نیست[2]	اس سے معلوم ہوا کہ عورت حکومت اور سربراہی کے قابل نہیں ہے۔

علماء نے لکھا ہے کہ منصبِ امامت کا اہل وہی شخص ہوسکتا ہے جو دین کے اصول و فروع میں مجتہدانہ بصیرت رکھتا ہو کہ ہر طرح کی فکر رکھنے والے کو مطمئن کرسکے، معاملات میں ژرف نگاہ اور صلح و جنگ کی تدابیر سے پوری طرح واقف ہو، ورنہ وہ دین و ملت کو پیش آنے والے مسائل حل نہیں کرسکے گا۔ انتہائی جری اور عزم و حوصلہ کا مالک ہو، تاکہ کوئی قوت اس کو اپنے فرض کے ادا کرنے میں مانع نہ بن سکے۔ یہ صفات مردوں میں بھی عام نہیں ہیں۔ چند ایک ہی کو یہ عطا ہوتی ہیں۔ ان صفات کی حامل خواتین تاریخ میں شاذ و نادر ہی دیکھی گئی ہیں۔عورت کیوں منصبِ امامت کی اہل نہیں ہے، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے علامہ سعد الدین تفتا زانی علیہ الرحمہ شرحِ مقاصد میں لکھتے ہیں:

والنساء ناقصات عقل و دين ممنوعات عن الخروج الى	اس لیے کہ عورتوں کی عقل اور دین (ان کی جسمانی قوت) ناقص ہے اور ان کو فیصلہ کے

---

[1] نیل الاوطار: ۹/۱٦۱

[2] اشعۃ اللمعات: ۳/۳۰۹

مشاهد الحکم و معارک الحروب[1] — مقامات (عدالتوں) اور جنگ کے محاذوں پر جانے کی اجازت نہیں ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ یہ بحث کرتے ہوئے کہ خلیفہ کے اندر کن صفات کا پایا جانا ضروری ہے، فرماتے ہیں:

از آں جملہ آن ست کہ ذکر باشد نہ امرأة — ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ خلیفہ مرد ہو نہ کہ عورت۔

اس کی ایک دلیل ان کے نزدیک بخاری کی وہ حدیث ہے، جس کا حوالہ دیا جاچکا ہے۔ دوسری دلیل انھوں نے یہ دی ہے کہ عورت ذہنی اور جسمانی لحاظ سے خلافت کی ذمے داریوں کا بوجھ نہیں اٹھاسکتی۔ حدودِ شریعت بھی اس میں مانع ہیں۔[2]

امت کے قابل ذکر مسالک و مذاہب میں کوئی بھی عورت کی امامت و قیادت کو صحیح نہیں سمجھتا۔ علامہ ابن حزمؒ فرماتے ہیں:

وَ جَمِیعُ فِرَقِ اَهْلِ الْقِبْلَةِ لَیْسَ مِنْهُمْ اَحَدٌ یُجِیزُ اِمَامَةَ امْرَأَةٍ[3] — اہل قبلہ (مسلمانوں) کے تمام فرقوں میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو عورت کی امامت کو جائز سمجھتا ہو۔

حافظ ابن حجرؒ نے علامہ طبریؒ کے متعلق لکھا ہے کہ وہ عورت کی امارت اور قضا کو جائز سمجھتے ہیں۔ امام مالکؒ سے بھی اس طرح کی ایک روایت ہے۔[4]

یہ شاذ رائیں ہیں۔ ان کے دلائل بھی معلوم نہیں ہیں۔ امت کے اجماع کے مقابلہ میں انھیں قبول نہیں کیا جاسکتا۔

بعض لوگوں کا ذہن اس طرف منتقل ہوا ہے کہ عورت میں گو قیادت کی صلاحیت بالعموم نہیں پائی جاتی، لیکن اس کو خلیفہ بنائے جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ وہ

---

۱ ان مباحث کے لیے ملاحظہ ہو شرح مقاصد: ۲/ ۲۰۳۔ شرح مواقف: ۸/ ۳۴۹

۲ ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء: ۱/ ۴، سہیل اکیڈمی، لاہور

۳ الفصل فی الملل والاہواء والنحل: ۴/ ۱۱۰

۴ فتح الباری: ۸/ ۴۷۶

دوسرے قابل اور باصلاحیت افراد کے تعاون سے امورِ سلطنت انجام دے سکتی ہے۔ لیکن یہ خواہ مخواہ کی توجیہ ہے، کیوں کہ کوئی شخص کسی ذمے داری کا اہل اس وقت ہوتا ہے، جب کہ خود اس کے اندر اس ذمہ داری کو اٹھانے کی اہلیت ہو۔ یہ کوئی خاندانی جاگیر نہیں ہے کہ بغیر کسی استحقاق کے ازخود حاصل ہوجائے۔ اسی لیے علماء نے اس رائے کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا ہے۔

علامہ ابن عابدینؒ فرماتے ہیں:

و اما تقریرها فی نحو وظیفة الامام فلا شک فی عدم صحته لعدم اهلیتها خلافا لمازعمه بعض الجهلة انه یصح و تستنیب لِاَن صحة التقریر یعتمد وجود الاهلیة وجواز الاستنابة فرع صحة التقریر۔[1]

لیکن اس کو امام کے منصب جیسے منصب پر متعین کرنا بلاشبہ صحیح نہیں ہے، کیوں کہ وہ اس کی اہل نہیں ہے۔ بعض نادانوں کے اس خیال کے برعکس کہ اس کو امام بنانا درست ہے اور وہ اپنا نائب مقرر کرلے گی، کیوں کہ کسی منصب پر تعین اس وقت صحیح ہوتا ہے جب کہ اہلیت پائی جائے اور نائب مقرر کرنا تو کسی منصب پر تعین کے صحیح ہونے کے بعد کی چیز ہے۔

کتابوں سے یہ بھی پتا نہیں چلتا کہ کس حیثیت اور مرتبہ کے افراد اس فکر کے حامل رہے ہیں۔ امت کا یہ اتفاق کہ عورت پر امت کی امامت و قیادت کی ذمے داری نہیں ڈالی جاسکتی، کسی جانب داری یا تحقیر ونفرت کی بنا پر نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ اس کی فطری کمزوریاں اور مجبوریاں ہیں۔ نیابت اور جانشینی سے یہ کمزوریاں دور نہیں ہوسکتیں۔[2]

---

[1] ردالمحتار علی الدر المختار: ۸/ ۱۴۳

[2] اس موضوع پر مزید ملاحظہ ہو: اسلام کا عائلی نظام، بحث: اسلامی ریاست میں عورت کی قیادت، ص۱۴۹-۱۵۱، ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی-۲۵

تاریخ سے ایک غلط استدلال

سن ۳۵ ہجری میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا سانحہ پیش آیا۔ یہ اسلامی تاریخ کا ہولناک اور بدترین واقعہ تھا۔ اس کے نتیجہ میں نظامِ حکومت میں ابتری پیدا ہوگئی۔ حضرت علیؓ کی خلافت کو ابھی استحکام نہیں حاصل ہوسکا تھا۔ اس وقت ایک اہم سوال حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص کا تھا۔ حضرت علیؓ چاہتے تھے کہ انتشار ختم ہو اور امت میں اتحاد پیدا ہوجائے تو قصاص کی کارروائی کی جائے، لیکن بعض دوسرے صحابہ کرامؓ کے نزدیک قاتلین سے قصاص کو ہر دوسرے کام پر فوقیت حاصل تھی۔ ان میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے ساتھ حضرت عائشہؓ بھی تھیں۔ اس راہ میں وہ اس حد تک آگے نکل گئیں کہ حضرت علیؓ کے مقابلہ میں صف آرا ہوگئیں اور جنگِ جمل کا واقعہ پیش آیا[1]

---

[1] حضرت عثمانؓ کی شہادت کی تفصیلات سن ۳۵ھ کے واقعات کے ذیل میں اور جنگ جمل کی تفصیلات سن ۳۶ھ کے واقعات کے سلسلے میں تاریخ کے تمام اہم مآخذ میں موجود ہیں۔ اس وقت حسب ذیل مآخذ پیش نظر ہیں۔ شہادتِ عثمان، تاریخ الامم والملوک: ۲/ ۶۲۱ ومابعدہا۔ جنگ جمل، ۳/ ۳۶-۵۸ ومابعدھا اسی ترتیب سے ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۳/ ۴۳ وما بعدہا۔ ۳/ ۱۱۳ وما بعدہا۔ ابن کثیر البدایۃ والنہایۃ، جلد ۴، جزء ۷/ ۷/ ۱۳۷، وما بعدہا۔ ۷/ ۱۸۴ وما بعدہا۔ عمر بن شبّہ نے 'اخبار البصرۃ' میں جنگ جمل سے متعلق روایات بڑی حد تک جمع کردی ہیں۔ حافظ ابن حجر نے اس کی صحیح روایات کو الگ کرکے پیش کیا ہے اور کم زور روایات کی نشان دہی بھی کردی ہے۔ فتح الباری: ۱۴/ ۵۵۶،۵۵۷۔

موجودہ دور کے بعض 'محققین' کے نزدیک یہ واقعہ اس بات کی دلیل ہے کہ اسلام، جس حد تک مرد کو سیاسی جدوجہد کا حق دیتا ہے اس حد تک سیاست میں عورت کے عمل دخل کو بھی جائز سمجھتا ہے۔ اس لیے اس کی سیاسی و سماجی سرگرمیوں کو محدود کرنا اسلامی نقطۂ نظر سے صحیح نہیں ہے۔ بہ الفاظِ دیگر شریعت کے نزدیک صنفی اختلاف کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ مرد اور عورت دونوں کو یکساں آزادی حاصل ہے کہ وہ ہر سطح کے سیاسی و اجتماعی مسائل میں حصہ لیں اور ان کو سلجھانے کی کوشش کریں۔

اس واقعہ کی حقیقت سے تو بعد میں بحث کی جائے گی۔ یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ اس واقعہ کی بنیاد پر زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کی رائے میں عورت کو بھی سیاسی جدوجہد کا حق حاصل تھا۔ وہ سیاست کو مرد کے لیے مخصوص نہیں سمجھتی تھیں، لیکن اس سے آگے بڑھ کر یہ کہنا بالکل غلط ہوگا کہ اسلام کا یہی قانون ہے اور رسولِ اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں عورت کا یہی سیاسی رول رہا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ حضرت عائشہؓ کا کوئی عمل ہمارے لیے اسوہ بن سکتا ہے تو کیا دیگر امہات المومنین و اکابر صحابیات قابل تقلید نہیں ہیں؟ اگر حضرت عائشہؓ کا حضرت علیؓ سے جنگ کرنا ہمارے لیے سند ہے تو حضرت ام سلمہؓ کی روش کیوں اسوہ نہیں بن سکتی؟ حضرت علیؓ جس وقت حضرت زبیرؓ، طلحہؓ اور حضرت عائشہؓ کے مقابلہ کے لیے بصرہ کی طرف روانہ ہونے لگے تو حضرت ام سلمہؓ نے حضرت علیؓ سے کہا:

یا امیر المومنین لولاَ ان اعصی	اے امیر المومنین! آپ کے ساتھ اس مہم پر
اللّٰہ و انّک لاَ تقبلہ منی	میرا چلنا خدا کی نافرمانی میں شمار ہوگا اور یہ
لخرجت معک و ھٰذا ابنی	کہ آپ میرے اس اقدام کو قبول بھی نہیں
عمر وھو واللّٰہ اعزّ علیَّ من	کریں گے۔ اگر یہ دونوں باتیں نہ ہوتیں تو

نفسی یخرج معک و یشھد مشاھدک۔[1]

میں آپ کے ساتھ چلتی۔ یہ لیجیے میرا لڑکا عمر حاضر ہے۔ قسم خدا کی، یہ مجھے اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ یہ آپ کے ساتھ چلے گا اور آپ کے ساتھ جنگوں میں شریک ہوگا۔

دوسری طرف حضرت عائشہؓ کو لکھا: ''آپ کی حیثیت رسول اللہ اور امت کے درمیان ایک دروازے کی ہے اور آپ کا حجاب گویا اس پر حرمت کا پردہ ہے، لیکن آپ نے اس پردہ کو چاک کر دیا (یاد رکھئے!) قرآن نے آپ کے دامن کو سمیٹ دیا ہے، اسے پھیلایئے نہیں، اللہ نے آپ کو اپنے گھر میں بٹھایا ہے، اسے چھوڑ کر میدان میں نہ پہنچ جایئے۔ خدائے تعالیٰ اس امت کی پشت پر ہے۔ آپ خود جانتی ہیں کہ حضورﷺ کو آپ سے کس قدر محبت تھی۔ اگر امت کی ذمے داری آپ کے حوالہ کرنا چاہتے تو کر سکتے تھے، لیکن ایسا نہیں کیا۔ آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ دین کا ستون اگر گرنے لگے تو عورتیں کھڑا نہیں کرسکتیں۔ اگر اس میں شگاف پیدا ہوجائے تو عورتوں کے بس میں نہیں کہ اسے بھردیں۔ ان میں اگر دین کے لیے جہاد کی اہلیت ہوتی تو حضورؐ لازماً آپ کو جہاد کی وصیت کر جاتے۔ عورتوں کا جہاد اور ان کے لیے انتہائی محبوب بات یہ ہے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنا دامن سمیٹے رہیں۔

ذرا سوچئے تو سہی کہ آپ کی ملاقات حضورؐ سے اس حال میں ہوتی کہ آپ اونٹ پر بیٹھے ہوئے پہاڑوں اور ٹیلوں کے اطراف ایک گھاٹ سے دوسرے گھاٹ گھوم رہی ہیں تو آپ کیا جواب دیتیں! کل آپ کو حضورؐ کے سامنے حاضر ہونا ہے اور حال یہ ہے کہ آپ نے اللہ کے ڈالے ہوئے پردے کو چاک کر دیا ہے اور اس کے عہد کو توڑ چکی ہیں۔

آپ نے جو کچھ کیا، اگر وہ مجھ سے سرزد ہوتا تو قسم خدا کی، مجھے جنت میں جاتے ہوئے بھی ندامت ہوتی (لہٰذا میری گزارش ہے) کہ آپ حضورؐ کے قائم کردہ

---

[1] طبری، تاریخ الامم والملوک: ۳/ ۸۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۳/ ۱۱۴

پردے کو اپنا ستر اور گھر کے صحن کو اپنا قلعہ بنائیں۔ آپ حقیقت میں امت کی خیر خواہ اسی وقت ہوں گی جب کہ آپ اس کی مدد کے لیے (بجائے میدان میں جانے کے) گھر میں رہیں، اگر میں آپ کو وہ حدیث سناؤں جو میں نے حضورؐ سے سنی ہے تو (یقین جانیے) آپ سانپ کی طرح مجھے ڈسنے کے لیے دوڑ پڑیں گی۔''[۱]

یہ نہ خیال کیا جائے کہ اس تنقید میں حضرت ام سلمہؓ تنہا ہیں، بلکہ بہت سے اکابرِ امت نے حضرت عائشہؓ کے اقدام کو غلط اور شرعی حدود سے تجاوز قرار دیا تھا۔

حضرت عائشہؓ اپنی مہم پر بصرہ پہنچیں تو انھوں نے زید بن صوحان کو اپنی اولاد خالص سے خطاب کر کے خط لکھا ہے کہ ''حضرت عثمانؓ کا قصاص لینے کے لیے جو کوشش ہو رہی ہے فوراً تم اس میں شریک ہو جاؤ اور اگر شریک ہونا نہیں چاہتے ہو تو کم از کم اپنی قوم کے لوگوں کو حضرت علیؓ کی حمایت سے باز رکھو۔'' یہ خط دیکھ کر زید بن صوحان نے کہا ''اللہ ام المومنین پر رحم کرے، انھیں گھر میں بیٹھے رہنے اور ہمیں باہر نکال کر جہاد کرنے کا حکم دیا گیا تھا، لیکن جس امر کی وہ پابند ہیں خود تو اس سے آزاد ہو گئیں اور ہم سے اس کی پابندی کرانا چاہتی ہیں۔ اور جس کام پر ہم مامور کیے گئے ہیں اسے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے اور ہمیں اس سے روک رہی ہیں۔ پھر خط کے جواب میں حضرت عائشہؓ کو لکھا: ''یقیناً میں آپ کی اولاد خالص ہوں (اور آپ میری ماں ہیں) بشرطے کہ آپ اس سعی و جہد سے کنارہ کش ہو جائیں اور گھر لوٹ جائیں، ورنہ آپ کو چھوڑنے والوں میں مجھے پہلا شخص سمجھیے۔''[۲]

بصرہ کی ایک اور مشہور شخصیت اور صحابیِ رسول حارثہ بن قدامہؓ حضرت عائشہؓ سے کہتے ہیں: ''آپ کے اس خروج کے مقابلہ میں ہمارے نزدیک حضرت عثمانؓ کی شہادت بہت ہلکی ہے۔ اللہ نے آپ کی حرمت قائم کی تھی اور آپ کو پردے کا پابند کیا

---

[۱] طبری، تاریخ الامم والملوک: ۳/ ۸۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۳/ ۱۱۴

[۲] طبری، تاریخ الامم والملوک: ۳/ ۲۲۔ ابن اثیر، الکامل: ۳/ ۱۰۸، ۱۰۹۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، جلد ۴، جزء ۷، ص ۱۸۷

تھا، لیکن آپ نے اس پردے کو چاک اور اس کی حرمت کو ختم کر دیا۔ جو شخص آپ سے جنگ جائز سمجھتا ہے وہ گویا آپ کے قتل کو بھی جائز سمجھتا ہے (غور کیجیے! آپ نے لوگوں کو کس قدر نازک پوزیشن میں ڈال دیا ہے، لہٰذا) اگر آپ اپنی خوشی سے آئی ہیں تو اپنے گھر لوٹ جایئے اور اگر آپ کو مجبور کر کے یہاں لایا گیا ہے تو اس کے خلاف لوگوں کا تعاون حاصل کیجیے اور اپنے مستقر پر پہنچ جایئے۔"[۱]

مشہور صحابی ابوبکرہؓ کہتے ہیں کہ میں جنگ جمل میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ شریک ہو جاتا، لیکن حضورؐ کے ایک فرمان نے مجھے اس سے بچا لیا۔ جب آپ کو کسریٰ کی لڑکی کے تخت نشین ہونے کی اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا تھا کہ "وہ قوم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی جو اپنا اقتدار کسی عورت کے حوالے کر دے۔"[۲]

حضرت عبد اللہ بن عمرؓ جیسے بزرگ صحابی فرماتے ہیں:

وَ بَیْتُهَا خَیْرٌ لَّهَا مِنْ هَوْدَجِهَا[۳] — حضرت عائشہؓ کے لیے ان کا گھر، ان کے ہودج سے بہتر ہے۔

ان تنقیدوں کو کوئی شخص یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کرسکتا کہ یہ حضرت عائشہؓ کے مخالفین کی ہیں۔ کیوں کہ یہ وہ بزرگ ہیں جن کی حق پسندی و نیکی کی حضرت عائشہؓ بھی معترف تھیں اور اگر ایسے ایسے صحابہ و تابعین بھی مخالفت کے جوش میں جادۂ حق سے منحرف ہوگئے تو دین پر استقلال اور ثابت قدمی کی کس سے توقع کی جاسکتی ہے؟

پھر یہ بھی ایک غور طلب سوال ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت عائشہؓ تقریباً پچاس سال زندہ رہیں اور اس دوران میں اسلامی تاریخ نے بڑے نشیب و فراز دیکھے اور سیاسی تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ آخر کیا وجہ ہے کہ حضرت عائشہؓ ہمیشہ ان سے کنارہ کش رہیں اور اصلاح کے لیے کبھی کوئی سیاسی اقدام نہیں کیا۔ کیا یہ اس بات

۱۔ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۳/ ۱۵، ۱۶۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ، جلد ۴، جزء ۷، ص ۱۸۶

۲۔ بخاری، کتاب الفتن، باب (۱۸)

۳۔ الامامۃ والسیاسۃ، جلد ۱، صفحہ ۶۲

کا ثبوت نہیں ہے کہ گھر ہی کو وہ اپنی سرگرمیوں کا محور سمجھتی تھیں؟ ان کی پوری زندگی جس طرزِ فکر و عمل کی شہادت دے رہی ہے اس کی تردید کسی ایک اقدام سے نہیں کی جاسکتی۔ اس کی ہمیں لازماً ایسی توجیہ کرنی ہوگی جو ان کی زندگی کی مجموعی روش سے ہم آہنگ ہو۔ کیوں کہ اس بات کا امکان ہے کہ اس عمل کے پیچھے وہ محرکات نہ ہوں، جو ہم نے سمجھ لیے ہیں اور کچھ دوسرے ہی اسباب و حالات نے حضرت عائشہؓ کو میدانِ جنگ میں پہنچا دیا ہو۔ آیئے، اس واقعہ کی حقیقت کو کسی قدر تفصیل سے سمجھنے کی کوشش کی جائے۔

حضرت عثمانؓ کی خلافت کے آخری دور میں ان کے خلاف ایک عام بے اطمینانی پیدا ہوگئی تھی اور لوگ برملا تنقید کرنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ ایک وہ وقت آیا کہ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے بلوائیوں اور شورش پسندوں نے مدینے پر حملہ کر دیا اور اس کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا عظیم سانحہ پیش آیا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض بزرگوں نے اس سیلاب کو روکنے کی اپنی حد تک پوری پوری کوشش کی، لیکن وہ ناکام رہے اور اس فتنے سے دین وملت کو جو نقصان پہنچنا تھا، پہنچ کر رہا۔ یہ اپنی نوعیت کا پہلا واقعہ تھا۔ اس نے امت کو اپنی جگہ سے ہلا دیا۔ سوچنے سمجھنے والوں نے محسوس کیا کہ یہ حقیقت میں ان کی ناکامی اور فتنہ جو عناصر کی کامیابی ہے۔ اگر بروقت اس کی تلافی نہیں کی گئی تو دین ہمیشہ کے لیے شرپسندوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جائے گا۔ اس کی صورت بعض افراد نے یہ سوچی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت میں جو بھی شریک رہا ہے، فوراً اس سے قصاص لیا جائے ورنہ امت کا اجتماعی وزن گھٹ جائے گا۔ اور اقتدار چند شرپسندوں اور باغیوں کے ہاتھ میں چلا جائے گا۔ وہ جسے چاہیں گے خلیفہ مقرر کریں گے اور جب چاہیں گے اسے تہِ تیغ کردیں گے اور کوئی قوت اُن سے بازپرس کرنے والی نہیں رہ جائے گی۔ اس طرزِ فکر کی قیادت حضرت زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ کر رہے تھے۔

مُلیح بن عوف السلمی نے حضرت زبیرؓ سے دریافت کیا کہ آپ لوگ کیا چاہتے ہیں؟

انھوں نے جواب دیا:

ننهض الناس فيدرک بهٰذا الدم لئلا يبطل فان فی ابطاله توهين سلطان الله بيننا ابداً اذا لم يفطم الناس عن امثالها لم يبق امام الا قتله هذا الضرب قال والله ان ترک هٰذا لشديد ولاَ تدرون الی اين ذٰلک يسير.[۱]	ہم لوگوں کو ابھار رہے ہیں کہ وہ اس خون کا بدلہ لیں تاکہ وہ ضائع نہ ہو جائے کیوں کہ اس کے ضائع جانے سے اقتدار خداوندی (اسلامی حکومت) ہمارے درمیان ہمیشہ کے لیے کم زور ہوکر رہ جائے گا۔ اگر لوگوں کی یہ عادت چھڑائی نہ جائے، تو جو بھی امام آئے گا اس کو تلوار کی یہ مار ختم کردے گی۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم! اس کا قصاص نہ لینا بہت سخت ہے۔ تمھیں نہیں معلوم کہ اس کے نتائج کہاں تک پہنچیں گے؟

یہاں ایک دوسرا گروہ بھی تھا جو امت کے اتحاد و اتفاق کو بنیادی اہمیت دے رہا تھا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شیرازۂ ملت منتشر ہو چکا ہے اور امت نے ایک خودسر فوج کی شکل اختیار کرلی ہے۔ ان حالات میں اس کے نزدیک حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مسئلہ چھیڑنا مزید انتشار کو دعوت دینا تھا۔ اس گروہ نے ضروری سمجھا کہ پہلے امت کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ چناں چہ اس نے حضرت علیؓ کو اپنا خلیفہ منتخب کیا۔ مدینے کی اکثریت نے اس گروہ کا ساتھ دیا۔ اس صورتِ حال کے بعد پہلی فکر کے حامل بہت سے افراد مدینہ چھوڑ کر دوسرے شہروں کی طرف روانہ ہوگئے۔ ان ہی میں سے بعض مکہ پہنچے، جہاں پہلے سے امہات المومنین موجود تھیں۔ ان کو مدینے میں ہونے والی تبدیلیوں کا علم نہیں تھا۔ کیوں کہ یہ ان سے قبل ہی حج کے ارادے سے مکے آ گئی تھیں۔ جب انھوں نے مدینے سے آنے والے حضرات سے وہاں کے حالات دریافت کیے تو انھوں نے ایسا نقشہ پیش کیا جو اصل حقیقت سے بہت کچھ مختلف تھا۔ گویا اب خلافت ختم ہوچکی ہے۔ مدینے میں شرپسندوں اور غنڈوں کا دور دورہ ہے اور ان ہی کا متعین کردہ ایک شخص حکومت کر رہا ہے۔

---

[۱] طبری، تاریخ الامم والملوک: ۳/ ۱۳

حضرت عائشہؓ نے اپنے ایک رشتہ دار سے پوچھا: 'کیا حال ہے؟' اس نے جواب دیا کہ حالات کی سختی نے لوگوں کو بہرا اور تباہ و برباد کر دیا ہے۔ حضرت عائشہؓ نے افسوس کا اظہار کرنے کے بعد پھر سوال کیا: بتاؤ کیا حالات ہمارے حق میں ہیں، یا ہمارے خلاف جا رہے ہیں؟ اس نے کہا: میں یہ سب کچھ نہیں جانتا، حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد آٹھ دن تک لوگ بغیر امیر کے زندگی گزارتے رہے۔ اس کے بعد اہلِ مدینہ اور وہ لوگ جو مدینے پر چھائے ہوئے تھے (یعنی باہر سے آنے والے فسادی) حضرت علیؓ کے اطراف جمع ہوگئے ہیں[1]

حضرت عائشہؓ کے ایک اور رشتہ دار ان سے بیان کرتے ہیں:

قتل عثمان واجتمع الناس علٰی عليٍّ والامر امر الغوغاء.[2]

حضرت عثمانؓ قتل کردیے گئے۔ بعد ازاں لوگ حضرت علیؓ کی بیعت پر متفق ہوگئے اور اصل اقتدار تو غنڈوں کے ہاتھ میں ہے۔

مکہ پہنچنے والے ان ہی لوگوں میں حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ بھی تھے، جن کو حضرت علیؓ کی بیعت سے اتفاق نہیں تھا۔ اس لیے آپ کی بیعت اور نئی تبدیلیوں کے خلاف ان کے اندر سخت جذبات کا پایا جانا کسی حد تک قدرتی تھا۔ چناں چہ حضرت عائشہؓ کے سوال پر جن الفاظ میں انھوں نے نئے حالات کا تذکرہ کیا ان سے اس کا اندازہ کیا جاسکتا ہے:

انا تحملنا بقلتنا هرابا من المدينة من غوغاء و اعراب و فارقنا قوما حيارىٰ لا يعرفون حقا ولا ينكرون باطلا ولا يمنعون انفسهم.[3]

مدینہ سے ہم اپنی قلتِ تعداد کی بنا پر شرپسندوں اور بدوؤں (کے خوف) سے بھاگے چلے آئے اور وہاں ہم ایک حیران و سرگرداں قوم (اہل مدینہ) کو چھوڑ آئے ہیں جو نہ حق کو پہچانتی ہے اور نہ باطل پر نکیر کرتی ہے اور نہ اس میں اپنے آپ کی مدافعت ہی کی طاقت ہے۔

۱۔ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۳/۶۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۳/۱۰۰

۲۔ طبری، تاریخ الامم والملوک: ۳/۷

۳۔ طبری تاریخ الامم والملوک: ۳/۷۔ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۳/۱۰۱

حضرت طلحہؓ اور زبیرؓ اور ان کے ہم فکر اصحاب نے مکہ پہنچنے کے بعد اب اس بات کی کوشش شروع کردی کہ جو اصلاحی قدم وہ اٹھانا چاہتے تھے اس کے لیے راہ ہموار کریں اور حضرت عثمانؓ کے قاتلین سے قصاص لینے کی امت کو دعوت دیں۔ اس کے لیے انھیں امہات المومنین کے تعاون اور ہم دردی کی سخت ضرورت تھی جو اتفاق سے وہاں موجود تھیں اور نئے حالات سے بے انتہا متاثر بھی تھیں، کیوں کہ کسی تحریک کے ساتھ ان کی ہم دردی اس میں زندگی کا باعث بن سکتی تھی۔ چناں چہ ان حضرات نے امہات المومنین سے، خاص طور پر حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ سے، جن کا سوسائٹی پر نمایاں اثر تھا، درخواست کی کہ وہ قیامِ دین کی جدوجہد میں ان کا ساتھ دیں۔ لیکن سوائے حضرت عائشہؓ کے دیگر امہات المومنین نے اسے اپنے حدود سے تجاوز قرار دیا اور تعاون سے انکار کر دیا۔ چناں چہ وہ مدینہ واپس چلی آئیں۔[1]

حضرت عائشہؓ نے بہت ممکن ہے، سوچا ہو کہ اس سے پہلے صرف ایک شخص حضرت ابوبکرؓ کے عزم و ہمت نے ارتداد جیسے فتنہ کو کچل کر رکھ دیا تھا، اب بھی اس امت میں اتنا دم خم ہے کہ موجودہ شورش اور بغاوت کو وہ فرو کر سکتی ہے۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ کوئی صاحبِ عزم و ایمان اس کو اس مقصد کے لیے تیار کرلے۔ بہرحال، جو بھی سوچا ہو، انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ امت کو اصلاحِ حال کی دعوت دی جائے۔

چناں چہ جب وہ اپنی مہم پر بصرہ پہنچیں تو گورنر بصرہ عثمانؓ بن حنیف نے عمران بن حصین اور ابو الاسود کو آپ کی خدمت میں بھیجا کہ وہ آپ کا منشا دریافت کر آئیں۔ چناں چہ ان کے استفسار پر حضرت عائشہؓ نے جواب دیا:

ان الغوغاء و نزاع القبائل غزوا	غنڈوں اور اپنے قبیلوں سے نکلے ہوئے لوگوں
حرم رسول اللہ و احدثوا فیہ	نے حرم رسول میں جنگ کی، اس میں بدعت

---

[1] ایک روایت کے مطابق حضرت عائشہؓ کے ساتھ اور امہات المومنین بھی مکہ سے بصرہ کے لیے روانہ ہوئیں، لیکن مقام 'ذات العرق' پہنچ کر وہ مدینہ لوٹ گئیں۔ حضرت عائشہ خود بھی واپس ہونا چاہ رہی تھیں، لیکن عبد اللہ بن زبیرؓ کے کہنے پر وہ آمادہ ہوگئیں۔ البدایۃ والنہایۃ، جلد ۴، جزء ۷، ص ۱۸۵۔

و اٰووا المُحدثین فاستوجبوا لعنة اللّٰه و لعنة رسول اللّٰه مع ما نالوا من قتل امام المسلمین بلا ترة ولا عذر فاستحلوا الدم الحرام و سفکوه و انتهبوا المال الحرام و احلوا البلد الحرام و الشهر الحرام فخرجت فی المسلمین اعلمهم ما اتیٰ هؤلاَءِ وماَ الناس فیما وراء نا وما ینبغی لهم من اصلاح هٰذه القصة و قرأت لاَ خَیْرَ فِیْ کَثِیْرٍ مِّنْ نَّجْوَاهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلاَحٍ بَیْنَ النَّاسِ وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا○ فَهٰذَا شَاننا الی معروف نامرکم به و منکر ننهاکم عنه.[1]

پھیلائی اور بدعتیوں کو جگہ دی۔ اس طرح اللہ اور اس کے رسول کی لعنت کو اپنے اوپر واجب کرلیا۔ ساتھ ہی انھوں نے مسلمانوں کے امام کو بغیر کسی ظلم اور جائز وجہ کے قتل کیا ہے۔ پس بیک وقت انھوں نے خونِ ناحق کو حلال کیا اور اسے بہایا۔ اور مال و دولت کو لوٹا جس کا انھیں حق نہیں تھا۔ محترم مدینے اور محترم مہینے کی حرمت کوختم کر دیا۔ میرے نکلنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کو بتاؤں کہ ان فتنہ بازوں نے کیا کیا ہے اور ہمارے پیچھے لوگ کس حال میں پڑے ہوئے ہیں اور ان حالات میں انھیں کس قسم کی اصلاح کرنی چاہیے؟ پھر حضرت عائشہؓ نے یہ آیت پڑھی (جس کا ترجمہ یہ ہے) ''ان کی بیشتر سرگرمیوں میں کوئی خیر نہیں ہے مگر وہ جو خیرات یا بھلائی یا لوگوں کے درمیان اصلاح کا حکم دے اور جو شخص اللہ کی رضا کی خاطر ایسا کرے گا ہم اس کو عن قریب بڑا اجر دیں گے۔'' اور کہا یہ ہے ہماری پوزیشن کہ ہم تم کو بھلائی کا حکم دے رہے ہیں اور برائی سے روک رہے ہیں۔

قعقاع نے پوچھا ''ام المومنین! آپ کس غرض سے یہاں آئی ہیں؟ جواب دیا:

ای بنی الاصلاح بین الناس.[2]

اے بیٹے! لوگوں کے درمیان اصلاح کے لیے آئی ہوں۔

---

[1] طبری، تاریخ الامم الملوک، ۳/ ۱۴ ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۳/ ۱۰۴

[2] ابن اثیر، الکامل فی التاریخ: ۳/ ۱۱۹۔ ابن کثیر، البدایۃ والنہایۃ: جلد ۴، جزء ۷، ص ۱۹۰

یہ تصریحات بتاتی ہیں کہ ان کے سامنے نہ تو کسی قسم کے اقتدار کا حصول تھا اور نہ وہ کوئی منصوبہ بنا کر حضرت علیؓ سے جنگ کے لیے روانہ ہوئی تھیں، بلکہ وہ صرف یہ چاہتی تھیں کہ اپنے اثر ورسوخ سے امت کو اصلاحِ حال کی طرف متوجہ کریں۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

ان عائشة لم تقاتل ولم تخرج لقتال و انما خرجت بقصد الاِصلاح بین المسلمین و ظنت ان فی خروجها مصلحة للمسلمین۔[1]

حضرت عائشہؓ نے نہ تو جنگ کی اور نہ وہ جنگ کی غرض سے چلی تھیں۔ وہ تو صرف مسلمانوں کی اصلاح کے ارادے سے گھر سے نکلی تھیں، کیوں کہ وہ خیال کر رہی تھیں کہ ان کے گھر چھوڑنے میں مسلمانوں کی بھلائی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بعد میں حضرت عائشہؓ کو حضرت علیؓ سے جنگ بھی کرنی پڑی، لیکن اس میں بظاہر ان کے قصد و ارادے سے زیادہ حالات کا دخل تھا۔

اسی طرح یہ بھی حقیقت ہے کہ گو ان کو اپنے ہم خیال لوگوں میں قائد اور رہنما کی حیثیت حاصل تھی، ان ہی کی مرضی سے تمام معاملات طے ہوتے تھے اور کوئی کام ان کے مشورے کے بغیر طے نہیں پاتا تھا، لیکن اس کے باوجود تاریخ سے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کیا جاسکتا کہ انھوں نے ایک مشیر اور بہی خواہ سے آگے بڑھ کر قیادت و رہنمائی کا بھی دعویٰ کیا ہو اور جو لوگ آپ کے اشارے پر جان و مال لٹانے کے لیے تیار ہی نہیں تھے بلکہ عملاً لٹا رہے تھے وہ بھی آپ کو قانوناً اپنا خلیفہ تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ حتی کہ نماز حضرت طلحہؓ پڑھائیں یا حضرت زبیرؓ، اس مسئلے میں ان کے درمیان اختلاف ہوا تو حضرت عائشہؓ ہی کے مشورے سے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ کو اس کام پر مامور کیا گیا، لیکن کسی نے اس منصب کے لیے حضرت عائشہؓ کا نام تجویز تک نہیں کیا، حالاں کہ نماز کی امامت، قیادتِ ملت کا ایک چھوٹا سا نمونہ ہے۔ یہ سب کچھ

---

[1] منہاج السنة: ۲/ ۱۸۵

ان لوگوں کے درمیان ہوا جو آپ کے مخالف نہیں بلکہ مؤید و ناصر تھے اور جن کے نزدیک آپؓ کی دینی حیثیت حضرت طلحہؓ و زبیرؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ سے کہیں زیادہ تھی۔

بہرحال یہ واقعہ انتہائی ہنگامی حالات کا نتیجہ تھا۔ اس میں حضرت عائشہؓ کو ایسے اقدامات کرنے پڑے، جس کی توقع عام حالات میں ان سے ہرگز نہیں کی جاسکتی تھی۔ اس ایک واقعہ سے قطع نظر رسول اللہ ﷺ کے ارشادات، شریعت کے مزاج، صحابہ کرامؓ کے تعامل نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت منصبِ قیادت کی متحمل نہیں ہے۔ بعد کے ادوار میں بھی امت کا فی الجملہ یہی تعامل رہا ہے۔ اگر کچھ استثنائی مثالیں موجود بھی ہیں تو وہ حجت اور سند نہیں بن سکتیں۔ مشہور فقیہ علامہ ابن قدامہ حنبلیؒ فرماتے ہیں:

ولا تصلح للامامة العظمٰى ولاَ لتولية البلدان و لهٰذا لم يول النبی ﷺ ولاَ احد من خلفائهٖ ولاَ من بعدهم امرأة قضاء ولاَ ولاَية بلد فی ما بلغنا و لو جاز ذٰلک لم يخل منه جميع الزمان غالباً![1]

عورت، امامت عظمیٰ (ریاست کی سربراہی) اور شہروں کی ولایت (گورنری) کی اہل نہیں ہے۔ اسی وجہ سے نبی ﷺ، آپ کے کسی خلیفہ اور ان کے بعد کے خلفاء نے کسی عورت کو، جہاں تک ان کے بارے میں ہماری معلومات ہیں، قضا اور گورنری کے منصب پر مامور نہیں کیا، اگر اس کا جواز ہوتا تو یہ پورا زمانہ اس سے بالعموم خالی نہ ہوتا۔

امت کا یہ رویہ عورت کے ساتھ کسی تعصب کی بنیاد پر نہیں ہے، بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن مجید کے اشارات، رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد، پوری شریعت کا مزاج اور عورت کی جسمانی و ذہنی صلاحیتیں اس کی اجازت نہیں دیتیں۔

---

[1] ابن قدامہ، المغنی: ۱۴/ ۱۳۔ یہاں بحث امامت کبریٰ یا ریاست کی سربراہی کی ہے۔ عورت منصب قضا کی اہل ہے یا نہیں اور ہے تو کن معاملات میں، اس پر تفصیل سے بحث گزر چکی ہے۔

ملکۂ سبا اور عورت کی امامت

قرآن مجید میں ملکۂ سبا کا ذکر ہے۔ اس سے بعض حضرات نے یہ استدلال کیا ہے کہ عورت کا والیِ ریاست ہونا اسلامی نقطۂ نظر سے غلط نہیں ہے۔ لیکن یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ اس پر یہاں کسی قدر تفصیل سے گفتگو کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

قرآن مجید میں قومِ سبا کا ذکر دو جگہ آیا ہے۔ (سورۂ نمل: ۲۰ تا ۴۴، سورۂ سبا: ۱۵ تا ۲۱)۔ یہ یمن کی ایک طاقت ور اور تجارت پیشہ قوم تھی۔ حضرت سلیمانؑ کے دور میں اس کی سربراہ ایک عورت تھی۔ چناں چہ اس قوم کے بارے میں حضرت سلیمانؑ کو ہدہد نے جو معلومات فراہم کیں، ان میں سے ایک یہ تھی:

اِنِّیْ وَجَدْتُّ امْرَاَةً تَمْلِكُهُمْ — میں نے پایا کہ ایک عورت ان پر بادشاہی کر رہی ہے۔[۱] (النمل: ۲۳)

۱- قرآن مجید نے یہاں ایک مشرک قوم کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے، اس کا عمل

---

[۱] حضرت سلیمانؑ کے دور میں قومِ سبا پر جو عورت حکومت کر رہی تھی، اس کا نام اسرائیلی روایات میں بلقیس بتایا گیا ہے اور اس کی پیدائش سے موت تک پوری زندگی کے عجیب وغریب حالات بیان ہوئے ہیں۔ ان میں سے بیشتر واقعات صرف یہی نہیں کہ خلافِ عقل ہیں، بلکہ ان میں سے بعض واقعات سے حضرت سلیمانؑ کی عظمت پر بھی حرف آتا ہے۔ افسوس کہ ہماری بہت سی تفسیروں میں یہ واقعات بغیر تحقیق وتنقید کے جگہ پاگئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بعض مفسرین نے یہ واضح کر دیا ہے کہ یہ سب اسرائیلی خرافات ہیں، ان کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے۔ =

ہمارے لیے کوئی اسوہ نہیں ہے۔

۲- ملکۂ سبا حضرت سلیمانؑ کے دربار میں حاضر ہوئیں تو کہا۔

رَبِّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ وَ اَسْلَمْتُ مَعَ سُلَیْمَانَ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○ (النمل: ۴۴)	اے میرے رب میں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہے اور میں سلیمان کے ساتھ اللہ رب العٰلمین کی مطیع فرمان ہوگئی۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ کفر و شرک کو چھوڑ کر اسلام لے آئیں اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا دین قبول کرلیا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد کیا وہ اپنے اقتدار سے دست بردار ہوگئیں اور ان کی حکومت حضرت سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا جزء بن گئی یا حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کا اقتدار باقی رکھا اور وہ حسبِ سابق اپنی قوم کی قیادت کرتی رہیں؟ قرآن مجید اس معاملہ میں بالکل خاموش ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان سے شادی کرلی اور سبا پر ان کا اقتدار باقی رکھا۔ وہ ہر ماہ یمن جاتے اور تین دن ان کے پاس قیام

= حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی ایک روایت میں حضرت سلیمانؑ اور ملکۂ سبا کے متعلق اس طرح کے بہت سے واقعات بیان ہوئے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ اس روایت کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ یہ انتہائی منکر روایت ہے۔ یہ باتیں اہل کتاب سے لی گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کے راوی عطاء بن السائب کو حضرت ابن عباسؓ کی طرف انھیں منسوب کرنے میں وہم ہوا ہے (آخر میں ان کا حافظہ قابل اعتماد نہیں رہا تھا)۔

مزید فرماتے ہیں کہ اس قسم کے معاملات میں اہل کتاب کے صحیفوں میں جو کچھ تھا وہ لے لیا گیا ہے۔ بنو اسرائیل کے واقعات و حالات جو پیش آچکے اور جو ابھی پیش نہیں آئے، جن میں تحریف ہوچکی یا جو منسوخ ہوچکے وہ سب کعب احبار اور وہب بن منبہ جیسے افراد نے۔ اللہ انھیں معاف فرمائے۔ امت میں پھیلا دیے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے زیادہ صحیح، زیادہ نافع، زیادہ واضح اور زیادہ موثر چیزیں بیان کردی ہیں۔ اس کے بعد ان چیزوں کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تفسیر ابن کثیر: ۶/ ۲۰۹، ۲۱۰۔ قاضی شوکانی نے علامہ ابن کثیر کی اس تنقید کو اپنی پوری تائید کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو فتح القدیر: ۴/ ۱۴۲۔

فرماتے۔ ان سے انھیں اولاد بھی ہوئی۔ لیکن بعض دوسری روایات بتاتی ہیں کہ حضرت سلیمانؑ نے ملکۂ سبا ہی کی خواہش پر اس کی شادی ہمدان کے بادشاہ ذو تبع سے کرادی تھی۔ اس کے بعد وہی سبا کا حکمراں بن گیا[1]

یہ تمام اسرائیلی روایات ہیں۔ قرآن مجید یا صحیح احادیث سے ان کی تائید نہیں ہوتی۔ حضرت عبد اللہ بن عتبہ بن مسعودؓ کی یہ بات بڑی باوزن ہے کہ ملکۂ سبا کے اسلام لانے کے بعد کے واقعات کا علم ہمیں نہیں ہے۔[2]

حقیقت یہ ہے کہ یہ بات کسی قطعی دلیل سے ثابت نہیں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ملکۂ سبا کو اپنے علاقہ کی حکومت پر برقرار رکھا، اس لیے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ عورت کی سربراہی کو حضرت سلیمانؑ کی سند جواز حاصل ہے۔

۳- اگر اس سے عورت کی سربراہی کا جواز نکلتا تو رسول اللہ ﷺ یہ ہرگز نہ فرماتے کہ وہ قوم کبھی فلاح نہیں پائے گی، جو اپنا اقتدار کسی عورت کے حوالہ کردے۔ اس نے ثابت کر دیا کہ آیت سے اس کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی۔

۴- اس استدلال کی کم زوری اس سے بھی واضح ہے کہ چودہ سو سال سے ملکۂ سبا کا واقعہ قرآن مجید میں پڑھا جا رہا ہے، لیکن موجودہ دور سے پہلے صحابہ و تابعین اور بعد کے مفسرین اور فقہاء میں سے کسی نے یہ استدلال نہیں کیا کہ عورت سربراہ مملکت ہوسکتی ہے۔

اب آیئے یہ دیکھیں کہ سورۂ نمل کی جس آیت میں ملکۂ سبا کا ذکر ہے کیا اس

---

[1] تفسیر بغوی مع تفسیر خازن: ۵/ ۱۲۵۔ علامہ قرطبی نے بھی یہ روایات نقل کی ہیں۔ اس کے بعد فرماتے ہیں: و قال قوم لم یرد فیہ خبر صحیح لا فی انہ تزوجھا ولا فی انہ زوجھا۔ (الجامع لاحکام القرآن: ۱۳/ ۲۱۰) یعنی ''بعض لوگوں کا یہ کہنا ہے کہ اس معاملہ میں کوئی صحیح روایت نہیں آئی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے خود اس سے شادی کرلی یا یہ کہ انھوں نے کسی دوسرے شخص سے اس کی شادی کرادی۔'' یہ رائے جن لوگوں کی بھی ہو بالکل صحیح ہے۔ اس معاملہ میں کوئی بھی دعویٰ کرنا غلط اور بے بنیاد ہوگا۔

[2] تفسیر بغوی: ۴/ ۵۳۶، ۵۳۷

سے ہمارے مفسرین نے اس مسئلہ میں کوئی نتیجہ اخذ کیا ہے؟ اس کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ذیل میں انھوں نے تین رویے اختیار کیے ہیں۔

بعض مفسرین نے جن میں امام ابن جریر طبری، علامہ زمخشری، امام رازی، علامہ ابن کثیر، علاّمہ ابو السعود اور قاضی شوکانی جیسے ائمہ تفسیر شامل ہیں، اس ذیل میں یہ بحث ہی نہیں چھیڑی ہے کہ عورت سربراہِ مملکت ہوسکتی ہے یا نہیں؟ اگر اس آیت سے اتنا اہم اجتماعی و سیاسی مسئلہ مستنبط ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ وہ اسے نظر انداز کرتے اور اس کی طرف کوئی اشارہ کیے بغیر یوں گزر جاتے۔

علاّمہ بغوی اور خازن نے اس واقعہ کے ذکر کے بعد کہ قوم سبا پر ایک عورت حکومت کر رہی تھی، بخاری کی وہ روایت پیش کی ہے جو مضمون کے شروع میں گزر چکی ہے[1] یہی انداز علامہ خطیب شربینی[2] اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی[3] نے اختیار کیا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ حضرات اس حدیث کی روشنی میں عورت کی سربراہی کو غیر اسلامی طریقہ اور قوموں کی تباہی کا سبب سمجھتے ہیں۔

بعض مفسرین نے اس آیت کے ذیل میں صراحت کے ساتھ کہا ہے کہ عورت کی سربراہی اسلام کی رو سے جائز نہیں ہے۔ چناں چہ بخاری کی روایت کا حوالہ دیتے ہوئے علامہ ابن عربی مالکی کہتے ہیں:

ھٰذا نص فی ان المرأة لاَ تکون خلیفة ولاَ خلاف فیه.[4]	یہ نص ہے اس مسئلہ میں کہ عورت خلیفہ نہیں ہوسکتی۔ اس میں (امت کے درمیان) کوئی اختلاف نہیں ہے۔

علامہ قرطبی نے آیت کی تفسیر میں پہلے تو حدیث کا حوالہ دیا ہے، پھر اس

---

[1] بغوی، معالم التنزیل: ۴/۵۲۷۔ خازن: لباب التاویل: ۴/۵۲۷، یہ دونوں تفسیریں ایک ساتھ چھپی ہیں۔

[2] السراج المنیر: ۳/۵۴، مطبوعہ نول کشور، لکھنؤ

[3] تفسیر مظہری: ۷/۱۱۰، ندوۃ المصنّفین، دہلی

[4] احکام القرآن: ۲/۱۳۶

موضوع سے متعلق ابن عربی مالکی کی پوری بحث نقل کردی ہے[۱]

سورۂ نمل کی اسی آیت کی تفسیر میں علامہ آلوسی کہتے ہیں:

لیس فی الاٰیة ما یدل علی جواز ان تکون المرأة ملکة ولاَ حجة فی عمل قوم کفرة علی مثل هٰذا المطلب[۲]	آیت میں کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس سے عورت کے ملکہ ہونے کا جواز نکلتا ہو (اس لیے کہ) اس طرح کے معاملہ میں کسی کافر قوم کا عمل ہمارے لیے حجت نہیں ہے۔

عورت کی سربراہی کی تائید میں مولانا اشرف علی تھانویؒ کے ایک فتویٰ کا بھی حوالہ دیا جاتا ہے۔ اس کی تفصیل میری نظر سے نہیں گزری، البتہ مولانا مرحوم کی تفسیر بیان القرآن، میرے سامنے ہے۔ وہ ملکۂ سبا کے واقعہ کے ذیل میں فرماتے ہیں:

''ہماری شریعت میں عورت کو بادشاہ بنانے کی ممانعت ہے۔ پس بلقیس کے قصہ سے کوئی شبہ نہ کرے۔ اول تو یہ فعل مشرکین کا تھا، دوسرے اگر شریعت سلیمانیہ نے اس کی تقریر بھی کی ہو تو شرع محمدی میں اس کے خلاف ہوتے ہوئے حجت نہیں۔''[۳]

اس سے معلوم ہوا کہ ملکۂ سبا کے واقعہ سے قدیم علمائے تفسیر میں سے کسی نے یہ استدلال نہیں کیا ہے کہ عورت سربراہ مملکت ہوسکتی ہے، بلکہ اسے وہ حدیث کی روشنی میں قوموں کی تباہی کا سبب باور کرتے ہیں۔

۱۔ الجامع لاحکام القرآن: ۱۳ / ۱۳۹، ۱۴۰

۲۔ روح المعانی: ۱۰ / ۱۸۵

۳۔ بیان القرآن: ۲ / ۸۵



جنسی تعلقات

☆ جنسی تعلقات ۔ عہدِ قدیم سے دورِ جدید تک
☆ رہبانیت
☆ اباحت پسندی
☆ دورِ جدید

جنسی تعلقات
(عہد قدیم سے دورِ جدید تک)

جنسی تعلق کی نوعیت کیا ہو؟ یہ انسانی تاریخ کا قدیم ترین سوال ہے۔ اس سوال کا محرک جنسی خواہش ہی نہیں بلکہ اس کے پیچھے بقائے نسل کا جذبہ بھی کارفرما ہے، کیوں کہ اسی سے وہ اپنی نسل کو باقی رکھ سکتا ہے۔ اگر یہ تعلق منقطع ہوجائے تو نسلِ انسانی کا سلسلہ بھی رُک جائے گا۔ اسی لیے دورِ قدیم کا توہم پرست انسان جنسی جذبے کو ایسی غیبی قوت خیال کرتا تھا، جو اس کی موت وحیات پر قدرت رکھتی ہے۔ چناں چہ مصر، سوڈان، مغربی افریقہ، یورپ اور ایشیا کی بیشتر قوموں میں اس قوت کے مقابلے میں اپنی بے بسی و بے چارگی کا شدید احساس پایا جاتا تھا اور وہ اپنی نسل کو جنسی قوت کے غضب اور غصے سے بچانے کے لیے اس کی رضا جوئی اور خوشنودی کو ضروری سمجھتی تھی۔ اس مقصد کے لیے بعض قوموں نے ایسی مورتیاں بنا رکھی تھیں، جن سے صنفی تعلقات پوری طرح نمایاں تھے۔ بہت سے قبائل اور قوموں کے بتوں کی ہیئت ہی جنسی اعضاء جیسی ہوتی تھی کیوں کہ اعضاءِ جنسی کے متعلق یہ تصور تھا کہ وہ اس غیبی قوت کے مظہر ہیں جو انسانی نسل کو باقی رکھے ہوئے ہے، حتیٰ کہ اظہارِ عقیدت کے لیے ایسی چیزوں کو منتخب کیا جاتا تھا، جو ان اعضاء سے مشابہت رکھتی ہیں یا جن سے کسی نہ کسی طرح جنسی جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ ایسی قومیں بہت سی ملیں گی جن کے مراسم خوشی وغم میں جنسی عنصر شامل ہے۔ آج بھی ہندستان اور ہندستان سے باہر کتنے ہی ایسے غیر متمدن قبائل ہیں، جنسی جذبے کی پرستش جن کے مذہب کے ایک ضروری جز کی حیثیت اختیار کرچکی ہے۔

یہ سب کچھ انسان کی اس شدید خواہش کا نتیجہ تھا کہ اس کی اولاد باقی رہے، تاکہ زندگی کی سرگرمیوں میں اس کا ساتھ دے، دشمن کے مقابلے میں اس کی حفاظت کرے اور تلاشِ معیشت میں اس کا ہاتھ بٹائے۔ لیکن جب وہ اپنی اس خواہش کی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اس کے سامنے بہت سے مسائل کھڑے ہوجاتے ہیں، مثلاً کیا اپنی اولاد کو باقی رکھے یا صرف ان ہی کو جو اس کے لیے کارآمد اور مفید ہوں؟ ان کی پرورش اور ساخت و پرداخت کون کرے؟ آیا یہ صنفِ اناث کی ذمے داری ہے یا صنفِ ذکور کی یا دونوں ہی اس میں شریک ہیں؟ پھر ذرائع معیشت اور مال و اسباب کی تقسیم ان کے درمیان کیسی ہو؟ یہی مسائل پھیل کر خاندان اور قبیلہ اور قوم و ریاست کی شکل اختیار کرتے رہے ہیں اور ان ہی سے ان کی ہیئت بھی متعین ہوتی رہی ہے۔ قبائلی زندگی کبھی ماں کے گرد گھومتی تھی، باپ محنت مشقت کرکے معاش فراہم کرتا اور ماں پوری مالکانہ حیثیت میں اس کو اولاد اور دیگر افرادِ خاندان پر خرچ کرتی، حتیٰ کہ اولاد بھی ماں ہی کی طرف منسوب ہوتی۔ کہیں سلسلۂ پدری اور خاندان پر مرد کے پورے کنٹرول کا ثبوت ملتا ہے اور کہیں ماں، باپ مل جل کر مسائل کو حل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔

مسائل کے حل کی ان مختلف صورتوں کے ساتھ ساتھ جنسی تعلق کی نوعیتیں بھی بدلتی رہی ہیں۔ کہیں اس تعلق کی نوعیت بالکل وقتی رہی ہے اور کہیں اس کو مستقل اور پائے دار رشتہ سمجھا گیا ہے۔ کسی قوم کے نزدیک اس کے لیے بہت سے حدود و قیود کو قبول کرنا پڑتا تھا اور کسی کے ہاں محض طرفین کی خواہش اس کو جائز کردیتی تھی۔ کہیں ایک زوجگی کا رواج تھا اور کہیں ایک عورت سے خاندان کے سب ہی مردوں کو متمتع ہونے کا حق تھا۔ کہیں تعددِ ازدواج پر عمل تھا اور کہیں توحدِ ازدواج کا طریقہ رائج تھا۔ غرض، کوئی ایک ضابطہ نہیں تھا، جس پر تمام قومیں کاربند رہی ہوں۔

ان مختلف طریقوں کے بارے میں یہ خیال کرنا کسی طرح صحیح نہیں ہے کہ یہ وقت کے سماجی و معاشی تقاضوں کے تحت وجود میں آئے ہیں۔ ان میں سے بعض کو

انسان نے یقیناً اپنے مخصوص حالات کی بنا پر اختیار کیا ہے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ بعض طریقوں کا رواج محض جنسی آسودگی کے لیے ہوا ہے، کیوں کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ جنسی داعیات بہت شدید ہیں، جن پر قابو پانا انتہائی دشوار ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا صحیح نہ ہوگا کہ ان کی تسکین میں انسان نے سماج کے مفاد کی رعایت کی ہوگی، بلکہ جہاں تک ہمارے قریبی مشاہدے اور تاریخی حقائق کا تعلق ہے، ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جنسی خواہش سماجی تقاضوں پر غالب رہی ہے، جس کی وجہ سے سماج کو سخت نقصانات اٹھانے پڑے ہیں، ہزارہا زندگیاں تباہ ہوئی ہیں، انسان کے درمیان سے سکون اور چین رخصت ہوا ہے، امن و امان کے بجائے بدامنی اور خوف و ہراسانی پھیلی ہے، ناچاقی اور اختلافات اور قتل وخوں ریزی عام ہوئی ہے۔ یہ سب نتیجہ رہا ہے جنسی جذبات کے پیچھے دوڑنے کا۔

رہبانیت

ان حالات نے رہبانیت اور تجرد پسندی کو جنم دیا۔ امن و امان، روحانی ترقی اور انسانیت کی نجات اسی میں نظر آنے لگی کہ جنسی جذبات ہی کو دبا دیا جائے، کیوں کہ جب تک فتنہ و فساد کا یہ سرچشمہ بند نہ ہو روح ترقی نہ کرے گی اور دنیا کو سکون اور اطمینان حاصل نہ ہوگا۔ اس نقطۂ نظر کو مصر، یونان، ہندوستان، چین اور یورپ وغیرہ میں جب فروغ ہوا اور جہاں بھی یہ نقطۂ نظر پہنچا اس نے انسان کو جنسی خواہش سے پھیرنے کی کوشش کی، حتیٰ کہ جنس مقابل ہی سے شدید نفرت پیدا کردی اور اس سے دوری اور کنارہ کشی کو انسانیت کی روحانی معراج اور خیر وفلاح کا ذریعہ قرار دیا۔

مسیحیت جو حضرت مسیح علیہ السلام کے بعد تجرد پسندی اور رہبانیت میں تبدیل ہوگئی تھی اس کا اصل الاصول ہی یہ قرار پایا کہ جنسی تعلقات سے احتراز کیا جائے اور مسیحیت کے علم بردار اس سے اس طرح بچتے تھے، جیسے کوئی شخص گندگی سے گزرتے ہوئے اپنا دامن بچائے رکھے۔ اس طرح کے بعض واقعات یہاں پیش کیے جا رہے ہیں:

مشہور امامِ رہبانیت سیویلیس، جب نہایت ضعیف اور اپاہج ہوگیا تو اس کی انتہائی کبرسنی پر نظر کر کے اس کے تلامذہ و رفقاء نے چاہا کہ وہ جنگل چھوڑ کر کسی بستی میں سکونت اختیار کرے۔ وہ اس درخواست کو قبول کرنے پر راضی ہوگیا، لیکن شرط یہ پیش کی کہ وہ بستی ایسی ہو، جس میں کبھی کسی عورت سے دو بدو ہونے کا احتمال نہ ہو۔ ایسی بستی کا وجود ظاہر ہے کہ ناممکنات سے تھا۔ چناں چہ بالآخر وہ بدستور جنگل ہی میں مقیم رہا اور وہیں جان دے دی۔

سینٹ بیسل نے بجز کسی شدید مجبوری کے عورت کا چہرہ دیکھنا اپنے اوپر حرام کر رکھا تھا۔

سینٹ جان نے ۴۸ سال تک عورت کی صورت نہیں دیکھی۔ بالآخر اس کی بیوی نے مجبور ہوکر اس کے پاس کہلا بھیجا کہ اگر وہ اسے دیکھنے نہ آئے گا تو وہ اپنی جان دے دے گی۔ یہ سن کر اس نے جواب دیا کہ آج رات کو جس وقت تم اپنی خواب گاہ میں ہوگی، میں آؤں گا۔ اور اس وعدہ کا ایفا یوں ہوا کہ بیوی نے رات کو اسے خواب میں دیکھ لیا۔

ملکہ زفوبیہ کبھی اپنے شوہر کے ساتھ مباشرت پر راضی نہ ہوئی، بجز اس صورت کے جب ایسا کرنا ولی عہد سلطنت کو وجود میں لانے کے لیے ضروری ہوگیا۔

ہوپیشیا کی گو شادی ہوگئی تھی تاہم وہ عمر بھر باکرہ رہی، یعنی شوہر کو اس نے کبھی اپنے ساتھ صحبت نہ کرنے دی۔

جنس مقابل سے نفرت اور بیزاری اس قدر بڑھ گئی تھی کہ یہ راہبین ماؤں اور بہنوں تک سے بھاگنے لگے تھے، جن کی رفاقت کو دنیا نے ہمیشہ باعثِ عزت و افتخار سمجھا ہے، گویا ان کی قربت بھی ان کے لیے ایک عذاب تھی۔

ایک راہب صاحب سفر کر رہے تھے اور اپنی والدہ کو بھی اپنے ہمراہ لیے ہوئے تھے۔ راستہ میں ایک چشمہ پڑا، جس پر کوئی پل نہ تھا۔ حضرت نے جلدی جلدی اپنے ہاتھ اور سارے جسم کو کپڑے میں خوب کس کر لپیٹنا شروع کیا۔ ماں نے متحیر ہوکر سبب

پوچھا تو جواب دیا: تمھیں کندھے پر بٹھا کر اس کو پار کرنا ہے، ڈر ہے کہ اگر کہیں میرا جسم تمھارے جسم سے مس ہوگیا تو میرا سارا کیا کرایا ایک دم رائیگاں جائے گا۔

سینٹ جان آف کی ہمشیر کو اس سے بے حد اُنس تھا۔ جب سینٹ مذکور کو بادیہ نشینی اختیار کیے بہت زمانہ گزر گیا تو ہمشیر کے دل میں دیکھنے کا بہت اشتیاق ہوا۔ بلانے کے بہت سے خطوط لکھے مگر ادھر سے انکار ہی رہا۔ آخر مجبور ہوکر خود جنگل میں جاکر ملنے کا ارادہ کیا۔ سینٹ مذکور کو وحشت ہوئی اور خط میں لکھ کر بھیجا کہ میں خود ہی آتا ہوں۔ چناں چہ آپ آئے ضرور مگر اس قدر تبدیل ہیئت کے ساتھ کہ بہن نے پہچانا تک نہیں۔ اسی حالت سے واپس چلے گئے اور بدعہدی کے شکوے کے جواب میں لکھ بھیجا: ''میں آیا تو تھا، مگر مسیح کے فضل و کرم سے تم نے مجھے پہچانا نہیں، اب ہرگز میرے دیدار کا قصد نہ کرنا۔''

سینٹ پیمن کی بابت یہ روایت ہے کہ اس نے مع اپنے چھ بھائیوں کے دفعتاً ترکِ خاندان کر کے جنگل کی راہ لی۔ جس ضعیف ماں کی ساتوں اولادیں اسے اک بارگی چھوڑ دیں اس کے دل پر کیا گزر گئی ہوگی۔ غرض بے تاب ہوکر خود ہی جنگل میں آئی۔ یہاں وہ ایسے وقت پہنچی جب کہ یہ لوگ اپنے حجرے سے نکل کر گرجا جا رہے تھے۔ ماں کی صورت دیکھتے ہی سب دہشت زدہ ہوکر پلٹے۔ ماں نے فوراً تعاقب کیا، لیکن کبر سنی کے پاؤں جوانی کے پاؤں کی طاقت کا مقابلہ نہ کرسکے اور قبل اس کے کہ ماں دروازے پر پہنچے صاحب زادوں نے اندر سے حجرہ بند کرلیا۔ اب حالت یہ تھی کہ ضعیف و ناچار ماں اپنی جگر دوز چیخوں سے جنگل کو ہلائے دیتی تھی۔ اس حالت میں سینٹ پیمن نے دروازے کے قریب آکر اس آہ وشیون کا سبب پوچھا۔ ماں نے ہچکیاں لے لے کر تقریر شروع کی کہ یہ سارا صدمہ تمھارے نہ دیکھنے کا ہے، کیا تم مجھے نہیں جانتے کہ میں تمھاری ماں ہوں؟ کیا میں نے تمھاری رضاعت نہیں کی؟ تمھیں پال جلا کر اتنا بڑا نہیں کیا؟ کیا میرے ان احسانات کا یہی معاوضہ تھا؟ کیا میرے حقوق تم نے بھلا دیے؟ یہ

ساری تقریر بے اثر رہی۔ اہل زہد کی طرف سے زیادہ سے زیادہ یہ جواب ملا کہ تم اپنی موت کے بعد ہی ہمیں دیکھ سکوگی۔ یہاں تک کہ دکھیاری ماں کو اس سے تسلی پا کر نا کام واپس جانا پڑا۔

سینٹ سیموین کو ترکِ خانماں کیے جب ستائیس سال گزر چکے اور سینٹ موصوف کی ماں کو جنگل میں ان کی قیام گاہ کا پتا معلوم ہوا تو وہ ملاقات کے لیے خود جنگل میں آئی۔ لیکن اس کی تمام تقریریں، خوشامدیں، آہ و زاریاں سب بے کار گئیں اور سینٹ موصوف نے کسی طرح ملاقات کی حامی نہیں بھری۔ آخر جب دیکھا کہ ماں کی بے قراری حد سے گزرتی جاتی ہے تو یہ کہلا بھیجا کہ میں عنقریب ملنے آتا ہوں۔ تین شبانہ روز اس وعدے کے گزر گئے یہاں تک کہ اسی حجرے کے دروازے پر فرطِ یاس سے ماں نے دم توڑ دیا۔[1]

مسیحی مذہب کے ان چند واقعات سے دوسرے راہبانہ مذاہب کا بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔

ان مذاہب کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ یہ جنسی جذبات کی بے اعتدالیوں کا علاج نہیں تجویز کرتے، بلکہ ان کے خلاف بغاوت کی تعلیم دیتے ہیں۔ حالاں کہ انسان کے فطری جذبات کو دبایا اور کچلا نہیں جاسکتا، اگر ان کو دبایا جائے تو وہ غلط رُخ سے اُبھرنے لگتے ہیں۔ چناں چہ تاریخ گواہ ہے کہ جن لوگوں نے جنسی مطالبے کے سامنے مصنوعی بند باندھنے کی کوشش کی وہ غیر فطری وغیر قانونی طریقوں سے اس کی تکمیل پر مجبور ہوئے۔ لیکی اپنی کتاب 'تاریخ اخلاق یورپ' میں لکھتے ہیں:

> "پاپائے اعظم جان بست وسوم زنا کاری اور خود اپنی ماں بہن کے ساتھ زنا کاری کے مرتکب ہوئے ـــــ کنسٹر بری کے اسقف ۱۱۷۱ء میں صرف ایک موضع میں ۱۷ ناجائز بچوں کے والد نکلے! اسپین کے ایک اسقف ۱۱۳۰ء میں ۷۰ کنیزیں رکھے ہوئے تھے۔

---

[1] یہ واقعات تاریخ اخلاق یورپ حصہ دوم سے لیے گئے ہیں۔

ہنیری سوم سیشر کی پادری کی ۶۰ ناجائز اولادیں ۱۲۷۴ء میں نکلیں۔ ان سب کو مستثنیات سمجھ کر تھوڑی دیر کے لیے ان سے قطع نظر کر بھی لیجیے۔ تاہم اسے کیا کیجیے گا کہ اس زمانہ کے پادریوں کی عام بدچلنی وشہوت پرستی کے ثبوت میں مستند شواہد کے دفتر کے دفتر موجود ہیں۔ اچھوتیوں کی خانقاہیں اب خانقاہیں نہیں رہی تھیں، بلکہ حرام کاری کے اڈے اور ناجائز بچوں کے قبرستان تھے۔ حرام کاری وشہوت پرستی کے جوش میں محرمات و غیر محرمات کی تمیز اُٹھ گئی تھی۔ چناں چہ بار بار اس طرح کے قوانین کے نفاذ کی ضرورت پیش آتی رہی کہ پادری اپنی ماؤں اور بہنوں سے الگ رہیں۔ اغلام اور شاہد بازی کی گو مسیحیت نے بیخ کنی کی، لیکن خانقاہوں کی چار دیواری کے اندر اس کی سرپرستی قائم رہی۔ خود ناصحین کی یہ حالت تھی کہ وہی سب سے زیادہ آلودۂ معاصی رہتے تھے۔ بارہویں صدی میں پاپا صاحب کے ایک سفیر انگلستان میں وعظ کے لیے تشریف لائے۔ کلیسا کے اخلاقی انحطاط پر انھوں نے شد و مد سے وعظ کہا، لیکن ابھی اس کو چند گھنٹے بھی نہ گزرنے پائے تھے کہ لوگوں نے دیکھا کہ وہ اپنے خلوت کدے میں ایک طوائف کے ساتھ لطف ہم آغوشی حاصل کر رہے تھے۔ یہ سب کیا تھا؟ وہی ازدواج کو ممنوع قرار دینے کا وبال۔ ساری خرابیوں کی جڑ یہی تھی کہ شادی و نکاح کے پاک و فطری طریقے کے انسداد کی کوشش کی جاتی تھی۔ پانی کے بہاؤ کے قدرتی راستے کو روکیے گا تو وہ حوض کے اندر لامحالہ گندگی و تعفن پیدا کردے گا۔[1]

غیر فطری جدوجہد کے ذریعے ان سیاہ کاریوں سے آدمی اپنا دامن بچا بھی لے

---

[1] تاریخ اخلاق یورپ، جلد دوم

تو اس کا مزاج اور طبیعت اس جدوجہد کو قبول نہیں کرسکتا، کیوں کہ انسان کی ساخت اور سرشت ہی ایسی ہے کہ اس کے اندر جنسی داعیات شدت کے ساتھ اُبھرتے رہتے ہیں۔ ان داعیات کی تسکین ہی سے اس کو سکون اور چین ملتا ہے۔ اس کے بغیر اس کے جذبات و احساسات اور فکر و مزاج کا اعتدال پر رہنا انتہائی دشوار ہے، بلکہ بعض اوقات اس کا آدمی پر اتنا شدید ردعمل ہوتا ہے کہ اس کا سارا فکری و جسمانی نظام مختل ہوجاتا ہے۔

مارچ ۱۹۵۷ء کو دماغی امراض کے گیارہ ہزار مریضوں کے پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد دماغی امراض کے برطانوی ماہرین کا ایک گروپ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ''اگر سکونِ قلب چاہتے ہو اور بہت سی دماغی بیماریوں سے بچنا چاہتے ہو تو شادی کرلو۔''

اقوامِ متحدہ کے تحت دنیا کے نمائندہ ملکوں یعنی امریکہ، انگلستان، بلجیم، مصر، آسٹریلیا، بھارت، پاکستان وغیرہ نے تحقیق کی۔ مردم شماری کے رجسٹروں کی چھان بین کی اور پتا چلایا کہ اوسط عمر کس قسم کے لوگوں کی زیادہ ہے۔ اس تحقیق کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ کنواروں اور رنڈووں کے مقابلے میں شادی شدہ مردوں کی عمر کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ ان تمام ملکوں کی اگر اوسط عمر نکالی جائے تو شادی شدہ مردوں کی اوسط عمر ۵۷ برس نکلتی ہے، اس کے مقابلے میں غیر شادی شدہ مرد صرف ۳۹ برس کی اوسط تک زندہ رہتے ہیں اور سب سے زیادہ اوسط عمر شادی شدہ عورتوں کی ہوتی ہے۔

جنسی تعلق سے دوری کے نقصانات فرد کی ذات تک محدود نہیں رہتے، بلکہ اس کے پیچھے کام کرنے والی روح آدمی کے سماجی تعلقات کو بھی پارہ پارہ کردیتی ہے، کیوں کہ جب کوئی تعلق اس لیے ناجائز اور مبغوض قرار پائے کہ اسے انسانوں کی بدعملیوں نے ناپاک کر دیا ہے تو دنیا کا کون سا انفرادی و اجتماعی رشتہ ہے جو ہر طرح کی آلودگیوں سے محفوظ ہے۔ ماں اور بچے کے تعلق کو فطری تعلق سمجھا جاتا ہے، لیکن اس میں بھی ہزارہا خرابیاں پیدا ہوئی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں۔ کیا ان خرابیوں کی وجہ سے ماں کی گود سے بچے کو چھین لیا جائے؟

جنسی جذبے کو دبانے کا ایک نتیجہ تمدن کا زوال بھی ہے، کیوں کہ تمدن کی ترقی میں اس جذبے کو بہت بڑا دخل ہے۔ آدمی اپنے جذبات کی آسودگی محض سادہ طریقے سے نہیں چاہتا، بلکہ اس میں رنگینی اور کیف پیدا کرنا چاہتا ہے۔ بازاروں کی رونق، تفریح گاہوں کے دل فریب مناظر، عالی شان عمارتوں اور دیگر تمدنی مظاہر کے پیچھے آدمی کی یہ خواہش بھی کام کرتی ہے کہ اس کے گرد ایسا ماحول رہے، جس سے جنسی لذت میں اضافہ ہوسکے۔ اس جذبے کو مٹانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمدنی ترقی کے ایک مؤثر عامل کو ختم کر رہے ہیں۔

تجرد پسندی کی سب سے بڑی اور اہم خرابی یہ ہے کہ وہ نسل انسانی کی دشمن ہے۔ قدرت نے دو صنفوں کے درمیان کشش اس لیے رکھی ہے کہ اس سے ایک تیسرا وجود پیدا ہو جو ان کی قائم مقامی کرے۔ قدرت اس جذبے کے ذریعے یہ اعلان کر رہی ہے کہ یہاں حقِ زیست صرف ان ہی انسانوں کو نہیں ہے، جو اس وقت موجود ہیں اور نہ ان کے بعد بساطِ انسانیت تہ کی جانے والی ہے۔ اس کے لیے اس صنفی کشش کو نوعِ انسانی کے بقا کا ذریعہ ہونا چاہیے۔ لیکن ایک تجرد پسند قدرت کے اس اعلان کا جواب یہ دیتا ہے کہ خود میرا وجود زمین کے سینے پر بار ہے، تمھاری آواز پر لبیک کہوں تو میری روح ناپاک ہوگی اور میرا نفس آلودۂ معصیت ہوجائے گا۔ اگر یہ چمن اجڑتا ہے تو اجڑنے دو، میں اپنا دامن کانٹوں سے الجھا نہیں سکتا۔

اباحت پسندی

زمانۂ قدیم ہی سے رہبانیت کے ساتھ ساتھ اس کے بالکل برعکس ایک دوسرا نقطۂ نظر بھی کام کرتا رہا ہے اور وہ ہے اباحت پسندانہ نقطۂ نظر۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب جنسی داعیہ ایک فطری داعیہ ہے تو دوسرے داعیاتِ فطرت کی طرح اس کی تسکین کا سامان ہونا چاہیے۔ اس میں صحیح اور غلط، جائز اور ناجائز کی قید بے معنی ہے، کیوں کہ انسان کے فطری تقاضوں پر پابندی عائد کرنا اس کے ساتھ ظلم ہے، اس لیے انسان کو یہ

حق ملنا چاہیے کہ وہ جس طرح چاہے اپنی خواہش پوری کرے۔

رہبانیت شہوت پرستی اور اس کی تباہ کاریوں کے خلاف ایک فراری طرزِ عمل ہے تو اباحت پسندی انسان کے عزم و حوصلہ کی شکست اور اس کے جذبۂ شر کے مقابلے میں جذبۂ خیر سے مایوسی کا اعلان ہے۔ اس نظریے کو تسلیم کر لینے کے بعد ہر طرح کی عیاشی اور لذت کشی کے لیے وجہ جواز ہاتھ آجاتی ہے۔ اسی لیے اس کو مختلف ادوار میں انتہائی فروغ ہوا۔ ہر جگہ زنا کاری اور عیاشی کے اڈے قائم ہوئے۔ ہوس رانی عام ہوئی اور ناجائز تعلقات اور اس کے نتائج خوشی خوشی برداشت کیے گئے، یہاں تک کہ اس تصور نے سوسائٹی میں ایک مستقل عصمت فروش طبقے کو نہ صرف جائز بلکہ ضروری قرار دیا اور اس کی ہر طرح ہمت افزائی کی، تاکہ جنسی تسکین کی راہ میں رکاوٹ باقی نہ رہے اور آزادی کے ساتھ ہر وقت خواہشات کی تکمیل ہو سکے۔

سینٹ آگسٹائن اس طبقے کی ضرورت کو اس طرح ثابت کرتا ہے:

"کسبیوں کے پیشے کو نہ روکو، ورنہ شہوت رانیاں تمام سوسائٹی کو تہ و بالا کر دیں گی۔"

سسرو جیسا حکیم اور فلسفی اپنی تقریر میں کہتا ہے:

"اگر ہم میں سے کسی شخص کا یہ خیال ہے کہ نوجوانوں کو طوائفوں کی صحبت سے بالکل محترز رہنا چاہیے تو میں کہوں گا کہ اس کا یہ خیال بہت ہی سخت ہے۔ آج تک کس نے اس کی پابندی کی ہے اور آج کل کیا، قدماء میں کب کوئی اس خیال کا گزرا ہے؟ کب اور کس زمانے میں کسی نے اس کے جواز پر شبہ کیا ہے؟"

قطع نظر اس بحث سے کہ یہ نظریات انسان کی جنسی اخلاقیات پر کس حد تک اثر انداز ہوئے، اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ تاریخ کے بہت سے ادوار میں جنسی بے راہ روی عام رہی ہے۔

کتاب مقدس انجیل میں لکھا ہے کہ ایک دن یسوع مسیح علیہ السلام کے پاس فقیہ اور فریسی ایک عورت کو لائے جو زنا میں پکڑی گئی تھی اور اسے بیچ میں کھڑا کر کے یسوع سے کہا: اے استاذ! یہ عورت زنا میں عین فعل کے وقت پکڑی گئی ہے...پس تو اس عورت کی نسبت کیا کہتا ہے؟ ....(مسیح نے) ان سے کہا: جو تم میں بے گناہ ہو وہی پہلے اس کے پتھر مارے ... یہ سن کر بڑوں سے لے کر چھوٹوں تک ایک ایک کر کے نکل گئے اور یسوع اکیلا رہ گیا۔ (یوحنا، باب۸) کیوں کہ ان میں سے کسی کا دامن بھی اس گناہ سے پاک نہ تھا۔

جنسی آوارگی مختلف ناموں سے پائی جاتی رہی ہے، کبھی اس کو سماجی و تمدنی ضرورت کا نام دیا گیا، کبھی اس کو تقاضائے فطرت کہا گیا اور کبھی اس نے مذہبی رنگ اختیار کیا ہے، لیکن اس کے پیچھے زیادہ تر انسان کی خواہشِ نفس کام کرتی رہی ہے۔

اسلام کے آنے سے پہلے عرب کا حال حضرت عائشہؓ بیان کرتی ہیں جو بخاری اور ابوداؤد جیسی صحیح کتابوں میں موجود ہے کہ عرب میں جنسی تسکین کے چار طریقے تھے۔ پہلا طریقہ تو باقاعدہ نکاح کا تھا۔ جو شخص کسی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا، اس کے سرپرست کے پاس پیغام بھیجتا۔ اگر پیغام قبول کرلیا جاتا تو مہر ادا کر کے اس سے رشتہ قائم کرلیتا۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ کسی شریف اور مشہور آدمی کا نطفہ حاصل کرنے کے لیے مرد اپنی بیوی کو اس کے ہاں رات گزارنے کا حکم دیتا اور جب تک حمل ظاہر نہیں ہوتا وہ بیوی سے الگ رہتا۔ تیسرا طریقہ یہ تھا کہ دس سے کم اشخاص ایک عورت سے تعلق رکھتے اور اس تعلق کے نتیجے میں جو اولاد پیدا ہوتی عورت اس کو ان میں سے کسی ایک کے نام منسوب کردیتی اور وہ اسی کی سمجھی جاتی۔ چوتھا طریقہ یہ تھا کہ عرب میں باقاعدہ بیسوائیں تھیں جو اپنے دروازوں پر جھنڈے نصب کر رکھتی تھیں۔ ان سے فائدہ اٹھانے کی ہر شخص کو اجازت تھی۔ ایسی عورتوں کے جو بچے ہوتے وہ قیافہ شناس کی مدد سے ان سے تعلق رکھنے والے طبقہ میں سے کسی کی طرف منسوب کردیے جاتے اور اس کو لامحالہ قبول

کرنا پڑتا[1]

خود ہمارے ہندوستان میں جنسی تعلق کے ایک دو نہیں آٹھ طریقے رائج تھے اور کمال یہ کہ یہ سب جائز اور صحیح سمجھے جاتے تھے۔

بعض اوقات بانجھ عورتیں اولاد حاصل کرنے کے لیے ہفتوں پجاریوں کے ساتھ شب باشی کرتی تھیں اور یہ سوسائٹی میں بالکل معیوب نہیں تھا۔

سید شریف الدین سمھودی نے اپنی کتاب 'وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ' میں مدینہ کے ایک یہودی بادشاہ کا ذکر کیا ہے، جس نے یہ قانون نافذ کر رکھا تھا کہ جو بھی لڑکی بیاہی جائے رخصتی سے پہلے لازماً اس کے ساتھ ایک رات گزارے[2]

یہ ایک تفصیلی بحث ہے کہ قدیم ادوار میں جنسی آوارگی کہاں اور کن ادوار میں پائی جاتی تھی۔ یہاں صرف اس قدر عرض کرنا ہے کہ جنسی بے راہ روی اور اباحت پسندی کسی دور اور کسی علاقہ کے ساتھ مخصوص نہیں رہی بلکہ تقریباً ہر دور اور ہر علاقہ میں پائی گئی ہے۔

دورِ جدید

لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت ہے کہ اباحت کے تصور کو موجودہ دور سے پہلے کبھی قبولِ عام حاصل نہیں ہوا، کیوں کہ اب تک ہزار بداخلاقیوں کے باوجود، اخلاق و شرافت اور طہارت و تقویٰ ہی کو انسانیت کی معراج سمجھا جاتا تھا۔ یہ دورِ حاضر کا وصفِ امتیازی ہے کہ اس نے استدلال کی پوری قوت کے ساتھ دعویٰ کیا کہ انسان بھی دوسرے حیوانات کی طرح ایک حیوان ہے، جو اپنے اندر کچھ خواہشات اور داعیات رکھتا ہے۔ ان خواہشات کو پورا کرنے کے لیے ان کو چند لمحاتِ حیات حاصل ہیں، جن کے ختم ہونے پر وہ عدم کے پردے میں چلا جائے گا۔ اسے جو کچھ دادِ عیش دینی اور لطفِ زیست حاصل

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب من قال لا نکاح الا بولی۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق۔

[2] وفاء الوفاء باخبار دار المصطفیٰ۔

کرنا ہے، اس کے لیے یہی وقفہ حیات ہے۔ لہٰذا انسان کو یہاں اپنی خواہشات اور جذبات کا مرقد تیار کرنے کے بجائے ان کو تیزتر کرنا چاہیے، تاکہ اپنے گرد و پیش میں پھیلی ہوئی مرغ زار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے اور وہ دنیا سے اس حال میں نہ جائے کہ اس کی تمنائیں اور ولولے ماتم کناں رہ جائیں۔

'زنا' کو مذہبی تنگ نظری نے اس قدر گھناؤنا اور مکروہ بنا دیا ہے کہ اس کے ساتھ بدکاری، معصیت اور انتہائی متعفن کردار نگاہوں کے سامنے گھومنے لگتا ہے، ورنہ 'زنا' کے تجزیے کے بعد صرف اتنی سی بات سامنے آتی ہے کہ انسان نے اپنے ایک فطری مطالبہ کی تسکین میں ان حدود و قیود کی پابندی نہیں کی جو مصنوعی طور پر اس کے اطراف کھڑے کردیے گئے ہیں۔ ان حدود کی مخالفت کوئی جرم نہیں جس پر کسی کو غلط کار کہا جاسکے۔ جس طرح کسی حیوان کے متعلق یہ سوال نہیں پیدا ہوتا کہ وہ اپنی خواہشات کس طرح پوری کرتا ہے اسی طرح انسان کے متعلق بھی یہ سوال فضول ہے کہ اس نے اپنے جذبات کی آگ بجھانے میں کن حدود کی پابندی کی اور کن حدود کی پابندی نہیں کی۔ یہاں جو بات دیکھنے کی ہے وہ یہ کہ اس کے عمل سے کسی دوسرے انسان کا نقصان ہوا ہے یا نہیں؟ اگر اس کا کوئی عمل فرد یا سماج کے لیے ضرر کا باعث بن رہا ہے تو یقیناً اسے ممنوع ہونا چاہیے، ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ اس کو جائز نہ قرار دیا جائے۔

اس فلسفے نے تمام حیوانی صفات کو انسان کی فطرت اور اس کا خاصہ ثابت کر دکھایا۔ بندگیِ نفس اور خواہشات کی غلامی کے جواز میں دلائل فراہم کیے، تاکہ انسان کے اندر سے ضمیر نام کا وہ کانٹا نکل جائے جو معصیت کے ارتکاب پر خلش پیدا کرتا ہے اور شہوت پرستی کے لیے اس کا دل اس طرح کھل جائے جیسے وہ کارِ ثواب انجام دے رہا ہو۔ چناں چہ اب وہ پورے شرح صدر کے ساتھ تہذیب و تمدن کا ایسا نقشہ بنانے میں مصروف ہے، جس کے ایک ایک نشان سے عیاشی اور صنفی خواہش نمایاں ہے، تاکہ وہ دیکھے تو مناظرِ عیش دیکھے، اس کے کان آشنا ہوں تو نغماتِ کیف وطرب سے اور فکر و

دماغ کی قوتیں صرف ہوں تو تکمیلِ خواہشات کی راہ میں۔ عورت اور مرد کا آزادانہ اختلاط، فحش لٹریچر، اخلاق فروش تعلیم، عریاں تصاویر، گندے سینما، نشہ آور چیزوں کا استعمال، غرض شہوانیت کی آگ کو بھڑکانے والا وہ کون سا ذریعہ ہے، جسے موجودہ انسان نے اختیار نہ کیا ہو؟

ہفت روزہ 'ایشیا' لاہور کے نامہ نگار خصوصی مقیم لندن کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> "صبح سویرے آنکھ کھلنے پر وہ (طالب علم) کھڑکی کے پاس لگی ہوئی سلفچی میں منہ دھونے کے لیے جاتا ہے تو نیچے سڑک پر عورتیں گروہ در گروہ جاتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جب وہ ناشتہ کر کے کالج جانے کی تیاری کر رہا ہوتا ہے تو جھاڑ پونچھ کرنے والی خادمہ آ دھمکتی ہے، کسی مکان میں بوڑھی خادمہ ہوتی ہے، لیکن کسی میں بالکل نوجوان اور بدکردار .... دفتر جانے کا وقت ہے، ٹکٹ کے لیے قطاریں لگ رہی ہیں، وہ بھی ایک قطار میں کھڑا ہے۔ قطار میں اس کے سامنے یا اس کے پیچھے ضرور عورت ہے۔ یہاں غض بصر کا کیا سوال، اجسام کو جدا رکھنا بھی کارنامہ ہے ... لفٹ میں داخل ہوا۔ لفٹ اس طرح بھری جاتی ہے، جس طرح ہمارے ہاں بھیڑ کے وقت بسیں، بالکل ٹھساٹھس، یہاں اجسام علیحدہ رکھنے کا امکان ہی نہیں۔ یہاں سوال نگاہوں کا ہے، کیوں کہ اس حالت میں آدمی سامنے دیکھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ سامنے والی کے چہرے کو گھورے۔ لہٰذا وہ لفٹ کی چھت کی طرف دیکھتا ہے۔ وہاں تجارتی اشتہارات ہیں۔ ہر اشتہار میں عورت نمایاں ہے اور خطرناک حد تک نمایاں، کئی ایک بڑے بڑے اور بہت جاذب نظر اشتہارات ہیں۔ یہ عورتوں کے اندرونی

کپڑے بنانے والی دکانوں کے ہیں۔ کسی میں عورت کو صرف اس کے اندرونی کپڑوں میں دکھایا گیا ہے۔ کسی میں ان کپڑوں کو پہنتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ برہنگی بذاتِ خود فتنہ ہے، لیکن ان میں برہنگی کو عظیم تر فتنہ بنایا گیا ہے۔ لہٰذا وہ غریب جلدی سے اشتہارات سے نظریں ہٹا کر اپنے سامنے والی عورت ہی کو مجبوراً دیکھتا رہتا ہے ... یہاں گاڑی میں بھی لفٹ والا معاملہ ہے۔ نشستیں پر ہیں۔ ہجوم میں وہ بھی پھنسا کھڑا ہے، لیکن ہجوم میں زیادہ تر عورتیں ہیں اور وہ خود کسی عورت پر اپنا بوجھ ڈالے کھڑا ہے..... (کالج میں) ایک کرسی پر جا بیٹھا، تھوڑی دیر میں ہال بھر گیا۔ اس کے دونوں طرف نہیں تو کم از کم ایک طرف کوئی لڑکی آن کر بیٹھتی ہے، شانہ سے شانہ مل رہا ہے، کبھی ٹانگیں لڑ رہی ہیں۔ کبھی بازو ٹکرا رہے ہیں۔ کبھی ہاتھ مل رہے ہیں اور شانے رگڑ سے چھل رہے ہیں۔'' (۲۸/ مارچ ۱۹۵۷ء)

گزشتہ دنوں اٹلی کی ایک عدالت میں ایک عورت اس الزام میں پیش ہوئی کہ وہ صرف زیر جامہ پہن کر سڑکوں پر پھرتی ہے۔ عدالت نے اسے یہ کہہ کر بری کر دیا کہ ایک خوب صورت عورت کا برہنہ جسم کسی خرابی کا باعث نہیں۔

'نیویارک ٹائمز' کے ایڈیٹر جاپان کے دورے پر گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر انھوں نے اپنے دورے کے تاثرات شائع کیے ہیں۔ 'دنیا کا عریاں شہر ٹوکیو' کے عنوان کے تحت انھوں نے لکھا ہے:

''مجھے ایک جاپانی اخبار نویس کے گھر جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں جس حادثے سے دوچار ہوا اس سے مجھے خاصی پریشانی ہوئی۔ میں گھنٹی بجا کر دروازے پر کھڑا اندر سے آنے والے کا منتظر تھا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خاتون بھیگے ہوئے بالوں کے ساتھ بالکل مادر

زاد برہنہ آموجود ہوئیں۔ دریافت پر معلوم ہوا کہ وہ جرنلسٹ گھر پر نہیں ہیں اور یہ خاتون ان کی بیوی ہیں، جو بے جھجک نہاتے ہوئے اُٹھ کر انھیں یہ بتانے آئی تھیں۔''

اپنے اسی مضمون میں آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:

''رات میں ایک دعوت پر جانے کا اتفاق ہوا۔ عام طور پر جاپانی میزبان اپنے مہمان کو اعلیٰ قسم کے ہوٹلوں ہی میں مدعو کرتے ہیں۔ لیکن اس میزبان نے مجھے خلافِ معمول گھر پر مدعو کیا۔ کھانے سے فارغ ہوئے تو ناچ گانا شروع ہوا، جس کا اہتمام میزبان نے کر رکھا تھا۔ مہمانوں میں ایک صاحب شراب سے زیادہ بہک گئے۔ حاضرین میں سے اُٹھ کر اس لڑکی کے ساتھ رقص کرنا شروع کر دیا اور پھر جب ان صاحب نے اس لڑکی کے ایک ایک کر کے کپڑے اتار کر اسے برہنہ کر دیا تو ان صاحب کی اس حرکت پر میزبان اور مہمانوں کا مارے ہنسی کے برا حال تھا۔''

اب تو اس عریانی اور آزادانہ اختلاط کی وبا عبادت گاہوں تک میں گھس گئی ہے۔

جنوبی روڈیشیا کے ایک گاؤں کے متعلق خبر ہے کہ وہاں کے ایک گرجا گھر میں برادرانہ محبت کا مظاہرہ کرنے کے لیے ایک انوکھے طریقے سے کام لیا جا رہا ہے۔ وہ یہ کہ عبادت کے شروع ہونے سے پہلے تمام مرد عبادت گاہ میں موجود عورتوں سے بغل گیر ہوکر آپس میں پیار کرتے ہیں۔ تھوڑے دنوں میں نتیجہ یہ ہوا ہے کہ جس عبادت گاہ میں مردوں کی تعداد تین چار سے زیادہ نہ ہوتی تھی اب اس میں اس قدر اضافہ ہوگیا ہے کہ چرچ کے منتظمین کو عبادت گاہ کے ساتھ کئی ایک اور کمرے بنانے پڑے ہیں۔

اب موجودہ اخلاق سوز سینماؤں کا حال ایک پورے کمیشن کی زبانی سنئے جس کو حکومت امریکہ نے اپنے ملک میں جرائم کی روک تھام کے لیے مقرر کیا تھا۔ اس کمیشن

نے اپنی رپورٹ میں کہا ہے کہ جنسی جرائم، زنا بالجبر، رقابت میں قتل، امراضِ خبیثہ اور مار دھاڑ کا بہت بڑا سبب وہ فلمیں ہیں، جو 'ہالی وڈ' میں تیار کی جاتی ہیں۔ کمیشن نے مزید کہا ہے کہ اگر ان فلموں پر کڑا احتساب نہ کیا گیا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ سارا امریکہ غنڈوں، قاتلوں، زانیوں اور ڈاکوؤں کی بستی بن جائے گا۔ کمیشن نے کہا ہے کہ ان فلموں کی وجہ سے ڈاکو ہمارے نوجوانوں کے ہیرو بن رہے ہیں۔ نوجوان طبقے نے نہایت شوق سے ڈاکوؤں کے لباس کو پہننا شروع کر دیا ہے۔ اغوا اور زنا بالجبر اب مردانگی کا نشان سمجھا جاتا ہے۔ لڑکیاں اسکولوں اور کالجوں سے والدین کو اطلاع دیے بغیر بھاگ جاتی ہیں۔ کمیشن کو اس بات کا بے حد رنج ہے کہ امریکی کردار جو کبھی ساری دنیا کے لیے قابلِ تقلید تھا، آج پستی اور ابتذال کی انتہائی حد کو پہنچ چکا ہے۔

فحش نگاری تو اب یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ قانون کے ذریعے بھی اس کی اصلاح دشوار ہوتی جا رہی ہے۔

جولائی ۱۹۵۷ء کی خبر ہے کہ فلوریڈا (امریکہ) کی سپریم کورٹ نے فیصلہ دیا تھا کہ امریکی آئین فحش نگاری کی اجازت نہیں دیتا۔ اس فیصلہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے امریکہ کے ایک فحش نگار مصنف (فلاویلی) نے لکھا ہے کہ فحاشی پسند امریکہ میں قانون فحش نگاری کو نہیں روک سکتا۔ مصنف نے کہا ہے کہ امریکی قوم فحش مذاق کے منظر میں پروان چڑھی ہے، لہٰذا فحاشی پر پابندیاں مذاق بن کر رہ گئی ہیں۔ امریکی قوم سب سے زیادہ مسائل میں اُلجھی ہوئی ہے اور سب سے زیادہ جنسیات سے ڈرتی ہے اور اس سے لذت اندوز بھی ہوتی ہے۔ مصنف فلاویلی نے کہا ہے کہ مختصراً ہم ایک فحش قوم ہیں۔ یہ سمجھنا کہ سزا کے ذریعے فحاشی کو روک سکتے ہیں، جسے پڑھ کر پارساؤں کے جنسی جذبات بھڑک اٹھتے ہیں (انتہائی سادہ لوحی ہے)۔

منشیات کا استعمال اس قدر بڑھ گیا ہے کہ فرانس میں شراب نوشی کی تحقیقات کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی۔ اس کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق ۲۳ فی صد فرانسیسی مرد

اور۴۳ فیصد فرانسیسی عورتیں پانی استعمال کرتی ہیں۔ اس کے برعکس۸۲ فیصد مرد اور۶۰ فیصد عورتیں شراب استعمال کرتی ہیں۔ محض شراب استعمال کرنے والوں کے علاوہ کچھ مردوں اور عورتوں کی تعداد ایسی بھی ہے جو شراب اور پانی ملا کر پیتی ہے۔ ان میں ۹ فیصد عورتیں اور۴ فیصد مرد شامل ہیں۔ کمیٹی نے کہا ہے کہ گزشتہ دس سال میں کثرتِ مے نوشی سے مرنے والوں کی تعداد میں بارہ گنا اضافہ ہوگیا ہے۔

شراب کی پیداوار کا یہ حال ہے کہ امریکہ میں اسکاچ وسکی تیار کرنے والے مختلف کارخانوں میں مارچ کے آخر تک ۲۴ کروڑ تیس لاکھ گیلن وسکی کا ذخیرہ جمع ہو چکا تھا اور اس کی فروخت نے تمام سابقہ ریکارڈ مات کردیے تھے۔ موجودہ اسٹاک آئندہ دس سالوں کی کھپت کے لیے کافی ہے۔ اسکاچ وسکی کی پوری صنعت نے ۳۱/ مارچ ۱۹۵۹ء کو ختم ہونے والے سال میں ۲ کروڑ ۷۵ لاکھ اسّی ہزار گیلن وسکی فروخت کی۔ یہ ایک برس قبل کی فروخت سے ایک لاکھ ساٹھ ہزار گیلن زائد ہے۔ اس میں سے ۹ لاکھ پچاس ہزار گیلن شراب دیگر ملکوں کو برآمد کی گئی۔ دوسری عالمگیر جنگ کے بعد یہ پہلا موقع ہے کہ امریکہ میں وسکی کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہوگیا ہے۔

مغربی جرمنی کے ایک شراب خانہ کے مالک کے متعلق خبر ہے کہ وہ ہر سال اپنی سالگرہ کے موقع پر بیئر شراب کا ایک چشمہ جاری کرتا ہے، جس سے ۱۸ سال سے اوپر ہر ایک مرد اور عورت کو مفت شراب پینے کی اجازت ہوتی ہے۔ چناں چہ گزشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی اس نے شراب کا چشمہ پر کروایا۔ یہ چشمہ متواتر سات گھنٹوں تک چلتا رہا اور تقریباً ۲۵۰۰۰ ہزار اشخاص (مرد و زن) نے اس چشمے سے مفت شراب پی۔ بتایا گیا ہے کہ محکمۂ ڈاک وتار نے اس خاص موقعے کے لیے یادگاری ٹکٹ بھی جاری کیے، جن پر اس چشمے کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

یہ وہی شراب ہے، جس کے متعلق انسداد مے نوشی کے بین الاقوامی ادارے کے صدر ڈاکٹر رابرٹ پیرس نے کہا ہے کہ شہوانی جرائم ۵۰ سے ۷۵ فیصدی تک شراب نوشی

کا نتیجہ ہوتے ہیں۔

شراب پر صرف برطانیہ میں سالانہ ساڑھے ۱۳ ارب روپے خرچ ہوتے ہیں۔ اتنی بڑی رقم وہاں کے بہت سے تعمیری کاموں میں بھی صرف نہیں ہوتی۔ اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ عیاشی اور حیوانیت کی پرورش کے بے شمار ساز و سامان پر کتنی دولت ضائع جاتی ہوگی۔ اگر کوئی قوم اس کو ملکی ترقی اور خوش حالی میں لگائے تو ملک کو چین اور راحت کا گہوارہ بنا سکتی ہے۔

اس ہیجان خیز اور شہوت انگیز ماحول میں کسی کا اپنے جذبات پر قابو رکھنا انتہائی دشوار ہے۔ چناں چہ یہی ہو رہا ہے کہ اس تہذیب کا پالا ہوا انسان، حیوانوں کی طرح ان حدود و قیود کو توڑتا جا رہا ہے، جو شہوت پرستی کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔

پیرس کے متعلق چند سال قبل ڈسپرے نے لکھا تھا کہ پیرس میں نوے فی صد شادیاں ایسی ہوتی ہیں جن میں فریقین کے مابین قبل از نکاح تعلقات پیدا ہو چکتے ہیں۔

۱۹۵۵ء میں فرانس کے میڈیکل بورڈ نے اس سے بھی آگے بڑھ کر پورے فرانس کے بارے میں اعلان کیا کہ اس کی گود میں ایک بھی باعصمت عورت نہیں اور اہلِ فرانس کو اس بات پر فخر ہے۔

فرانس کو فخر کے لیے بس اتنی سی بات حاصل نہیں ہے کہ اس کی گود میں کوئی باعصمت عورت نہیں، بلکہ اس کے سرِ افتخار کو بلند رکھنے کے لیے ایک مستقل طبقہ موجود ہے، جس کا مقصد ہی فرانس کی عزت کو دو بالا کرنا اور اس کی امامت کو باقی رکھنا ہے۔

اس طبقے کا حال ایک سنیتا لیس سالہ جج مارسل سیکوٹ نے جو دس سال تک پولیس کے محکمۂ تفتیش کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں، اپنی ایک تازہ ترین کتاب 'عصمت فروشی' میں لکھا ہے:

"پیرس میں شام ہوتے ہی آٹھ ہزار عصمت فروش عورتیں اپنے ہوٹلوں یا مکانوں سے نکل کر اپنا کاروبار شروع کر دیتی ہیں اور دوپہر سے ہی دو ہزار عورتیں سڑکوں

پر امنڈ آتی ہیں۔ ہر رات ان دس ہزار عورتوں کو تقریباً پچاس ہزار گاہک ملتے ہیں۔ ہر سیاح انھیں بوٹن ڈی بولون کے پارکوں میں مونپرڑاس کی دھندلی روشنی میں اور مونٹمارنبٹر پیرس کے ویسٹ اینڈ کے اعلیٰ درجے کے ہوٹلوں میں پاتا ہے۔''

اب ذرا برطانیہ کا حال دیکھئے:

پولیس کمشنر سرجان نائٹ بوور نے ۱۹۵۶ء کے متعلق ایک رپورٹ میں کہا ہے کہ زنا بالجبر کے جتنے واقعات اس سال ہوئے اتنے جنگ کے بعد سے اب تک کسی سال میں نہیں ہوئے تھے۔ ۱۹۳۸ء میں اس سلسلے میں جتنے واقعات ہوئے تھے گزشتہ سال ان سے تگنے سے بھی ۳۵ واقعات زیادہ ہوئے۔

۴ر ستمبر ۱۹۵۷ء کو پندرہ ممبروں کی ایک کمیٹی نے، جس میں بیرسٹر، ڈاکٹر، پادری اور تین خواتین شامل تھیں اور جس کے صدر لیڈنگ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سرجان دولفنڈن تھے، تین سال کے بعد اپنی ضخیم رپورٹ برطانیہ کی اخلاقی حالت پر شائع کی۔ بیسوائی اس کمیٹی کے نزدیک ایک ناگزیر ضرورت ہے اور بیسوائیں صرف ایک طبعی مانگ یا طلب کو پورا کر رہی ہیں۔ اس کے نزدیک بیسوائی کے محرکات میں طمعِ زر بھی شامل ہے۔ لیکن بہرحال، لڑکیاں اور عورتیں اس پیشے میں اپنے پورے ارادے ہی سے داخل ہوتی ہیں۔

مردوں کے باہمی تعلقات کی کثرت کو دیکھ کر کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ بالغ مردوں کے درمیان لواطت اگر باہمی رضامندی سے ہو تو اب اسے کوئی جرم نہ قرار دیا جائے، اس لیے کہ شہریوں کی نجی زندگی میں قانون کو دخل دینے کی حاجت نہیں۔

اسی سال ۱۹۵۹ء میں برٹش میڈیکل ایسوسی ایشن کی طرف سے ایک رپورٹ شائع ہوئی ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ برطانیہ میں ہر تین عورتوں میں ایک عورت ایسی موجود ہے، جسے خود یہ اقرار ہے کہ شادی ہونے سے پہلے اس کے جنسی تعلقات رہ چکے ہیں۔ برطانیہ میں ہر بیس بچوں میں ایک بچہ ناجائز اولاد ہوتا ہے۔ ایسے بہت سے

واقعات درج کرنے کے بعد رپورٹ کا ایک مرتب ڈاکٹر چیسر یہ سوال اٹھاتا ہے کہ کیا اس زمانے میں عصمت دور ازکار اور فرسودہ شے بن چکی ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتا ہے: اس میں تو خیر مجھے شک ہے، مگر اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ ہم اسی منزل کی طرف جا رہے ہیں ـــ ویسے فطرت کو عصمت سے کوئی مطلب بھی نہیں ہے۔ اسے تو سلسلۂ تولید سے غرض ہے۔ سچی اور کھری عصمت تو ہمارے باطن سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمیں یہ اختیار حاصل ہے کہ ہم جو راستہ چاہیں اختیار کرلیں۔

جنسی لذت دنیا کی بہت سی لذتوں سے زیادہ پرکیف اور پرکشش ہوتی ہے۔ اس لذت سے انسان کو عفت و عصمت کا تصور ہی باز رکھ سکتا ہے۔ اس تصور کے فرسودہ قرار پانے کے بعد جنسی داعیات آدمی کے فکر و خیال اور سعی و جہد پر اس طرح چھا جاتے ہیں کہ اس کو جنسی تسکین کے علاوہ اور کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ اس کی ساری قوتیں اور صلاحیتیں اسی لذت کی تلاش میں صرف ہونے لگتی ہیں۔ چناں چہ خود اس شہوت پرست تہذیب کے علم برداروں کو اعتراف ہونے لگا ہے کہ اب ان کی توجہ زندگی کے حقیقی مسائل سے ہٹتی جا رہی ہے۔ لذت پسندی مزاج اور طبیعت کا جز بن گئی ہے اور ایسے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رہی جو دقت طلب اور توجہ کے چاہنے والے ہیں۔ جفاکشی، محنت و مشقت، صبر و استقلال جیسی اعلیٰ صفات، جن کے ذریعے انھوں نے عزت و سربلندی حاصل کی تھی، اب ایک ایک کرکے ان سے رخصت ہو رہی ہیں۔

ڈاکٹر الیکسس کارل (Alexisc Carrel) اپنی کتاب Man the Unknown میں رقم طراز ہے:

> ''مشینی ایجادات میں اضافہ کردینے سے حالات کو کچھ بھی بہتر نہیں بنایا جاسکتا۔ اسی طرح اس معاملے میں طبیعیات، فلکیات اور کیمیا کے اکتشافات کو بھی اتنی زیادہ اہمیت نہیں دی جاسکتی۔ آدمی کو اب توجہ خود اپنے اوپر اور اپنی ذہنی اور اخلاقی نااہلیت پر منعطف کرنی

چاہیے۔ اپنے تمدن میں لذت، تعیش، جمالیات، وسعت اور پیچیدگیاں بڑھاتے چلے جانے سے کیا حاصل، جب کہ اس تمدن کو اپنے حقیقی مفاد کے رُخ پر لے جانے میں خود ہماری اپنی کمزوریاں مانع ہو رہی ہیں۔ درحقیقت یہ کوئی مفید صورت نہیں ہے کہ ایک ایسے طریقِ زندگی کے بنانے پر دیدہ ریزی کی جائے جو اخلاقی زوال کا اور عظیم نسلوں کے صالح ترین عناصر کے خاتمے کا موجب ہو رہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ تیز رفتار کے بحری جہاز، زیادہ آرام دہ گاڑیاں، سستے ریڈیو اور بعید تر سحابیوں کا مشاہدہ کرنے کے لیے دوربینیں بناتے چلے جانے سے کہیں بہتر یہ ہوگا کہ ہم اپنے اوپر زیادہ توجہ صرف کریں۔ اخلاقی حِس کو جدید معاشرے نے مکمل طور پر نظرانداز کر دیا ہے۔ ہم نے اس کے مظاہر کو دفعتاً ہر طرف سے دبا دیا ہے۔ غیر ذمہ دارانہ پن سب کی رگوں میں خوب رچ بس گیا ہے۔ وہ لوگ جو بھلے اور برے میں تمیز کرتے ہیں، جو مشقت کرتے ہیں، جو دور اندیش ہیں وہ بے چارگی میں مبتلا رہتے ہیں اور اس طرح دیکھے جاتے ہیں، جیسے وہ حقیر ہوں۔ اگر کوئی عورت جو متعدد بچے رکھتی ہے، ذاتی مستقبل بنانے کے بجائے اپنے بچوں پر توجہ صرف کرتی ہے تو پست دماغ شمار ہوتی ہے۔ ہم جنسی اور زنا پورے زوروں پر ہے اور صنفی اخلاقیات بالکل بالائے طاق رکھ دیے گئے ہیں۔ نفسیاتی تجزیہ کار مردوں اور عورتوں کے ازدواجی روابط کے نگراں ہیں۔ غلط اور صحیح، حق اور ناحق کے درمیان کوئی امتیاز نہیں رہا۔ جرائم پیشہ لوگ عام آبادی کے درمیان آزادی سے پنپ رہے ہیں اور کوئی ان کی موجودگی پر اعتراض اٹھانے والا نہیں۔"

اس اخلاقی زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے علمِ طبیعیات کی ایک ماہر خاتون مسز ہڈسن کہتی ہیں:

"ہماری تہذیب کی دیواریں منہدم ہونے کو ہیں۔ اس کی بنیادوں میں ضعف آ گیا ہے اور اس کے شہتیر ہل رہے ہیں۔ نہ معلوم یہ ساری عمارت کب پیوند خاک ہوجائے؟ ہم گزشتہ کئی سال سے یہ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ نظم و ضبط کی پابندیاں اختیار کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہیں۔ اس کی بقا کی بس ایک ہی صورت باقی ہے کہ مردوں اور عورتوں کے آزادانہ میل جول پر پابندی عائد کی جائے، کیوں کہ اس تہذیب کے لوگوں کی تمام تر توجہات آزاد جنسی تعلقات، قحبہ گری اور عصمت فروشی، مختصر یہ کہ جنسی خواہشوں پر مرتکز ہوکر رہ گئی ہیں، اس لیے ان کی ساری تعمیری صلاحیتیں ضائع ہو رہی ہیں۔ اس معاملے میں اور بھی طرح طرح کی بے اعتدالیاں دیکھنے میں آتی ہیں، جیسے مردوں اور عورتوں کا خود اپنے ہی ہم جنسوں کی طرف مائل ہونا، انسانی صلاحیتوں کا یہ زیاں بڑا ہی تشویش ناک ہے ـــــ

جنسی تعلقات کی یہ نوعیت اور اس کے ان بدترین آثار و نتائج کو دیکھ کر ہمارے ذہنوں میں یہ سوال اُبھر آتا ہے کہ آیا یہ ہماری تہذیب کے ملیامیٹ ہونے کے شواہد ہیں یا اسباب۔ میری یہ رائے ہے کہ یہ آثار و شواہد بھی ہیں اور اسباب بھی۔"

پروفیسر پیٹریم ساروکن اپنی کتاب 'امریکی جنسی انقلاب' (مطبوعہ ۴؍جنوری ۱۹۵۷ء) میں فرماتے ہیں:

"امریکہ والے جنسی انارکی کی طرف دوڑے چلے جا رہے ہیں، جو زوال کی علامت ہے، جس طرح قدیم یونان و روما میں گزر چکا

ہے۔'' پروفیسر کے الفاظ ہیں کہ ''جنس کے سیلابِ عظیم نے ہمیں ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ ہماری تہذیب کے ہر شعبے میں، ہماری معاشرتی زندگی کے ہر ہر خانے میں وہ گھس آیا ہے۔'' موصوف یہ بھی کہتے ہیں کہ ''امریکہ کی سیاسی زندگی تک شہوانیت کی لہروں کی زد میں آ چکی ہے، اور جنسی رشوت اور جنسی استحصال بالجبر ایسے ہی عام ہو چکے ہیں جیسے مالی رشوتیں۔'' موصوف کے بقول ''جنسی بدنامی والی شخصیتیں اور ان کے پٹھو سفارتی عہدوں پر ہیں اور عیاش لوگ کہیں بلدی افسر ہیں، کہیں وزیر سلطنت اور کہیں سیاسی پارٹی کے لیڈر، ہمارے پبلک حکام میں بڑی کثرت سے آوارہ منش لوگ موجود ہیں۔ فطری اور غیر فطری دونوں قسم کی عیاشیوں میں مبتلا۔ طلاق کے روز افزوں اعداد، شہوانی جرائم میں اضافہ، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اور ادب و اشتہار ہر شعبے میں جنس کا زور شور امریکیوں کے حق میں تباہی کا پیش خیمہ ہے۔ اب ہمارا ماحول ایسا ہوگیا ہے جو برہنگی یا نیم برہنگی سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں تک کہ تجارتی اشتہاروں میں بھی شہوانیت کی آمیزش لازمی ہوگئی ہے اور ہمارے تمدن میں جنس ایسی رچ بس گئی ہے کہ امریکی زندگی کے ہر بُن مو سے ٹپکنے لگی ہے۔''

اب آپ ایک شہوت پرست انسان کی طبعی و نفسیاتی حالات کا جائزہ لیجیے اور دیکھئے کہ وہ کس طرح مہلک اور تباہ کن جراثیم کی اپنے اندر پرورش کرتا رہتا ہے۔

(۱) شہوت پرستی کا پہلا اثر تو انسان کی جسمانی توانائی اور قوت پر پڑتا ہے۔ قدرت نے انسان کو کچھ قوتیں عطا کی ہیں۔ یہ قوتیں لامحدود نہیں، بلکہ محدود ہیں۔ ان قوتوں کے مسرفانہ استعمال سے اس کی توانائیوں کا گھٹ جانا لازمی ہے۔

شہوانی قوت انسان کی توانائی کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اتنا بڑا ذریعہ کہ اس سے

بہت سے نئے وجود جنم پا سکتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اپنی اس قوت کو ضائع کرتا ہے تو اپنے اندر سے اتنی بڑی قوت نکال پھینکتا ہے جو اس جیسی کئی ایک زندگیوں کا باعث بن سکتی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غلط طریقہ پر شہوت رانی انسان کی طبعی قوتوں کو کس قدر تباہ کرتی ہے، چناں چہ اس کے نتیجے میں ہر طرح کا جسمانی اختلال آج تک یقینی سمجھا جاتا ہے۔

(۲) اس کا دوسرا نتیجہ نسلِ انسانی سے غفلت ہے۔ آدمی کا جو مطمحِ نظر ہوتا ہے اسی سے اس کو دلچسپی ہوتی ہے اور اسی کے لیے وہ اپنا وقت اور صلاحیت صرف بھی کرتا ہے۔ اگر وہ عیاش ہے تو اس کی زندگی کا مرکزی نقطہ بھی عیش و عشرت ہی ہوگا۔ اسی کے لیے اس کی تگ و دو اور جدوجہد ہوگی۔ اس کی گفتگو، اس کا فکر و عمل، اس کی صحبتیں، اس کی وضع قطع، اس کا لباس، اس کی معاشرت، غرض ہر چیز اسی مقصد کے اطراف گھومے گی اور عیش پرستی اس کے دل و دماغ پر اس قدر چھا جائے گی کہ ممکن نہیں کہ وہ بچے کی ساخت و پرداخت کے لیے اپنی عیاشی کو قربان کردے اور ایک لمبے عرصے تک ہر قسم کی زحمتیں اور تکلیفیں برداشت کرتا رہے۔ اس کی تو مسلسل یہی کوشش ہوگی کہ عیش و لذت میں مخل ہونے والی اس مخلوق سے کسی نہ کسی طرح نجات پا جائے۔

الگزس کیرل لکھتا ہے:

> ”بہترین ترقی یافتہ قوموں کے اندر افزائشِ نسل کی رفتار گر رہی ہے اور نئی نسل کے حاصل گھٹیا ہیں۔ عورتیں برضا و رغبت الکوہل اور تمباکو کے ذریعے اپنے آپ کو گھلا رہی ہیں۔ وہ اپنے بدن کو روایتی نزاکت سے آراستہ کرنے کے لیے اپنے آپ کو نہایت خطرناک غذائی پابندیوں کے حوالے کرتی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ بچے ہونے کے خلاف ہیں۔ یہ مفاسد نتیجہ ہیں ان کی تعلیم کا، تحریکِ نسواں کی ترقی کا اور کوتاہ نظر خود غرضی کا۔“

(۳) اس خود غرضی کی انتہا یہ ہے کہ ماں، جسے رأفت و محبت کا پیکر سمجھا جاتا تھا، ضبطِ ولادت کے نام پر اپنی اولاد کا گلا گھونٹ رہی ہے۔ اسقاط تو اب گویا کوئی عیب ہی نہیں رہا۔ اس قومی خدمت کے لیے ڈاکٹروں کی خدمات ہر وقت موجود ہیں۔ اس کے بعد اگر کوئی بدنصیب اولاد بچ جائے تو سڑکوں اور اسپتالوں میں اپنی گود خالی کر کے آگے بڑھ جانے میں عیاش ماں کوئی عار محسوس نہیں کرتی اور موجودہ عیش پرور تہذیب ہے کہ اس سنگ دلی کو جرم قرار دینے کے بجائے اس کو سوسائٹی کا فطری مسئلہ قرار دے کر مختلف طریقوں سے اسے حل کرنے میں مصروف ہے۔

> ”ایسوسی اٹیڈ پریس آف امریکہ کی رپورٹ کے مطابق ہر سال دو لاکھ سے زیادہ تعداد میں ناجائز بچے پیدا ہوتے ہیں۔ ناجائز پیدائش کی اس رفتار پر قابو پانے کے لیے بعض فرقوں اور اکثر حکام میں یہ تجویز ہے کہ مسلمہ راستوں سے بے راہ ہونے والی عورتوں کو مکمل طور پر بانجھ بنا دیا جائے۔ بعض حلقوں میں یہ تجویز زیرِ بحث ہے کہ ایک سے زیادہ ناجائز بچے پیدا کرنے والی ماؤں کی امداد کی رقم کم کر دی جائے۔
>
> یو، این، سی میں غیر شادی شدہ بچوں کی ماں کو ۹ بچوں کی پرورش کے لیے سرکاری فنڈ سے امداد دی جاتی ہے۔ دوسری طرف عمرانیات کے ماہر اس بات پر زور دے رہے ہیں کہ ان نوجوان عورتوں کی، جو شادی کے بغیر بچے پیدا کرتی ہیں، ذلت، گناہ، خوف و ہراس کو دور کرنے اور ان کی پریشانیوں کے مداوے کے لیے مؤثر اقدامات کیے جائیں، بچوں کی بیورو کی چیف مسز کیتھوائن بی مٹنگر کی رائے کے مطابق غیر شادی شدہ مائیں، جس بحران سے دو چار ہیں تعزیر میں اس کا کوئی حل نہیں ہے۔“

کہا یہ جاتا ہے کہ نسلِ انسانی سے غفلت کا سوال اس وقت تک ہے جب تک کہ اس کی نگہداشت اور تربیت کا کوئی انتظام نہ ہو۔ اگر حکومت اس میں کامیاب ہو جاتی ہے تو انسانیت کے ساتھ اس سے زیادہ بھلائی کا تصور نہیں کیا جاسکتا، کیوں کہ حکومت غیر معمولی ذرائع و وسائل کی مالک ہے۔ وہ بچے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کا جیسا انتظام کرسکتی ہے اس کا عشر عشیر بھی خوش حال سے خوش حال والدین کے لیے ممکن نہیں، کتنے ایسے افراد ہیں جو خود ہی نانِ شبینہ کے محتاج ہیں، وہ اپنی اولاد کی، خواہ وہ کتنی ہی ذہین و فطین اور قابل کیوں نہ ہو، کیا انتظام کرسکتے ہیں؟ حکومت یہ طاقت رکھتی ہے کہ ان کو مفلسی و ناداری کا شکار ہونے سے بچائے اور ان کی صلاحیتوں کو نشو و نما دے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انسانیت کے ساتھ خیر خواہی اور بھلائی نہیں، بلکہ وہ انتہائی ظلم و زیادتی ہے، جس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔ انسان کوئی پتھر نہیں کہ سنگ تراش اپنی صناعی کے زور سے اس کی کوئی حسین مورتی تیار کرے، بلکہ وہ جذبات و احساسات اور عقل و شعور کا مجموعہ ہے۔ کسی انسانی جان کی پرورش اور اس کے اخلاق کی تعمیر وہی شخص کرسکتا ہے جو اس کے جذبات کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہوجائے، جو اس کی خوشی اور غم میں اپنی خوشی اور غم کو تحلیل کردے۔ یہ جذبہ ان ہی افراد میں ہوتا ہے، جنھوں نے اس کو وجود دینے میں ہزارہا مصیبتیں سہی ہیں اور بچہ جن کے جسم و جان کا ایک جزء ہوتا ہے۔ لیکن جو شخص ان مراحل سے نہ گزرے اور جس کو سوائے اس کے کچھ احساس نہ ہو کہ گوشت پوست کا ایک لوتھڑا اس کے حوالے کر دیا گیا ہے، وہ یہ جذبات کہاں سے لائے گا؟ بچہ کو دایہ دودھ تو پلا سکتی ہے، لیکن اس کے بس میں نہیں کہ ان پاکیزہ جذبات کو بھی بچے کے حلق کے نیچے اتار دے، جن کا مخزن صرف ماں کا سینہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ حکومت اس کی سرپرستی کرسکتی ہے، لیکن اس کے پاس وہ دستِ شفقت نہیں ہے، جسے قدرت نے باپ کے علاوہ اور کسی کو نہیں عطا کیا ہے۔ ماں اپنے بچے کو صرف

دودھ ہی نہیں پلاتی، بلکہ ان جذبات کو بھی اُتارتی ہے، جن کی وجہ سے ایک ناتواں و بے کس جان زندہ رہتی اور نشو و نما پاتی ہے۔ اس کی لوریاں بچے کی نیند ہی کا سبب نہیں ہوتیں، بلکہ عداوت و نفرت اور کینہ و کدورت اس کے سینہ سے ختم کرنے کا ذریعہ بھی ہوتی ہیں۔ باپ کی خشمگیں نگاہ اولاد کو اطاعت و فرماں برداری کا جو درس دیتی ہے، قانون کے ہزارہا صفحات اس کا بدل نہیں ہوسکتے۔

(۴) قطع نظر اس سے کہ حکومت ماں باپ کا بدل ہوسکتی ہے، یا نہیں، آپ ان ماں باپ کے ذہن کا جائزہ لیجیے جو اپنا بوجھ معاشرے کے سر تھوپ کر الگ ہونا چاہتے ہیں، جو اپنی عیاشی کو اسی لیے باقی رکھے ہوئے ہیں کہ انھیں اس کا بھگتان بھگتنا نہ پڑے گا۔ کیا ان سے یہ توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے وقت، قوت اور صلاحیت کو قربان کریں گے؟ جو شخص معاشرے کی بے توجہی یا اور رعایت سے فائدہ اٹھانے میں شب و روز مصروف ہو، کیا وہ معاشرے کو مضبوط بنانے کے لیے بھی کوشش کرے گا؟

(۵) عیش پرست ذہن آدمی کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ جس صنفِ نازک سے حظِ نفس اٹھاتا ہے، جس کے جذبات سے آسودگی حاصل کرتا ہے، اس کی مشکلات اور دکھ درد میں شریک ہو۔ وہ جس کو اپنی ناپاک خواہشات کا آلۂ کار بناتا ہے اسی سے صرفِ نظر کرنے لگتا ہے۔ وہ بھونرے کی طرح جب تک پھول میں رَس ہے چوستا ہے اور جب خشک ہوجائے تو دوسرے کی تلاش میں نکل پڑتا ہے۔

چناں چہ اسی ذہنیت کا نتیجہ ہے کہ جنسی تعلقات میں کوئی استواری اور استحکام نہیں رہا۔ اس تعلق کے معنی ہمیشہ سے یہ سمجھے جاتے تھے کہ دو افراد نے باہمی الفت و محبت کا عہد باندھا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے غم گسار اور شریکِ رنج و راحت ہوں گے۔ ان کی زندگی وفاداری اور ہمدردی کی زندگی ہوگی۔ لیکن اب یہ تصور دھندلا پڑتا جارہا ہے اور جنسی تعلق وقتی آسودگی کا ذریعہ بن گیا ہے۔ جب مقصد صرف تسکینِ نفس ہی ٹھہرا تو کیوں کوئی کسی ایک ہی کے ذریعے کا پابند ہوجائے اور ہر طرح کی ناگواریوں اور

تلخیوں کے باوجود اس پر قانع رہے؟ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ:

"امریکہ میں زیادہ سگریٹ پینے والوں کو طلاق دے دی جاتی ہے۔ ایسے خاوند سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے بیوی عدالتِ طلاق کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے، جو شراب زیادہ پیتا ہے اور ایسی بیوی بھی خاوند سے طلاق حاصل کرلیتی ہے، جس کا خاوند روزانہ گھر لیٹ آتا ہے۔ ایک برطانوی بیوی نے عدالت سے شکایت کی ہے کہ اس کا خاوند اس کے چہرے پر سگریٹ کا دھواں پھینکتا ہے، میں کئی بار اسے منع کر چکی ہوں، مگر میرے پروٹسٹ کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔اس لیے مجھے الگ ہونے کی اجازت دی جائے اور اب لاس اینجلس میں طلاق کا نہایت دلچسپ واقعہ ظہور میں آیا ہے۔ ایک نوجوان خوب صورت درمیانہ قد عورت نے عدالت میں بیان دیا ہے کہ میرا شوہر قمیص اور جوتے نہیں پہنتا، لہٰذا میرا اس کے ساتھ گزارا نہیں ہوسکتا۔ امریکی عدالت کو بیوی کی اس دلیل میں بہت وزن نظر آیا اور اس نے شوہر سے طلاق دلا دی ہے۔لندن کی ایک عدالت میں اس سے بھی نرالا اور دلچسپ مقدمہ پیش ہوا۔ خاوند نے بیوی کے خلاف یہ درخواست دی کہ وہ میرا انتظار کیے بغیر شام کا کھانا کھالیتی ہے اور میں کئی بار بیوی سے اس کی اس عادت کے خلاف شکایت کرچکا ہوں، بلکہ ایک دو بار میں نے اسے دھمکی بھی دی ہے کہ اگر وہ شام کا کھانا میرے ساتھ نہیں کھائے گی تو میں اسے طلاق دے دوں گا، مگر میری دھمکیوں کا بھی اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لہٰذا مجھے اس سے علیحدہ ہونے کی اجازت دے دی جائے۔ خاوند کو بیوی کے اس سنگین جرم کی پاداش میں طلاق دینے کی اجازت دے دی گئی ہے۔"

ایک پاکستانی ایڈیٹر صاحب، جنھوں نے ۱۹۵۷ء میں امریکہ کی سیاحت کی تھی، تحریر فرماتے ہیں:

”ایک وکیل صاحب جو آج کل یہاں وکالت کرتے ہیں، سات دفعہ یکے بعد دیگرے اپنی ایک ہی بیوی کو طلاق دے کر دوبارہ اس سے شادی کر چکے ہیں اور لطف یہ کہ ان کی یہ بیوی بھی وکالت کرتی ہے۔ اب پھر اس کو طلاق دے دی ہے۔“

(۶) بات اب صرف تفریق اور علیحدگی تک محدود نہیں رہی، بلکہ ذوقِ تنوع نے اخلاق اور انسانیت کی تمام قدروں کو بالائے طاق رکھ دیا ہے اور انسانوں کو جانوروں کی صف سے بھی نیچے گرا دیا ہے۔

۲۴؍ سالہ مسز فرنسین پیری مارٹن کو اپنے شوہر کو اس بنا پر قتل کرنے کے جرم میں کہ وہ اس سے اُکتا گئی تھی، عمر قید کی سزا دی گئی۔ لاش کو تہ خانے کے اندر کوئلے کے ایک ڈھیر میں چھپا دینے کے بعد وہ کئی جوانوں کو گھر میں بلا لائی اور ان کے سامنے ننگے ناچ ناچی۔ یہ میاں بیوی پانچ سال شادی شدہ زندگی بسر کر چکے تھے اور ان کے تین بچے تھے۔ جج نے ملزمہ سے جب یہ سوال کیا کہ یہ تینوں بچے مقتول ہی سے تھے؟ تو اس نے تامل کے ساتھ جواب دیا: ”میرا یہی خیال ہے۔“ مسز مارٹن پر نابالغوں کو زنا کی ترغیب دینے کا بھی الزام لگایا گیا تھا۔ مقدمہ کے دوران اس نے اقبال کیا کہ شوہر جس وقت سو رہا تھا اس نے ایک بھاری کلہاڑی سے اس کا سر چکنا چور کر دیا۔ اس کا چھوٹا سا بچہ بھی اس کے شوہر کے بستر پر لیٹا سو رہا تھا۔ وہ لاش کو تہ خانے میں کھینچ لے گئی اور اس کو کوئلے کے ڈھیر میں چھپا دیا۔ بعد میں وہ یومِ عارضی صلح کے جشن میں ناچ دیکھنے گئی اور وہاں سے کئی نوجوانوں کو، جن میں ایک چودہ سال کا لڑکا شامل تھا، گھر بلا لائی۔ ان لوگوں کے سامنے وہ برہنہ ہو کر ناچی۔“

اس عیاش مجرمہ کا جب اپنے شوہر سے جی بھر گیا تو اس کی نگاہ میں شوہر کی پانچ سالہ رفاقت کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی اور اس کو انتہائی بے دردی کے ساتھ

قتل کر کے وہ اس طرح خوشی سے جھوم اٹھی جیسے کوئی کانٹا تھا، جس کو اس نے نکال پھینکا ہو۔

پیری مارٹن کو تو اپنی اکتاہٹ کے مظاہرے کا موقع ملا، لیکن امریکی فضائیہ کے ایک رکن رونالڈ ڈین کو اپنی محبوبہ سے بے رغبتی کے اعلان کے بعد زندہ رہنے کی بھی اجازت نصیب نہیں ہوئی۔

رونالڈ ڈین کی سولہ سالہ فلپنا سے ملاقات لوازن کے مقام پر ایک ناچ گھر میں ہوئی۔ ۲۱ مہینے تک دونوں محبت کی پینگیں لڑاتے رہے اور پھر انھوں نے شادی کر لی۔ اس کے بعد ڈین اپنی بیوی کو امریکہ لایا اور وہاں ان کے یہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ دو سال بعد ڈین انگلینڈ میں ایک امریکی اڈے میں بھیج دیا گیا۔ فلپنا اور ڈین کے درمیان تقریباً ایک برس تک خط و کتابت ہوتی رہی۔ مگر پھر ڈین نے خط لکھنے چھوڑ دیے، چار مہینے بعد وہ امریکہ آیا تو فلپنا کی مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی، مگر ڈین نے اسے بتایا کہ وہ اسے طلاق دینے آیا ہے۔ انگلینڈ میں ایک انگریز لڑکی سے اس کی دوستی ہوگئی ہے اور وہ حاملہ بھی ہو چکی ہے۔ فلپنا کی نگاہ میں زمین و آسمان گھومنے لگے۔ اس نے اس کی بڑی منت سماجت کی مگر ڈین کے سینے میں ایک ہی دل تھا، جس پر ایک وقت میں ایک ہی دل رُبا کا قبضہ ہو سکتا تھا۔ چناں چہ وہ طلاق کے فیصلے پر جما رہا۔ چھ دن تک اس کشمکش کے بعد ہمسایوں نے رائفل چلنے کی آواز سنی اور انھوں نے دیکھا تو ڈین خاک و خون میں غلطاں دم توڑ چکا تھا۔

(۷) اسی طرح ایک محبوب کے مختلف چاہنے والوں کے درمیان جذبۂ رقابت کا اُبھرنا بھی قدرتی ہے۔ جہاں ایک عورت دس مردوں کی منظورِ نظر اور ایک مرد دس عورتوں کا محبوب ہو تو لازماً کشمکش پیدا ہوگی اور ہر ایک اپنے محبوب کے دل پر قبضے کے لیے دوسرے کو پیچھے ہٹانے کی کوشش کرے گا۔

قوتوں کا ضیاع، نسلِ انسانی سے غفلت اور بے پروائی، صبر و ضبط کی کمی، جذباتیت کا غلبہ اور تسلط، ایثار و قربانی کے بجائے خود غرضی اور استحصال کا جذبہ،

اتحاد و الفت کا خاتمہ اور انتشار و اختلاف کا فروغ۔ یہ ہیں شہوت پرستی کے عمومی نتائج جن کا آج ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ کیا یہ نتائج فرد اور قوم کی تباہی کا پیش خیمہ نہیں ہیں؟ اگر ہیں تو ان قوموں کو تباہ ہو جانا چاہیے، جن کے اندر جنسی انارکی پوری طرح جڑ پکڑ چکی ہے اور شہوانیت کے بغیر جن کی تہذیب کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا، لیکن آج وہی قومیں فکر وفن، علم وتہذیب اور سیاست وتمدن میں رہنمائی کر رہی ہیں، جو شہوت پرست بھی ہیں۔ یہ ایک سوال ہے جو شہوت پرستی کے نتائج پر غور کرتے وقت ہمارے سامنے آتا ہے۔

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ آج جو قومیں دنیا پر حکم رانی کر رہی ہیں ان کو یہ مقام اس وقت حاصل ہوا جب کہ ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ ان کی جنسی خواہش پر چھایا ہوا تھا۔ لذت کشی کے بجائے تعمیر وترقی کا جذبہ غالب تھا اور خواہشات پر ان کو اتنا کنٹرول تھا کہ وہ اپنی قوتوں کو تعمیری کاموں میں صرف کر رہی تھیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ ہر طرح کے اخلاقی عیوب سے پاک تھیں، بلکہ کسی فرد یا قوم کو جو اوصاف کامیابی سے ہم کنار کرتے ہیں، وہ ان میں دوسری قوموں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے اور اب بھی زیادہ ہیں۔ چناں چہ انھوں نے اس تہذیب کی خاطر وقت، قوت، صلاحیت اور جان و مال کی اتنی بڑی بڑی قربانیاں دیں کہ ان کی ماتحت اقوام اس کا تصور بھی مشکل ہی سے کرسکتی ہیں۔ اگر کوئی محنتی اور جفاکش انسان کوئی عمارت تعمیر کر لیتا ہے تو اس میں کوئی حیرت کی بات نہیں۔ حیرت و استعجاب تو اس وقت ہوگا جب کہ کسی کاہل اور سست آدمی کے ذریعے یہ کام انجام پائے[1]

لیکن موجودہ تہذیب بڑی تیزی سے اپنا مقام کھو رہی ہے اور اس کے اندر تباہی کے جرثومے داخل ہو چکے ہیں جو اس کو موت کی طرف دھکیل رہے ہیں۔

---

[1] موجودہ دور کے انسان کا جنسی رویہ اور اس کے نتائج کی جو مثالیں دی گئی ہیں وہ پچاس ساٹھ برس قبل کی ہیں، جب کہ کتاب زیر ترتیب تھی۔ اب یہ فساد سماج میں وسیع پیمانہ پر سرایت کر چکا ہے۔ اسے پھیلانے میں فحش لٹریچر اور میڈیا پوری طرح سرگرم ہے اور سرمایہ دارانہ ذہن انسان کے جنسی جذبہ کو کاروبار کے فروغ کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اس کے نتائجِ بد کو کھلی آنکھوں سے دیکھا جاسکتا ہے۔

اسلام اور جنسی تعلقات

جنسی مسئلہ کو حل کرنے میں آج تک بڑے بڑے مفکرین ناکام رہے ہیں۔ اگر وہ اخلاق و سیرت کی طرف متوجہ ہوئے تو جذبۂ شہوت ہی کو اوّلین معصیت سمجھ بیٹھے اور اس جذبہ کو اہمیت دینے لگے تو اخلاق و سیرت کی دنیا تباہ کردی۔

صرف اسلام ایک ایسا فلسفہ پیش کرنے میں کامیاب ہے جو جنسی مسائل کو بھی پوری طرح حل کرتا ہے اور اخلاقی اقدار کو بھی مجروح نہیں ہونے دیتا۔ جذبات و خواہشات کی غلامی سے بھی بچاتا ہے اور ان کی تسکین کے جائز اور فطری طریقوں کی بھی نشان دہی کرتا ہے۔

جنسی مسئلہ سے متعلق اسلام کی تعلیمات کو ہم پانچ عنوانات کے تحت تقسیم کرسکتے ہیں:

(۱) خدا ترسی کے راہبانہ نقطۂ نظر کی تردید۔

(۲) جائز حدود میں جنسی تسکین کی تاکید۔

(۳) ناجائز تعلقات کی ممانعت

(۴) فرد کی تربیت ــــــ اور

(۵) معاشرہ کی اصلاح

آئندہ صفحات میں ان پہلوؤں کی وضاحت کی کوشش کی جائے گی۔

خدا ترسی کے راہبانہ نقطۂ نظر کی تردید

سینٹ پال اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

''پس میں یہ چاہتا ہوں کہ تم بے فکر رہو۔ بے بیاہا شخص خداوند کی فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح خداوند کو راضی کرے۔ مگر بیاہا ہوا شخص دنیا کی فکر میں رہتا ہے کہ کس طرح اپنی بیوی کو راضی کرے۔ بیاہی اور بے بیاہی عورت میں بھی فرق ہے۔ بے بیاہی خداوند کی فکر میں رہتی ہے، تاکہ اس کا جسم اور روح دونوں پاک ہوں، مگر بیاہی ہوئی عورت دنیا کی فکر میں رہتی ہے کہ کس طرح اپنے شوہر کو راضی کرے۔ یہ تمھارے فائدے کے لیے کہتا ہوں، نہ کہ تمھیں ہنسانے کے لیے، بلکہ اس لیے کہ جو زیبا ہے وہی عمل میں آئے اور تم خداوند کی خدمت میں بے وسوسہ مشغول رہو۔'' (کرنتھیوں کے نام پولس رسول کا خط)

لیکن اسلام خدا کو راضی کرنے کے لیے ازدواجی زندگی کے مسائل سے بے فکر ہونا ضروری نہیں سمجھتا، کیوں کہ ازدواجی تعلق لازماً خدا سے غافل کرنے والا ہوتا تو انسان اپنی ایک فطری خواہش کی تسکین کے لیے اس تعلق پر مجبور نہ ہوتا اور نہ تنہا اس تعلق کو انسانی نسل کی بقا کا ذریعہ بنایا جاتا، بلکہ بعض ایسے جائز طریقے بھی بتائے جاتے جن سے یہ مقاصد حاصل ہوسکیں، تاکہ اللہ کی رضا ڈھونڈنے والے ان پر عمل کرتے، کیوں کہ یہ اس کی حکمت کے منافی ہے کہ انسان کی فطرت جس عمل کے لیے تڑپ رہی ہے اس سے منع کرے اور اس کا کوئی بدل نہ تجویز کرے۔

کم از کم خدا کے وہ نیک بندے جو دنیا میں آئے ہی اس لیے تھے کہ خدا کی رضا جوئی کے طریقے بتائیں، کسی جائز طریقے سے پیدا ہوتے اور جب تک اس دنیا میں رہتے جنسی تعلقات اور ازدواجی الجھنوں سے دور رہتے۔ حالاں کہ واقعہ اس کے برعکس ہے۔ قرآن مجید نے اللہ کے رسولوں کی ازدواجی زندگی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

وَ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلاً مِّنْ قَبْلِکَ وَ جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّ ذُرِّيَّةً ؕ (الرعد:۳۸)

ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی عطا کی۔

رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''نکاح انبیاء علیہم السلام کی سنت رہی ہے۔'' [۱]

قرآن، رہبانیت کو تقرب الٰہی کا ذریعہ نہیں مانتا، بلکہ یہ اس کے نزدیک خدا کی رضا جوئی کا ایسا طریقہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ کی سند حاصل نہیں ہے، جس کو انسانوں نے بطور خود گھڑ لیا ہے:

وَ رَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ (الحدید:۲۷)

رہبانیت جس کو انھوں نے بطورِ خود ایجاد کرلیا ہے، حالاں کہ ہم نے ان پر رہبانیت نہیں بلکہ خدا کی رضا جوئی فرض کی تھی، لیکن انھوں نے اپنے ایجاد کردہ دین کی بھی رعایت نہیں کی جیسی کہ اس کی رعایت کرنی چاہیے۔

رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

لاَ صَرُوْرَةَ فِی الْاِسْلَامِ [۲]

ترکِ نکاح اسلام میں نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ کہتی ہیں کہ نبی ﷺ نے 'تَبَتُّلَ' سے منع فرمایا۔ [۳]

حضرت سمرہؓ کی روایت ہے:

---

[۱] ترمذی، ابواب النکاح۔

[۲] مسند احمد: ۱/۵۱۲، حدیث نمبر ۲۸۴۰۔ ابو داؤد، کتاب المناسک، باب لاصرورۃ فی الاسلام۔ مستدرک حاکم: ۲/۶۷،۶۸۔

[۳] نسائی، کتاب النکاح، باب النہی عن التبتل۔

اِنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَھٰی عَنِ التَّبَتُّلِ.[۱] نبی ﷺ نے شادی نہ کرنے اور دنیا سے کٹ جانے سے منع فرمایا۔

بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور دیگر کتب حدیث کی روایت ہے، حضرت سعدؓ فرماتے ہیں کہ آں حضور ﷺ نے عثمان بن مظعون کو 'تبتل' سے روک دیا۔ اگر آپؐ ان کو اجازت دیتے تو ہم لوگ (یعنی حضرت سعد کے ہم خیال) بھی اپنے آپ کو خصی کر لیتے۔[۲]

امام نووی نے اس حدیث کے ذیل میں لکھا ہے:

فَاِنَّ الْاِخْتِصَاءَ فِی الْآدَمِیِّ حَرَامٌ صَغِیْرًا کَانَ اَوْ کَبِیْرًا.[۳] آدمی کا خصی کر لینا حرام ہے، خواہ وہ بچہ ہو یا بڑا۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں:

کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ یَاْمُرُنَا بِالْبَاءَۃِ وَ یَنْھٰی عَنِ التَّبَتُّلِ نَھْیًا شَدِیْدًا[۴] رسول اللہؐ ہمیں نکاح کا حکم دیتے تھے اور ترکِ نکاح سے شدت سے منع فرماتے تھے۔

سعد بن ہشام کو تجرد کی زندگی گزارنے کا خیال ہوا تو انھوں نے حضرت عائشہؓ سے مشورہ کیا۔ حضرت عائشہؓ نے فرمایا کہ کیا تم نے اللہ تعالیٰ کا یہ قول نہیں سنا کہ ہم نے تم سے پہلے بہت سے رسول بھیجے اور ان کو بیویاں اور اولاد بھی عطا کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ رہبانیت خدا کے مقرب بندوں کا طریقہ نہیں ہے، لہٰذا تبتُّل کا ارادہ ترک کردو۔[۵]

حضرت ابن عباسؓ نے سعید بن جبیر سے دریافت کیا: کیا تمھاری شادی ہوچکی؟ سعید نے جواب دیا: نہیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا: شادی کرلو۔ تجرد خداترسی کی علامت نہیں ہے۔ کیوں کہ اس امت کے بہترین شخص نبی ﷺ کے پاس

---

۱ ترمذی، کتاب النکاح، باب ماجاء فی النھی عن التبتل۔ نسائی، کتاب النکاح۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح

۲ صحیح مسلم، کتاب النکاح، باب استحباب النکاح لمن تاقت الیہ نفسہ

۳ نووی، شرح مسلم: جلد۵، جزء۹، ص ۱۵۱

۴ مسند احمد: ۳/ ۶۳۳، حدیث نمبر ۱۲۲۰۲۔ سنن دارمی، کتاب النکاح، باب الحث علی التزویج۔

۵ نسائی، کتاب النکاح، باب النھی عن التبتل۔

سب سے زیادہ بیویاں تھیں[1]

بخاری، مسلم اور نسائی وغیرہ میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ تین آدمیوں نے ازواجِ مطہرات میں سے کسی سے حضورؐ کی عبادت کے متعلق سوال کیا۔ جب انھوں نے آپؐ کی عبادت کا حال بیان کیا تو ان حضرات کو آپ کی عبادت بہت ہی مختصر معلوم ہوئی۔ چناں چہ انھوں نے کہا کہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہوچکے ہیں، تھوڑی سی عبادت بھی آپ کے لیے کافی ہوسکتی ہے، لیکن ہم سراپا تقصیر ہیں، اس لیے ہمیں آپ سے کہیں زیادہ عبادت کرنی چاہیے۔ چناں چہ اسی تاثر کے تحت ایک نے کہا: میں آئندہ سے رات بھر نماز پڑھوں گا، سوؤں گا نہیں۔ دوسرے نے کہا۔ میں مسلسل روزے رکھوں گا اور کبھی چھوڑوں گا نہیں۔ تیسرے نے کہا: دنیا کا سارا جنجال شادی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے، اس لیے میں شادی ہی نہیں کروں گا اور اپنا سارا وقت عبادتِ الٰہی میں صرف کروں گا۔

نبی ﷺ کو ان کے اس فیصلہ کی اطلاع ملی تو آپؐ نے فرمایا:

اَمَا وَاللّٰہِ اِنِّیْ اَخْشَاکُمْ لِلّٰہِ وَ اَتْقَاکُمْ لَہٗ لٰکِنِّیْ اَصُوْمُ وَ اُفْطِرُ وَ اُصَلِّیْ وَ اَرْقُدُ وَ اَتَزَوَّجُ النِّسَآءَ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ۔[2]

خدا کی قسم! میں تم میں سب سے زیادہ خدا ترس اور سب سے زیادہ تقویٰ والا ہوں لیکن میں (نفل) روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑ بھی دیتا ہوں (رات کو) نماز پڑھتا بھی ہوں اور سو بھی رہتا ہوں اور عورتوں سے شادی بھی کرتا ہوں (یہ میرا طریقہ ہے) پس جو شخص میرے طریقے کو چھوڑ دے وہ مجھ سے نہیں ہے۔

حضرت عائشہؓ نے نبی ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ لَمْ یَعْمَلْ بِسُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّیْ[3]

نکاح میری سنت ہے پس جو شخص میری سنت پر عمل نہیں کرتا اس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں۔

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب کثرۃ النساء

[2] بخاری، کتاب النکاح، باب الترغیب فی النکاح

[3] ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب ماجاء فی فضل النکاح

مطلب یہ کہ اگر کوئی شخص خدا ترسی کے لیے ضروری سمجھتا ہے کہ نکاح نہ کیا جائے تو وہ خدا ترسی کے اس تصور سے بے خبر ہے، جس کو خدا کے رسول ﷺ نے پیش کیا ہے کیوں کہ آپ کو خدا کا خوف جس طرح راتوں میں سر بہ سجود رکھتا ہے اسی طرح خدا ہی کا خوف ہے جو آپ کو ازدواجی تعلقات رکھنے پر مجبور کرتا ہے۔

اس لیے جو شخص ان تعلقات کی استواری کی فکر کرتا ہے اور اس کے لیے مصروفِ جدوجہد رہتا ہے، وہ اسلام کی نگاہ میں اپنے تقویٰ اور خشیت کا ثبوت دیتا ہے اور اس کو خدا کے ہاں اس سعی و جہد کا اجر ملے گا:

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدِ الْاَنْصَارِیِّ عَنِ النَّبِیِّ ﷺ اِذَا اَنْفَقَ الْمُسْلِمُ نَفَقَةً عَلٰی اَهْلِهٖ وَ هُوَ یَحْتَسِبُهَا کَانَتْ لَهٗ صَدَقَةً[1]

ابو مسعود انصاریؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ جب ایک مسلمان خدا کے ہاں ثواب پانے کی نیت سے اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے صدقہ ہے۔

بیوی بچوں کے لیے کمانے اور خرچ کرنے کو عموماً دنیا داری کا کام سمجھا جاتا ہے۔ اسی غلط خیال کی تردید کے لیے آپؐ نے اس خرچ کو لفظ 'صدقہ' سے تعبیر فرمایا ہے۔ یعنی جس طرح ایک شخص خدا کی راہ میں انفاق کے ذریعے مستحق اجر ہوتا ہے اسی طرح اہل و عیال پر اپنی دولت صرف کرنے والا بھی اجر وثواب کا حق دار ہوگا۔

اسی مفہوم کو آپؐ نے اور وضاحت کے ساتھ دوسرے موقعے پر بیان کیا ہے:

وَ لَسْتَ تُنْفِقُ نَفَقَةً تَبْتَغِیْ بِهَا وَجْهَ اللّٰهِ اِلَّا اُجِرْتَ بِهَا حَتّٰی اللُّقْمَةَ تَجْعَلُهَا فِیْ فِیِ امْرَأَتِکَ[2]

تم اللہ کی خوش نودی کے لیے جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو اس کا تمھیں ضرور اجر دیا جائے گا یہاں تک کہ تمھیں اس لقمہ کا بھی اجر ملے گا جسے تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو۔

اس سے بھی آگے نبی ﷺ فرماتے ہیں:

---

[1] بخاری، کتاب النفقات، باب فضل النفقة علی الاہل۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقة والصدقة علی الاقربین

[2] بخاری، کتاب الوصایا۔ مسلم، کتاب الوصایا، باب الوصیة بالثلث واللفظ للآخر

دِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَ دِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ فِیْ رَقَبَةٍ وَ دِیْنَارٌ تَصَدَّقْتَ بِهٖ عَلٰی مِسْكِیْنٍ وَ دِیْنَارٌ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰی اَهْلِكَ اَعْظَمُهَا اَجْرًا الَّذِیْ اَنْفَقْتَهٗ عَلٰی اَهْلِكَ.[1]

جو دینار تم نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جو کسی غلام کو آزاد کرنے میں صرف کیا، جو کسی مسکین پر صدقہ وخیرات کیا اور جو اپنے بیوی بچوں پر خرچ کیا ان سب میں اس دینار کا اجر وثواب زیادہ ہے، جسے تم نے اپنی بیوی بچوں پر خرچ کیا۔

سعد بن ہشامؓ نے یہ سوچ کر کہ بال بچوں سے لگاؤ خدا سے تعلق کی راہ میں رکاوٹ ہے، اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور زمین فروخت کر کے پیسہ بھی جہاد میں لگانا چاہتے تھے کہ ان کے قبیلہ کے بعض لوگوں کو اس کا علم ہوگیا۔ انھوں نے حضرت سعدؓ کو بتایا کہ تمھارے ہم خیال چھ آدمیوں نے نبی ﷺ سے ملاقات کی تو آپؐ نے ان کو اس خیال سے منع کیا اور فرمایا:

اَلَيْسَ لَكُمْ فِیَّ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ.[2]

کیا تمھارے لیے میری زندگی اچھا اسوہ نہیں ہے۔

ازدواجی ذمے داریوں کے ادا کرنے میں رسولِ خدا ﷺ نے غفلت نہیں کی اور مدت العمر تمام حقوق ادا فرماتے رہے، یہ آپؐ کی سنت ہے۔ اس لیے جو شخص ان حقوق کو پامال کرتا ہے وہ آپؐ کے طریقہ کا متبع نہیں۔ اس کی زندگی اس راستہ سے ہٹی ہوئی ہے، جس پر محمد رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے نقوش مرتسم ہیں۔

عثمان بن مظعونؓ نے اہل و عیال سے دلچسپی چھوڑ دی تھی اور شب و روز عبادت میں مشغول رہنے لگے تھے۔ حضورؐ کو اس کا علم ہوا تو انھیں طلب فرمایا۔ جب وہ حاضر ہوئے تو فرمایا: عثمان! مجھے رہبانیت کا حکم نہیں دیا گیا ہے، بتاؤ کیا تم نے میرے اسوہ کو ترک کر دیا ہے؟ عثمان بن مظعون نے جواب دیا: نہیں یا رسول اللہ! میں تو آپ ہی کے اسوہ کا طالب ہوں، ارشاد ہوا: میرا طریقہ یہ ہے کہ میں (رات) کو نماز پڑھتا

---

[1] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب فضل النفقۃ علی العیال

[2] مسند احمد: ۷/۸۰، ۸۱، حدیث نمبر ۲۳۷۴۸

بھی ہوں اور سو بھی جاتا ہوں۔ کبھی روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا، نکاح اور طلاق پر بھی عمل کرتا ہوں۔ یہ میرا طریقہ ہے، جو شخص میرے طریقہ سے اعراض کرے اس کا مجھ سے تعلق نہیں ہے۔ عثمان! خدا سے ڈرو اس لیے کہ تم پر جس طرح اللہ کا حق ہے اسی طرح بال بچوں کا بھی حق ہے۔ مہمانوں کا اور خود تمھارے نفس کا بھی حق ہے۔ لہٰذا ان سب حقوق کو ادا کرنے کی کوشش کرو۔[1]

عبد اللہ بن عمرو بن العاصؓ کے متعلق بھی آپؐ کو اسی قسم کی اطلاع ملی تو ان سے بھی آپؐ نے یہی فرمایا کہ عبادت میں اس قدر منہمک نہ ہو جاؤ کہ بیوی، بچوں، مہمانوں اور خود اپنے نفس کے جو حقوق عائد ہوتے ہیں انھیں فراموش کر دو۔[2]

ایک مرتبہ حضرت سلمان فارسیؓ حضرت ابودرداءؓ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی بیوی زیب و زینت سے خالی ہیں اور پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس ہیں، پوچھا: خیر تو ہے؟ انھوں نے جواب دیا: آپ کے بھائی ابودرداءؓ کو دنیا سے کیا تعلق، ان کو عبادت ہی سے فرصت نہیں ملتی کہ ہمارا خیال کریں۔ اتنے میں حضرت ابودرداءؓ تشریف لے آئے اور حضرت سلمانؓ کے روبرو کھانا پیش کرتے ہوئے معذرت کی کہ میں روزے سے ہوں۔ اس لیے آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ حضرت سلمانؓ نے کہا: جب تک آپ نہیں کھائیں گے میں بھی نہیں کھاؤں گا۔ چناں چہ بالآخر حضرت ابودرداءؓ نے روزہ توڑ دیا اور کھانے میں شریک ہوگئے۔ جب رات ہوئی تو انھوں نے نماز کی تیاری شروع کر دی۔ حضرت سلمانؓ نے کہا: یہ آرام کا وقت ہے، آرام کیجیے۔ کچھ دیر بعد ابودرداءؓ نماز کے لیے پھر اُٹھ بیٹھے۔ حضرت سلمانؓ نے کہا: نہیں، ابھی نہیں۔ جب رات کا آخری حصہ ہوا تو خود ہی جگایا اور دونوں نے مل کر نماز پڑھی۔ اس کے بعد حضرت سلمانؓ نے حضرت ابودرداءؓ سے کہا: تم پر تمھارے رب کا بھی حق ہے اور بیوی بچوں اور نفس کا بھی حق

---

[1] مسند احمد: ۷/۳۸۱، ۳۸۲، حدیث نمبر ۲۵۷۷۶۔ سنن دارمی، کتاب النکاح، باب النہی عن التبتل

[2] رواہ البخاری فی ابواب مختلفہ من کتاب الصوم و فی باب حق الضیف، کتاب الآداب۔

ہے، لہٰذا ہر حق کو ادا کرنے کی کوشش کرو۔ (ایسا نہ ہو کہ ایک حق کو ادا کرنے کی فکر دوسرے حقوق سے غافل کردے)۔

نبی ﷺ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپؐ نے حضرت سلمانؓ کی تائید کی اور فرمایا: سلمانؓ نے سچ کہا[1]

یعنی خدا کے حقوق کو نظر انداز کرنے والا جس طرح مجرم اور گناہ گار ہے اسی طرح ازدواجی حقوق سے غفلت اور کوتاہی بھی ایک ایسا جرم ہے، جس پر خدا کے دربار میں بازپرس ہوگی۔

---

[1] بخاری، کتاب الصوم، باب من اقسم علی اخیہ لیفطر فی التطوع الخ، کتاب الآداب، باب صنع الطعام و التکلف للضیف۔



جائز حدود میں جنسی تسکین کی تاکید

تمام راہبانہ مذاہب نے تعلقاتِ زن و شو کو منافیِ تقویٰ بتایا، لیکن رسولِ اکرم ﷺ کا ارشاد ہے:

وَ فِیْ بُضْعِ اَحَدِکُمْ صَدَقَةٌ[1]   بیوی سے ہم بستری کرنا بھی صدقہ ہے۔

علاّمہ ابن الہمام حنفی نے تو قرآن و حدیث کے دلائل کی روشنی میں یہاں تک لکھا ہے:

اِنَّ الْاِشْتِغَالَ بِہٖ اَفْضَلُ عَنِ التَّخَلِّیْ عَنْہُ لِمَحْضِ الْعِبَادَةِ[2]   ازدواجی تعلق سے کنارہ کش ہوکر محض عبادت میں لگے رہنے سے افضل یہ ہے کہ آدمی اس تعلق میں مشغول ہو۔

راہبانہ نقطۂ نظر یہ ہے کہ عورت سے آدمی کو اس طرح دور رہنا چاہیے جس طرح وہ سانپ اور بچھو سے دور رہتا ہے کہ کہیں وہ ڈس نہ لے۔ لیکن یہ ایک غیر فطری طرزِ فکر ہے، اس لیے کہ ہر مرد فطرتاً عورت کی طرف مائل ہے۔ وہ عورت سے کنارہ کش اور دوری اسی وقت اختیار کرسکتا ہے جب کہ غیر فطری تدابیر سے اپنے اس فطری میلان کو ختم کر دے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کا رُخ جنسی جذبات کی آسودگی کے لیے اپنے

---

[1] مسلم، کتاب الزکوٰة، باب ان اسم الصدقة یقع علی کل نوع من المعروف

[2] فتح القدیر: ۱۷۵/۳

ہم جنس افراد کی طرف تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اس غیر فطری رجحان کی مذمت کرتے ہوئے اس کو بتایا کہ جنسی تسکین کا پاک اور فطری ذریعہ عورت ہے۔ اس لیے عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اسی کو اختیار کیا جائے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے پاس فرشتے آئے تو ان کی قوم نے انھیں خوب صورت لڑکے سمجھ کر ان کے ساتھ دست درازی کرنی چاہی۔ اس وقت انھوں نے فرمایا:

يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِىْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِىْ ضَيْفِىْ ؕ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ (ہود:۷۸)

اے میری قوم! یہ میری لڑکیاں ہیں۔ یہ تمھارے لیے زیادہ پاک ہیں، پس اللہ سے ڈرو اور میرے مہمانوں کے ساتھ غلط رویہ اختیار کر کے مجھے رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں ایک بھی سمجھ دار اور صالح انسان نہیں ہے۔

انسان عموماً جذبات کے مقابلہ میں شکست کھا جاتا ہے۔ بہت ہی کم لوگ ان پر کنٹرول کر سکتے ہیں۔ ورنہ بیشتر افراد تو جائز اور فطری طریقوں کی عدم موجودگی میں ناجائز اور غیر فطری تدابیر کو اپنانے لگتے ہیں۔ اسی سے بچانے کے لیے شریعت نے نکاح کا حکم دیا اور اس کی تاکید کی ہے، کیوں کہ نکاح جنسی تسکین کا جائز اور فطری طریقہ ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ قدرت اور استطاعت کے باوجود نکاح نہ کرنا اس امت کا طریقہ نہیں ہے:

مَنْ قَدَرَ عَلَى النِّكَاحِ فَلَمْ يَنْكِحْ فَلَيْسَ مِنَّا[1]

تم میں جو شخص نکاح کی مقدرت رکھے اور پھر نکاح نہ کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔

ابو الزوائد نامی ایک شخص تجرد کی زندگی گزار رہا تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس سے کہا کہ تمھارے شادی نہ کرنے کی وجہ یا تو رجولیت کا فقدان ہے یا تم معصیت میں مبتلا ہو۔ مشہور تابعی طاؤس نے حضرت عمرؓ کے اس قول کا حوالہ دیتے ہوئے ایک دوسرے ایسے ہی شخص سے، جو شادی نہیں کر رہا تھا، کہا: شادی کر لو، ورنہ میں تمھارے بارے میں

---

[1] سنن دارمی، کتاب النکاح، باب الحث علی التزویج

وہی کہوں گا جو حضرت عمرؓ نے ابو الزوائد کے متعلق کہا تھا[1]

شریعت کا یہاں تک حکم ہے کہ اگر آزاد عورت سے نکاح کرنے کی استطاعت نہ ہوتو آدمی کو اگر دین و ایمان والی باندی میسر ہوتو اس سے نکاح کرلے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ مِنْکُمْ طَوْلاً اَنْ یَّنْکِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ مِّنْ فَتَیَاتِکُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (النساء:۲۵)

تم میں سے جو شخص خاندان والی (آزاد) مسلمان عورت سے نکاح کی مقدرت نہ رکھتا ہوتو اسے تم میں کی مومن لونڈیوں سے شادی کرلینی چاہیے۔

اس میں شک نہیں، بعض اوقات انسان ایسے حالات میں گھر جاتا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کی ذمے داریاں اٹھانے کے قابل نہیں رہتا۔ ان حالات میں شریعت نے بکثرت روزے رکھنے کا حکم دیا ہے، تاکہ وہ یادِ الٰہی کی اس ڈھال سے جذبات کا مقابلہ کرسکے۔ علاوہ ازیں جسم میں جتنی زیادہ توانائی ہوگی اسی قدر جذبات بھی شدید ہوں گے۔ روزے سے جہاں جسم کمزور ہوتا ہے، وہاں جذبات بھی مضمحل ہوتے ہیں۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

یَا مَعْشَرَ الشَّبَابِ مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْکُمُ الْبَاءَۃَ فَلْیَتَزَوَّجْ فَاِنَّہٗ اَغَضُّ لِلْبَصَرِ وَ اَحْصَنُ لِلْفَرْجِ وَ مَنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَعَلَیْہِ بِالصَّوْمِ فَاِنَّہٗ لَہٗ وِجَاءٌ[2]

نوجوانو! تم میں سے جو شخص نکاح کی مقدرت رکھتا ہو اسے ضرور نکاح کرلینا چاہیے، کیوں کہ وہ آنکھوں کو نیچی رکھنے (یعنی بدنگاہی سے بچانے) والا اور شرم گاہ کو (غلط کاری سے) محفوظ رکھنے والا ہے، لیکن جو شخص اس کی استطاعت نہ رکھے اسے روزہ کا اہتمام کرنا چاہیے۔ کیوں کہ روزہ اس کے لیے (معصیت کے خلاف) ڈھال ہے۔

فقہاء حنفیہ و مالکیہ متفق ہیں کہ جس شخص کو روزے معصیت سے نہ روک سکیں،

---

[1] جصّاص، احکام القرآن: ۳/ ۱۴۔۴۱۴۔ ابن حزم، المحلّٰی: ۹/ ۴۴۰

[2] بخاری، کتاب النکاح، باب من لم یستطع الباءۃ فلیصم

اور وہ لونڈی رکھنے پر بھی قادر نہ ہو تو اس کے لیے نکاح کرنا فرض ہے، بشرطے کہ اس کو یقین ہو جائے کہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں وہ زنا کا ارتکاب کر بیٹھے گا۔ البتہ اس میں اختلاف ہے کہ فرضیت نکاح کے لیے کیا یہ بھی ضروری ہے کہ آدمی نان و نفقہ اور مہر کی ادائیگی پر بھی قادر ہو یا نہیں؟

احناف اور بعض فقہاء مالکیہ فرضیت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ انسان نان و نفقہ کی قدرت رکھتا ہو، ورنہ وہ اس کے لیے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پر مجبور ہوگا۔ اس طرح ایک معصیت سے بچنے کے لیے اسے دوسری معصیت کی راہ اختیار کرنی پڑے گی۔

لیکن اکثر مالکیہ کا یہ خیال ہے کہ نان و نفقہ کی فکر میں نکاح کو مؤخر کرنا صحیح نہیں ہے۔ جب زنا میں مبتلا ہونے کا یقین ہے تو اللہ پر توکل کرکے اس سے بچنے کی شرعی تدبیر پر عمل کرنا چاہیے۔ وہ یہاں تک کہتے ہیں کہ معصیت کا یقین کیا خوف ہو تب بھی نکاح فرض ہو جاتا ہے۔ حنفیہ کے نزدیک خوف کی صورت میں استطاعت کی شرط کے ساتھ واجب ہو جاتا ہے (فرض اور واجب میں قانوناً فرق ہے۔ عملاً کوئی فرق نہیں، دونوں لازمی ہیں)۔

حنابلہ کی رائے مالکیہ سے بھی زیادہ سخت ہے۔ وہ کہتے ہیں: عدم نکاح سے زنا کا یقین ہی نہیں گمان ہو تب بھی نکاح واجب ہو جاتا ہے۔ ایسی حالت میں انسان کو نکاح کر لینا چاہیے، خواہ وہ نان و نفقہ پر قدرت رکھتا ہو یا نہ رکھتا ہو اور نکاح کے بعد کسبِ حلال کی کوشش کرنی چاہیے[1]

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

وَ اِنِ احْتَاجَ الْاِنْسَانُ اِلَی النِّکَاحِ وَ خَشِیَ الْعَنَتَ بِتَرْکِہٖ قَدَّمَہٗ عَلَی الْحَجِّ الْوَاجِبِ وَ اِنْ لَمْ

اگر انسان نکاح کا حاجت مند ہو اور ترکِ نکاح سے زنا میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اسے نکاح کو فرض حج پر مقدم کرنا چاہیے۔ (ہاں) اگر زنا کا خوف نہ ہو تو وہ حج کو نکاح

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو الفقہ علی المذاہب الاربعہ: ۴/ ۴ تا ۷

يَخَفْ قَدَّمَ الْحَجّ وَ نَصَّ الْإِمَامُ اَحْمَدُ عَلَيْهِ فِيْ رِوَايَةِ صَالِحٍ وَ غَيْرِهٖ وَ اِنْ كَانَتِ الْعِبَادَاتُ فَرْضُ كِفَايَةٍ كَالْعِلْمِ وَالْجِهَادِ قُدِّمَتْ عَلَى النِّكَاحِ اِنْ لَّمْ يَخْشَ الْعَنَتَ.[1]

پر مقدم رکھے گا۔ اس بات پر صالح اور دوسرے لوگوں کی روایت کے مطابق امام احمد کی نص موجود ہے۔ اگر عبادات فرضِ کفایہ کی نوعیت کے ہوں، مثلاً تعلیم اور جہاد وغیرہ تو زنا کا خوف نہ ہونے کی صورت میں وہ نکاح پر مقدم رکھی جائیں گی۔ (بصورت دیگر نکاح مقدم ہوگا)۔

علّامہ ابن حزمؒ نے لکھا ہے:

فَرْضٌ عَلٰى كُلِّ قَادِرٍ عَلَى الْوَطْيِ اِنْ وَجَدَ مِنْ اَيْنَ يَتَزَوَّجُ اَوْ يَتَسَرّٰى اَنْ يَّفْعَلَ اَحَدَهُمَا وَ لَابُدَّ فَاِنْ عَجَزَ عَنْ ذٰلِكَ فَلْيُكْثِرْ مِنَ الصَّوْمِ[2]

جو شخص جماع پر قادر ہو اور اسے آزاد عورت یا لونڈی مل رہی ہو تو اس کے لیے دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اگر وہ اس سے عاجز ہو تو کثرت سے روزے رکھے۔

نکاح کی شرعی و قانونی اہمیت کو سمجھنے کے لیے فقہ حنفی کے مشہور شارح امام اکمل الدین البابرتی کا یہ قول کافی ہے:

وَ مَا اتَّفَقَ فِيْ حُكْمٍ مِنْ اَحْكَامِ الشَّرْعِ مِثْلِ مَا اتَّفَقَ فِي النِّكَاحِ مِنْ اِجْتِمَاعِ دَوَاعِي الشَّرْعِ وَ الْعَقْلِ وَالطَّبْعِ.[3]

جس طرح نکاح کے پیچھے شریعت، عقل اور فطرت کے محرکات کام کر رہے ہیں اس طرح احکام شرع میں کسی بھی حکم کی پشت پر اتنے سب محرکات نہیں پائے جاتے۔

ان تفصیلات سے واضح ہے کہ جنسی جذبہ کو شریعت ایک فطری جذبہ قرار دیتی ہے۔ اس کے نزدیک جائز حدود میں اس کی تسکین ضرور ہونی چاہیے۔ اس سے باعفت زندگی گزارنے کی راہ آسان ہوتی ہے اور آدمی زنا اور بدکاری سے محفوظ رہ سکتا ہے۔

---

[1] اختیارات شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ، صفحہ ۱۱۹
[2] ابن حزم، المحلّٰی: ۹/۴۴۰
[3] العنایۃ علی الہدایۃ المطبوع علی حاشیہ فتح القدیر: ۲/۳۳۹

ناجائز تعلقات کی ممانعت

جنسی تسکین کی بعض صورتیں اسلام نے جائز کی ہیں۔ ان صورتوں پر عمل کی وہ انتہائی تاکید کرتا ہے۔ ان کے علاوہ شہوت برآری کے جتنے طریقے ہوسکتے ہیں، وہ سب اس کے نزدیک حرام اور ممنوع ہیں اور ان سے قریب ہونے کی بھی وہ اجازت نہیں دیتا۔

زنا حرام ہے

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَلاَ تَقْرَبُوا الزِّنٰیٓ اِنَّهٗ کَانَ فَاحِشَةً ط وَ سَآءَ سَبِیْلاًo (بنی اسرائیل:۳۲)

تم زنا کے قریب تک نہ جاؤ اس لیے کہ وہ بے حیائی کا کام اور بری راہ ہے۔

اہلِ ایمان کا وصفِ امتیازی یہ ہے:

وَ الَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ کَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَ الْفَوَاحِشَ. (الشوریٰ:۳۷)

وہ بڑے گناہوں اور بے حیائی کے کاموں سے پرہیز کرتے ہیں۔

زنا تو بڑا گناہ کیا معنی، بہت بڑا گناہ ہے۔ اس لیے ان کا دامن اس معصیت کے داغ دھبوں سے پاک ہوتا ہے۔

وَالَّذِیْنَ لاَ یَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلاَ یَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلاَ یَزْنُوْنَ ج وَ مَنْ یَّفْعَلْ ذٰلِکَ یَلْقَ اَثَامًاo

(الفرقان:۶۸)

(رحمٰن کے بندے) اللہ کے ساتھ کسی دوسرے الٰہ کو شریک نہیں کرتے اور نہ کسی ایسی جان کو قتل کرتے ہیں، جس کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے۔ الّا یہ کہ حق کا تقاضا ہو اور نہ وہ زنا کرتے ہیں۔ جو شخص اس طرح کے گناہ کرے گا وہ اپنے کیے کا بدلہ پائے گا۔

قرآن نے کامیاب مومنوں کی ایک صفت یہ بیان کی ہے:

وَالَّذِیْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ○ اِلَّا عَلٰٓی اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَیْرُ مَلُوْمِیْنَ○ فَمَنِ ابْتَغٰی وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ○

(المومنون:۵-۷)

کہ وہ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے کہ (ان سے جنسی آسودگی حاصل کرنے میں) وہ ملامت زدہ نہیں قرار پائیں گے (کیوں کہ یہ دونوں صورتیں جائز ہیں۔ ہاں) ان کے علاوہ (کوئی تیسری) صورت، جو لوگ تلاش کریں وہ (واقعتاً) زیادتی کرنے والے ہیں۔

قاضی ابن رشدؒ نے لکھا ہے:

اَبَاحَهُ فِی الشَّرْعِ عَلٰی وَجْهَیْنِ اَحَدُهُمَا عَقْدُ النِّكَاحِ وَالثَّانِیْ مِلْكُ الْیَمِیْنِ فَلَا یَحِلُّ اِسْتِبَاحَةُ الْفَرْجِ بِمَا عَدَا هٰذَیْنِ الْوَجْهَیْنِ.[1]

شریعت نے دو طریقوں سے جنسی تسکین جائز قرار دی ہے۔ ایک یہ کہ نکاح کیا جائے، دوسرے یہ کہ لونڈی رکھی جائے۔ ان دو طریقوں کے علاوہ کسی بھی ذریعہ سے شرم گاہ کو حلال نہیں کیا جاسکتا۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

فَاِنَّ الْاِبْضَاعَ فِی الْاَصْلِ عَلَی التَّحْرِیْمِ فَیُقْتَصَرُ فِیْ اِبَاحَتِهَا عَلٰی مَا وَرَدَ بِهِ الشَّرْعُ وَ مَا عَدَاهُ فَعَلٰی اَصْلِ التَّحْرِیْمِ.[2]

کسی سے جنسی تعلق قائم کرنا اصلاً حرام ہے۔ لہٰذا اس کا جواز ان ہی حدود میں محدود رہے گا، جو شریعت میں بیان ہوئی ہیں۔ ان حدود سے باہر اپنی اصل کے اعتبار سے وہ حرام ہی ہوگا۔

---

۱ مقدمات ابن رشد المطبوع مع المدونۃ الکبریٰ۔ جلد ۲، صفحہ ۲۱، ۲۲۔ عقد نکاح کی اجازت ضروری شرائط کے ساتھ تا قیامت ہر دور کے لیے ہے۔ 'ملک یمین' کا تعلق جنگی حالات سے ہے۔ موجودہ دور میں اس کا امکان کم ہی ہے۔ لہٰذا عقد نکاح ہی عملاً ایک جائز صورت رہ جاتی ہے۔

۲ ابن قیم، زاد المعاد: ۵ / ۱۱۴

'الفقہ علی المذاہب الاربعۃ' کا مصنف لکھتا ہے:

فَقَوَاعِدُ الْمَذَاهِبِ تَجْعَلُ الرَّجُلَ مَقْصُوْرًا عَلٰى مَنْ يَّحِلُّ لَهٗ كَمَا تَجْعَلُ الْمَرْأَةَ مَقْصُوْرَةً عَلَيْهِ.[1]

فقہی مسالک کے اصول مرد کو پابند بناتے ہیں کہ وہ ان ہی عورتوں سے جنسی تعلق رکھے، جو اس کے لیے حلال ہیں۔ اسی طرح یہ اصول عورت کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ صرف اپنے خاوند پر اکتفا کرے۔

حرمتِ زنا کے اسباب

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ جنسی تعلقات کو بعض حدود و قیود کا پابند بنانے میں کیا حکمتیں ہیں اور ان کو آزاد رکھنے میں کون سی خرابیاں ہیں، جن کی بنا پر شریعت پہلی صورت کو جائز اور دوسری صورت کو ممنوع قرار دیتی ہے؟

قرآن مجید نے اس سوال کا تفصیل سے جواب دیا ہے۔ سورۂ نساء میں حکم نکاح اور حرمتِ زنا کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَ يَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَ يَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ۝ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ وَ يُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوَاتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلاً عَظِيْمًا۝ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا۝

(النساء: ۲۶-۲۸)

اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں کھول کھول کر بیان کرے اور تمھیں ان لوگوں کے طریقوں کی طرف راہ نمائی کرے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم پر مہربانی کے ساتھ متوجہ ہو، لیکن جو لوگ خواہشات کی پیروی کرتے ہیں ان کی خواہش یہ ہے کہ تم راہِ راست سے بہت دور ہٹ جاؤ اور اللہ تم پر سے بوجھ بھی ہلکا کرنا چاہتا ہے (کیوں کہ) انسان کم زور پیدا کیا گیا ہے۔

سورۂ نور میں حرمتِ زنا اور معاشرتی احکام کی تفصیل کے بعد ارشاد ہوا:

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعۃ: ۴/ ۴

وَ لَقَدۡ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکُمۡ اٰیٰتٍ مُّبَیِّنٰتٍ وَّ مَثَلًا مِّنَ الَّذِیۡنَ خَلَوۡا مِنۡ قَبۡلِکُمۡ وَ مَوۡعِظَةً لِّلۡمُتَّقِیۡنَ۝ اَللّٰهُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ مَثَلُ نُوۡرِهٖ کَمِشۡکٰوةٍ فِیۡهَا مِصۡبَاحٌ اَلۡمِصۡبَاحُ فِیۡ زُجَاجَةٍ اَلزُّجَاجَةُ کَاَنَّهَا کَوۡکَبٌ دُرِّیٌّ یُّوۡقَدُ مِنۡ شَجَرَةٍ مُّبٰرَکَةٍ زَیۡتُوۡنَةٍ لَّا شَرۡقِیَّةٍ وَّلَا غَرۡبِیَّةٍ یَّکَادُ زَیۡتُهَا یُضِیۡٓءُ وَلَوۡ لَمۡ تَمۡسَسۡهُ نَارٌ نُوۡرٌ عَلٰی نُوۡرٍ یَهۡدِی اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ یَّشَآءُ وَ یَضۡرِبُ اللّٰهُ الۡاَمۡثَالَ لِلنَّاسِ وَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ۝

(النور: ۳۴، ۳۵)

ہم نے تمھاری طرف واضح آیات نازل کی ہیں اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کا حال بیان کیا ہے اور ڈرنے والوں کے لیے نصیحت کی باتیں بھیجی ہیں۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثال ایسی ہے گویا ایک طاق ہے، جس میں چراغ رکھا ہوا ہے اور وہ چراغ جلایا جاتا ہے زیتون کے ایسے مبارک درخت کے تیل سے جو نہ مشرق کی طرف ہے نہ مغرب کی طرف، جس کی وجہ سے اس کا تیل اس قدر صاف ہے کہ قریب ہے ازخود روشنی دینے لگے۔ اگرچہ اسے آگ نہ لگے، روشنی پر روشنی ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنی روشنی کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ اور لوگوں کے لیے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

ان آیات سے چند حقیقتیں ہمارے سامنے آتی ہیں:

پہلی حقیقت یہ کہ بے قید شہوت رانی کے بجائے خدا کے بتائے ہوئے حدود کے اندر اپنی جنسی خواہش پوری کرنا ان برگزیدہ بندوں کا اسوہ رہا ہے، جن پر رحمتِ الٰہی ہر آن سایہ فگن رہتی تھی، جنھوں نے انسانیت کی کشتی کو جذبات اور خواہشات کے منجدھار سے نکال کر ہوش و خرد کے ساحل سے ہم کنار کیا، جنھوں نے آدمیت کی صحیح قدر کی اور اس کو کامیابی کے گر اور ناکامی کے اسباب بتائے، جن کی کوششوں سے دنیا کو ایسا معاشرہ ملا، جس میں جوش و ہوش اور جذبات و عقل کا پاسنگ ٹھیک قائم رہا، جن کی تربیت سے جذبات کے دیوانے دانشورانِ وقت بن گئے اور فہم و بصیرت کے اندھے عقل و خرد کے ایسے تاج دار ہوئے کہ فکر و دانش ان پر ناز کرتی تھی۔ جن کے جذبات

اتنے ستھرے تھے کہ عفت و عصمت بلائیں لیتی تھیں، جن کا کردار اتنا بے داغ تھا کہ آفتاب رشک کرتا تھا اور جن کی سیرت کی بلندی پر رفعتِ مہ و انجم شرمندہ تھی۔

دوسری حقیقت یہ کہ جو قوم بھی جنسی آوارگی میں مبتلا ہوئی نامراد ہوئی۔ وہ اس اندھے کی طرح تباہی کے گڑھے میں گر کر ہلاک ہوئی، جس کا ہاتھ پکڑنے والا کوئی نہ ہو۔ اس کے اقدامات، دیوانوں کی طرح عقل و ہوش سے خالی ہوتے تھے، کیوں کہ جذبات کی آندھیوں نے اس کی بصیرت کے چراغ کو بجھا دیا تھا۔

یہ تاریخ کا فیصلہ ہے اور وہ اپنے فیصلہ کو بار بار دہرا چکی ہے۔

تیسری حقیقت یہ کہ اس قانون کے ذریعے قرآن یہ چاہتا ہے کہ آدمی جذبات کا غلام بننے کے بجائے خدا کا پرستار ہو، تاکہ وہ اس کی نوازشاتِ بے پایاں کا مستحق قرار پائے اور اسے ایسی زندگی نصیب ہو، جس میں چین ہی چین ہے اور جو رنج و کلفت سے پاک ہے، لیکن بندگانِ ہوا و ہوس کی خواہش یہ ہے کہ ساری دنیا ان ہی کی طرح خواہشات کی پرستش میں لگ جائے۔

چوتھی حقیقت یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جنسی تعلقات کو بالکلیہ ممنوع نہیں قرار دیا۔ ان پر صرف پابندی عائد کی ہے۔ چناں چہ اس نے انسان کے سامنے جائز راہیں کھلی رکھی ہیں۔ اگر یہ راہیں مسدود ہوتیں تو جذبات کا سیلاب تمام حد بندیوں کو توڑ پھینکتا، کیوں کہ انسان بڑا ہی کم زور واقع ہوا ہے۔ وہ جذبات کو دبا نہیں سکتا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کی کم زوریوں کی رعایت کی ہے، اپنے قانون میں سختی نہیں رکھی۔

پانچویں اور آخری حقیقت یہ کہ خدا ترسی، پرہیزگاری اور تقویٰ و طہارت عین تقاضائے فطرت ہے۔ یہ ایسی آواز ہے، جو انسان کے اندرون سے اٹھتی ہے، اس لیے عفت و عصمت اور پاک دامنی کے تصور سے انسان کی فطرت اِبا نہیں کرتی، بلکہ آگے بڑھ کر اس کا استقبال اور خیر مقدم کرتی ہے۔ ان پر عمل سے اس کو جلا اور تب و تاب ملتی ہے اور وہ نور نصیب ہوتا ہے، جس کے ذریعے انسان کامیابی سے ہم کنار ہوسکتا ہے۔

وَ مَنۡ لَّمۡ یَجۡعَلِ اللّٰہُ لَہٗ نُوۡرًا فَمَا لَہٗ مِنۡ نُّوۡرٍ ○ (النور:۴۰) اور جس کو خدا روشنی سے محروم کردے اس کے لیے کہیں کوئی روشنی نہیں۔

اسلام نے جنسی تعلقات کا جو تصور پیش کیا ہے، آیئے، اب ہم تفصیل سے دیکھیں کہ وہ اس تصور کے مطابق کس طرح فرد کی تربیت اور معاشرہ کی اصلاح کرتا ہے، کیوں کہ ان ہی دو ذرائع پر کسی تصور کی کامیابی یا ناکامی کا انحصار ہے۔



فرد کی تربیت

کوئی بھی اجتماعی ہیئت اس وقت تک کامیاب نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کے زیرِ سایہ افراد اپنی زندگیوں میں اس کے مناسبِ حال تبدیلی نہ کرلیں۔ اسی لیے ہر معاشرہ افراد کو ان نظریات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے، جن پر وہ خود قائم ہے۔ اسلام نے بھی فرد کی اصلاح کو دیگر امور پر مقدم رکھا ہے، لیکن دنیا کے اور نظریات کے مقابلہ میں اسلام کا وصفِ امتیازی یہ ہے کہ وہ فرد سے پرامید رہ کر اصلاح کا آغاز کرتا ہے۔ وہ انسان کے بارے میں نہایت ہی بلند و ارفع تصور رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک انسان بدمعاش اور غلط کار نہیں ہے، بلکہ فطرتاً وہ ملکوتی پرواز رکھتا ہے، جسے غلط افکار و خیالات اور فاسد تعلیم و تربیت نے پستی کی طرف دھکیل دیا ہے۔ یہیں سے ان تصورات کی جڑ کٹ جاتی ہے، جن کے ہاتھ میں اس وقت دنیا کی قیادت کا علم ہے اور جو معصیت اور بدکاری کو عین تقاضائے فطرت سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک جس طرح بدن کو سردی اور گرمی سے محفوظ رکھنے کے لیے پوشاک اور زندہ رہنے کے لیے غذا کا تقاضا ہوتو آدمی غذا اور لباس کے مطالبات کی تکمیل کرتے ہوئے کوئی جھجک نہیں محسوس کرتا تو پھر صنفی خواہش کو آزادی سے پورا کرتے ہوئے کیوں نادم و پشیمان ہو؟

احساسِ عظمت

اسلام اس کے برعکس تصورِ حیات رکھتا اور اس کے مناسب اخلاقی اقدار فراہم

کرتا ہے۔ اس کے نزدیک زنا ایک معصیت ہے اور معصیت انسانی فطرت سے میل نہیں کھاتی۔ اس کے مزاج سے نیکی اور صرف نیکی ہی مطابقت رکھتی ہے۔ اس کی عظمت و بزرگی برائی میں نہیں بھلائی میں ہے۔ شر میں نہیں، خیر میں ہے۔ ورنہ کیا وجہ ہے کہ انسان کسی نازیبا عمل سے اپنے دل میں خلش اور انقباض محسوس کرتا ہے؟ کیوں غلط روش پر اس کا نفس سرزنش کرتا ہے؟ اس کا ایک ہی سبب ہے اور وہ یہ کہ انسان کی عزتِ نفس محامد و فضائل کے ساتھ وابستہ ہے۔ پاکیزگیِ کردار اور محاسنِ اعمال ہی سے اس کی شخصیت اور خودی کی نشو ونما ہوتی ہے۔ اگر ان جوہری صفات سے وہ عاری ہو تو میزانِ عمل میں اس کا وزن گھٹ جائے۔ یہی احساس ہے جو ایک ننگِ آدمیت کو بھی مجبور کرتا ہے کہ حسن عمل کا لبادہ اوڑھ کر دنیا کے سامنے آئے۔ وہ اس بات کا متمنی ہوتا ہے کہ دنیا اس کی تیرہ باطنی اور بداطواری کو بھی روشن ضمیری اور پاکیزہ کرداری یقین کرے۔

قرآن مجید اسی احساس کو زندہ اور بیدار کرتا ہے اور اس سے بار بار کہتا ہے کہ کب تک اس فریبِ نفس میں مبتلا رہو گے۔ اگر واقعی تمھیں اپنا شرف و مجد اور مقامِ عظمت عزیز ہے تو زندگی کو ان کمالات کے حصول میں لگاؤ، جن سے تم اپنی عظمتِ گم گشتہ حاصل کر سکتے ہو۔

قرآن مجید نے کتنے اچھوتے انداز میں اس حقیقت کو پیش کیا ہے:

وَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً قَالُوْا وَجَدْنَا عَلَيْهَا اٰبَآءَ نَا وَاللّٰهُ اَمَرَنَا بِهَاؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ○ (الاعراف:۲۸)

اور جب وہ بے حیائی کا کوئی کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسے ہی کرتے پایا اور اللہ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ تم کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ قطعاً بے حیائی کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم اللہ کے بارے میں ایسی باتیں کہتے ہو، جن کا تمھیں کوئی علم نہیں۔

غور کیجیے آج کے معصیت کیشوں اور عرب جاہلیت کے غلط کاروں کے افکار و

عقائد میں کس قدر مماثلت پائی جاتی ہے کہ یہ بھی اپنی عیاشی کے لیے تاریخی حقائق کو مسخ کرتے ہیں اور وہ بھی اپنے مزعومات کی سند میں تاریخ ہی کو پیش کرتے تھے۔ انھوں نے اپنی غلط روی کو وحی الٰہی کا نام دے رکھا تھا اور موجودہ دور کے بندگانِ ہوا و ہوس نے اپنی خواہشاتِ نفس کی پرستش، علم و بصیرت اور فلسفہ و حکمت کے عنوان سے شروع کر رکھی ہے۔

ضمیر کی آواز

انسان چوں کہ طبعاً خیر پسند ہے، اس لیے خود اس کا ضمیر اس کی ہوسناکیوں کی ہم نوائی سے انکار کرتا ہے۔ قدرت نے انسان کے اندرون میں ایسے متعدد عوامل پیدا کر دیے ہیں، جو اس کو کسی خارجی دباؤ کے بغیر برائی سے نفرت دلاتے ہیں۔ یہ عوامل بسااوقات اتنے شدید ہو جاتے ہیں کہ آدمی ان کے سامنے سپر ڈالنے پر مجبور ہوتا ہے، ورنہ گناہ خصوصاً موجودہ دور میں جتنے نظر فریب اور سحر آفریں انداز میں سامنے لایا جا رہا ہے اس سے نیکی کا تصور تک ذہنوں سے محو ہو جاتا ہے۔

ان ہی داخلی عوامل میں سے ایک کو ضمیر اور وجدان کہا جاتا ہے جو آدمی کے حسنِ عمل کی مدح و ستائش اور اس کی بری روش پر ملامت کرتا ہے اور اُسے یاد دلاتا رہتا ہے کہ معصیت کے داغ دھبے اس کی جبینِ عظمت کو خاک آلود کرنے والے ہیں اور اس منصبِ رفیع کے منافی ہیں جو قدرت نے اسے عطا کیا ہے۔

ضمیر کی یہ صدا، برائی کا سنگِ گراں ہے، لیکن اگر اس پر کان نہ دھرا جائے اور اسے دبانے کی مسلسل کوشش کی جائے تو یہ آواز دھیمی پڑ جاتی ہے۔ اسلام اپنی تعلیمات کے ذریعہ ضمیر کو زیادہ حساس اور طاقت ور بناتا ہے تاکہ یہ برائی اور ان کے راستوں کی چوکیداری کرے جہاں قانون کا خوف، بدنامی کا اندیشہ اور سوسائٹی کا دباؤ بھی نگرانی اور حفاظت سے قاصر رہتے ہیں۔

نُواس بن سَمعانؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک شخص نے نبی ﷺ سے 'بِرّ و اِثم' کی حقیقت دریافت کی۔ آپؐ نے جواب دیا:

اَلْبِرُّ حُسْنُ الْخُلُقِ وَالْاِثْمُ مَا حَاکَ فِیْ نَفْسِکَ وَ کَرِھْتَ اَنْ یَّطَّلِعَ النَّاسُ عَلَیْہِ.[1]	نیکی حسنِ خلق کو کہتے ہیں اور گناہ وہ ہے، جو تمھارے اندر کھٹک پیدا کردے اور اس سے لوگوں کا واقف ہو جانا تمھیں ناپسند ہو۔

اس حدیث کا ایک ایک لفظ غور کا طالب ہے، کتنی ہی اہم حقیقتیں ہیں جن کو اس بلیغ ارشاد نے بے نقاب کر دیا ہے۔ برّ (نیکی) وہ ہے جس میں اخلاق کا حسن اور کردار کی پاکیزگی جھلک رہی ہو، لیکن اثم (گناہ) اس دلکشی اور رعنائی سے محروم ہوتا ہے اور برائی کا یہ بھی ایک وصف ہے کہ وہ قلب وضمیر کا کانٹا بنی رہتی ہے اور مجرم کو اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ اپنی تر دامنی کے ساتھ نگاہِ خلق کے سامنے آئے، لیکن ایک صالح انسان کا دل اس خلش سے پاک ہوتا ہے۔ اس کو اپنے صحیفۂ عمل پر حسرت و ندامت نہیں لاحق ہوتی، وہ مسرور و مطمئن ہوتا ہے کہ اس نے عرصۂ حیات میں وہی کچھ کیا جو اسے کرنا چاہیے۔

ایمان آدمی کے اندر یہی وصف پیدا کرتا ہے:

اِذَا سَرَّتْکَ حَسَنَتُکَ وَ سَاءَتْکَ سَیِّئَتُکَ فَاَنْتَ مُؤْمِنٌ.[2]	جب تمھیں اپنا نیک عمل مسرور و شاداں کردے اور اپنی برائی ناگوار محسوس ہونے لگے تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو۔

جذبۂ حیا کا فروغ

جب احساسِ عظمت جاگ اٹھتا ہے اور وجدان وضمیر کی قوتیں زندہ ہوتی ہیں تو آدمی اپنے مرتبہ سے فروتر کسی فعل کا ارتکاب کرتے ہوئے ندامت اور پشیمانی محسوس کرتا ہے۔ گناہ کے ارتکاب سے اس کا سر فخر سے اونچا نہیں ہوتا، بلکہ ندامت سے جھک

---

[1] ترمذی، ابواب الزہد، باب ما جاء فی البر والاثم۔
[2] مسند احمد: ۶ / ۳۳۴، مسند ابو امامۃ حدیث نمبر ۲۱۶۵۵۔

جاتا ہے۔ معصیت کوشی اس کے لیے باعثِ افتخار نہیں، شرم و غیرت کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ جذبہ اگر سرد پڑ جائے تو آدمی کو معصیت کے حملوں سے بچانے والی ساری قوتیں کمزور پڑ جاتی ہیں۔ یہی حقیقت ہے، جسے ہر داعیِ خیر نے اپنے اپنے دور میں سمجھایا تھا:

عَنْ اَبِیْ مَسْعُوْدٍؓ قَالَ قَالَ النَّبِیُّؐ اِنَّ مِمَّا اَدْرَکَ النَّاس مِنْ کَلَامِ النُّبُوَّةِ الْاُوْلیٰ اِذَا لَمْ تَسْتَحِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ۔[1]

ابو مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ گزشتہ انبیائی تعلیمات کا جو حصہ لوگوں تک پہنچا ہے اس میں یہ بھی ہے کہ جب تمھاری حیا ختم ہو جائے تو جو چاہے کرو۔

حیا اور غیرت کی تعلیم ہمیشہ سے کیوں لازمۂ نبوت رہی؟ اس کی وجہ نبی ﷺ نے ایک موقع پر بیان فرمائی ہے۔

حضرت سعدؓ نے ایک مرتبہ فرمایا: یا رسول اللہ! اگر کوئی شخص کسی کو اپنی بیوی کی عصمت دری کرتے دیکھے تو کیا اس کی غیرت اس بات کی اجازت دے گی کہ وہ قرآن کے حکم کے مطابق چار گواہ تلاش کرتا پھرے۔ خدانخواستہ اگر میرے ساتھ یہ ناگوار صورت پیش آئے تو اس بدمعاش کو وہیں ڈھیر کر دوں گا۔

اس غیرت مندانہ تقریر کو سن کر آں حضرت ﷺ حاضرین سے مخاطب ہوئے اور فرمایا:

أ تَعْجَبُوْنَ مِنْ غَیْرَةِ سَعْدٍ وَاللّٰهِ لَاَنَا اَغْیَرُ مِنْهُ وَاللّٰهُ اَغْیَرُ مِنِّیْ مِنْ اَجْلِ غَیْرَةِ اللّٰهِ حَرَّمَ اللّٰهُ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ۔[2]

کیا تم سعدؓ کی غیرت سے تعجب کرتے ہو۔ خدا کی قسم میں اس سے زیادہ غیرت مند ہوں اور اللہ مجھ سے بھی زیادہ صاحبِ غیرت ہے اور اپنی اسی غیرت کی وجہ سے اس نے کھلی اور چھپی تمام بے حیائیوں کو حرام کیا۔

حقیقت یہ ہے کہ کوئی دنی الطبع اور کمینہ انسان بھی اپنی طرف رذائل کا انتساب

---

[1] بخاری، کتاب الادب، باب اذا لم تستح فاصنع ما شئت۔ ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی الحیاء۔

[2] بخاری، کتاب التوحید، باب قول النبیؐ لا شخص اغیر من اللہ۔ مسلم، کتاب اللعان

پسند نہیں کرتا تو خدائے تعالیٰ کی مقدس و باعظمت ہستی اس سے کہیں ارفع ہے کہ معاصی و فواحش اسے محبوب ہوں اور وہ ان کا حکم دے۔ ایک شریف اور باحیا انسان خود تو کیا معصیت کا مرتکب ہوگا، دوسرے تک کو آلودۂ معصیت نہیں دیکھ سکتا تو خدائے غیور اپنے بندوں کی بے حیائی اور جرم پروری کو کیسے بخوشی برداشت کرسکتا ہے؟ اس نے ہر دَور میں اپنے برگزیدہ بندوں کی زبانی اسی ناپسندیدگی کا اعلان کیا تھا۔ خدا کے جس بندے پر ان صفاتِ الٰہی کا جتنا زیادہ اثر پڑے گا وہ اتنا ہی گناہ سے دور بھاگے گا بلکہ ایک متقی شخص کو تصورِ جرم تک سرنگوں اور شرمسار کرسکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی اور خدا ترس ہستی (ﷺ) کے بارے میں آتا ہے:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ اَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِيْ خِدْرِهَا وَ كَانَ اِذَا كَرِهَ شَيْئًا عَرَفْنَاهُ فِيْ وَجْهِهٖ[1]

نبی ﷺ پردہ میں رہنے والی دوشیزہ سے زیادہ شرمیلے تھے۔ جب حیا کے منافی کوئی بات پیش آجاتی تو (آپؐ زبانِ مبارک سے اس کا تذکرہ تک نہیں کرتے تھے بلکہ ناپسندیدگی) رُخِ مبارک سے ظاہر ہونے لگتی جسے ہم بھانپ لیتے۔

اس باحیا انسان نے دنیا کو جس انداز سے حیا کی تعلیم دی اس کا اندازہ ذیل کی حدیثوں سے کیا جاسکتا ہے:

عَنْ بَهْزِ بْنِ حَكِيْمٍ عَنْ اَبِيْهِ عَنْ جَدِّهٖ قَالَ قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ عَوْرَاتُنَا مَا نَأْتِيْ مِنْهَا وَ مَا نَذَرُ؟ قَالَ احْفَظْ عَوْرَتَكَ اِلَّا مِنْ زَوْجَتِكَ اَوْ مَا مَلَكَتْ يَمِيْنُكَ قَالَ: قُلْتُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! اِذَا كَانَ الْقَوْمُ بَعْضُهُمْ فِيْ بَعْضٍ

بہز بن حکیم اپنے باپ کی وساطت سے اپنے دادا سے روایت کرتے ہیں کہ میں نے نبی کریمؐ سے دریافت کیا، اے اللہ کے نبی! ہم اپنی ستر پوشی کہاں کریں، اور کہاں نہ کریں۔ آپؐ نے جواب دیا: اپنی شرم گاہ کو اپنی بیوی اور اپنی باندی کے علاوہ کسی کے سامنے کھلنے نہ دو۔ میں نے کہا، یا رسول اللہ جب کہ لوگ باہم ملے جلے ہوں اور آدمی

---

[1] مسلم، کتاب الفضائل، باب کثرۃ حیائہٖ صلی اللہ علیہ وسلم

قَالَ: اِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ لَّا يَرَاهَا اَحَدٌ فَلاَ تُرِيَنَّهَا اَحَدًا قَالَ قُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ اِذَا كَانَ اَحَدُنَا خَالِيًا؟ قَالَ اللّٰهُ اَحَقُّ اَنْ يُسْتَحْيٰى مِنْـهُ مِنَ النَّاسِ[۱]

ستر پر پوری طرح قادر نہ ہو تو کیا کرے؟ فرمایا: جہاں تک ممکن ہو کوشش کرو کہ کوئی شخص تمھارے قابلِ ستر مقامات کو دیکھنے نہ پائے۔ میں نے کہا، اے اللہ کے رسول، جب کوئی شخص تنہا ہو تو کیا اس وقت بھی وہ ننگا نہیں ہوسکتا؟ آپؐ نے جواب دیا: اس وقت اللہ تو موجود ہوتا ہے، اور اللہ کی ذات لوگوں کے مقابلہ میں اس کی زیادہ مستحق ہے کہ اس سے شرم کی جائے۔

عَنْ عُتْبَةَ بْنِ عَبْدِ السُّلَمِيِّ ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا اَتٰى اَحَـدُكُمْ اَهْلَـهُ فَلْيَسْتَتِرْ وَلاَ يَتَجَرَّدْ تَجَرُّدَ الْعِيْرَيْنِ[۲]

عتبہ بن عبد السلمی روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے ہم بستری کرے تو چاہیے کہ پردہ کرلے اور دونوں اس حالت میں گدھوں کی طرح ننگے نہ ہوجائیں۔

اس تعلیم نے شرم و حیا کا درجہ اس قدر بلند کر دیا کہ دورِ حاضر کے ذہن کے لیے اس کا تصور بھی دشوار ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی محبوب ترین بیوی حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں:

”میں نے نبی ﷺ کا قابلِ ستر حصہ کبھی نہیں دیکھا۔“[۳]

تہذیب و شرافت اور شرم و حیا کا ایک معیار یہ ہے اور دوسرا معیار وہ ہے، جو اس وقت کی عریاں تہذیب پیش کر رہی ہے کہ بے حجابی کے بغیر وہ تکمیل ہی نہیں پاتی۔ یہاں یہ کیفیت کہ تعلقات کے فطری حدود کے اندر بھی شرم و حیا کا دامن نہیں چھوٹتا، وہاں عریانیت کا یہ عالم کہ مرد اور عورت دونوں برسرِ بازار ننگے ہوکر رہ گئے ہیں۔ ایک

---

۱ ترمذی، ابواب الاستیذان والآداب، باب ماجاء فی حفظ العورۃ۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب التستر عند الجماع۔

۲ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب التستر عند الجماع۔

۳ ابن ماجہ، حوالہ سابق۔ مسند احمد: ۷/ ۹۳۔ حدیث نمبر ۲۳۸۲۳

طرف زبان، ناشایستہ کلمہ تک نکالنے سے انکار کر رہی ہے اور دوسری طرف ہر گلی کوچہ میں داستانِ حسن و عشق سنائی جا رہی ہے اور عشق و محبت کے نغمات گائے جا رہے ہیں۔ بتایئے، سیرت کی تعمیر کا وہ انداز آدمی کو معصیت کے دَل دَل میں پھنسنے سے باز رکھ سکتا ہے یا یہ؟

محاسبۂ آخرت

حیا کا جذبہ بالکل فطری ہے، لیکن اس کو حیاتِ دوام محاسبۂ آخرت کی فکر اور پرسشِ اعمال کے خوف سے حاصل ہوتا ہے، ورنہ ہوسکتا ہے کہ یہ زوال پذیر ہو جائے، کیوں کہ حیا کو زندگی اور فروغ دینے والی قوت اندیشۂ ملامت ہے، لیکن جہاں یہ تصور ہو کہ آدمی سرزنش و عتاب اور مدح و توصیف کا مستحق بس اسی دنیا میں ہوتا ہے اور اس کے ماوراء کوئی ایسا عالم نہیں ہے جہاں ہمارے اعمال کا محاسبہ ہو تو آدمی معصیت کے لیے ایسے بے شمار گوشے تلاش کر سکتا ہے، جہاں تک دنیا والوں کی نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں، یا وہ گناہ کو اتنا حسین اور نظر فریب بنا سکتا ہے کہ گناہ، گناہ نہ رہے بلکہ کارِ ثواب بن جائے اور خود ملامت کرنے والی قوتیں اس پر مفتون ہو جائیں۔ اس کے برعکس اسلام یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ اس کائنات میں ایک ایسی ہستی ہے، جس کی چشمِ نگراں سے اعمالِ انسانی کا کوئی گوشہ اوجھل نہیں رہتا۔ نورِ سحر میں واقع ہونے والے افعال اور ظلمتِ شب میں کی جانے والی حرکات سب سے وہ واقف ہے۔ اس کا علم پہاڑ جیسے واقعات سے لے کر عزم و ارادہ کی جنبش اور خطراتِ قلب تک یکساں حاوی ہے اور ایک دن ضرور آئے گا جب کہ تمام انسانوں کے سامنے میرے اعمال کا دفتر کھول دیا جائے گا اور مجھے اس لطیف و خبیر ہستی کو اپنے ایک ایک عمل کا حساب دینا ہوگا۔ یہ یقین انسان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ ان اعمال سے احتراز کرے جو اس کو سرنگوں اور رسوا کرنے والے ہیں۔

آج اگر دو چار افراد کے سامنے ہمارا کوئی جرم آجاتا ہے تو شرمندگی سے نگاہیں جھک جاتی ہیں، حسرت و ندامت کے آنسوؤں سے گلا گھٹنے لگتا ہے، جس شخص کا یہ ایمان

ہو کہ کل تمام دنیا اور ان کے آقا و مالک کے سامنے اس کا صحیفۂ حیات پڑھا جائے گا اور اس کے داغ دھبے عالم آشکارا کیے جائیں گے، سوچیے، اس سے زیادہ محتاط اور پاکیزہ کردار اور کون ہوسکتا ہے! اس یقین کو بڑھانے کے لیے قرآن مجید نے جگہ جگہ احوالِ قیامت کا تذکرہ اس انداز سے کیا ہے کہ ظالموں کے بے پایاں افسوس اور انتہائی ندامت کی تصویر کھنچ جاتی ہے کہ کس طرح ان کے چہروں پر ذلت و رسوائی کی پھٹکار ہوگی، شرمندگی سے ان کی آنکھیں نیچی ہوں گی اور دِل دہل رہے ہوں گے؟ اس کے ساتھ وہ نکوکاروں کی حسنِ عاقبت کا بھی بڑے دلکش اور مؤثر پیرایے میں ذکر کرتا ہے، تاکہ آدمی کی نگاہ میں گناہ مکروہ اور نیکی محبوب ہوجائے۔ یہاں صرف دو مثالیں دی جا رہی ہیں، سورہ عبس کی آیات ہیں:

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ مُّسْفِرَۃٌo ضَاحِکَۃٌ مُّسْتَبْشِرَۃٌoوَوُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ عَلَیْھَا غَبَرَۃٌo تَرْھَقُھَا قَتَرَۃٌ oاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکَفَرَۃُ الْفَجَرَۃُo (عبس:۳۸-۴۲)

اس دن کتنے ہی چہرے روشن ہوں گے، خنداں و شاداں، اور کتنے ہی چہرے ایسے ہوں گے جن پر گرد پڑی ہوگی، ان پر سیاہی چڑھی ہوگی۔ یہی لوگ ناشکرے اور بدکار ہیں۔

سورۂ یونس میں ہے:

لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَ زِیَادَۃٌ ط وَلاَ یَرْھَقُ وُجُوْھُھُمْ قَتَرٌ وَّلاَ ذِلَّۃٌ ط اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ھُمْ فِیْھَا خَالِدُوْنَo وَالَّذِیْنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ بِمِثْلِھَا وَ تَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ ط مَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍ کَاَنَّمَا اُغْشِیَتْ وُجُوْھُھُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّیْلِ مُظْلِمًا ط اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ

جن لوگوں نے بھلائی کی روش اختیار کی ان کے لیے اچھا بدلہ ہے اور اس سے بھی زیادہ ان کو دیا جائے گا اور ان کے چہروں پر تاریکی اور ذلت نہیں چھائی ہوگی۔ یہ لوگ جنت والے ہیں، جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے، لیکن جن لوگوں نے برے عمل کیے (انھیں ان کی برائی کے بہ قدر ہی بدلہ دیا جائے گا اس لیے کہ) برائی کا بدلہ اسی کے

النَّارِ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ○
(یونس:۲۶،۲۷)

مثل دیا جاتا ہے۔ (پھر بھی) ان سے ذلت و رسوائی چپکی ہوگی، انھیں اللہ کے عذاب سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ (اُن کے چہرے بالکل سیاہ ہوں گے) گویا کسی تاریک رات کے ٹکڑے نے انھیں ڈھانک لیا ہے۔ یہ لوگ دوزخ والے ہیں، جس میں یہ ہمیشہ رہیں گے۔

آخرت کا عقیدہ اس دنیا کی زندگی کے بعد ایک نئ زندگی کا تصور ہے، جو اس زندگی سے زیادہ حسین اور پر کشش ہے، جس کا عیش بے پایاں اور جس کی آسائشیں اور راحتیں بے حد وحساب اور لامتناہی ہیں۔ اس دنیا میں انسان کو چند روزہ حیات مستعار ملی ہے، کسی بھی وقت چھن سکتی ہے، لیکن وہاں کی زندگی ابدی اور دائمی ہے، یہاں کی ہر نعمت وقتی اور فانی ہے وہاں کی نعمتیں لازوال اور جاودانی ہیں، یہاں انسان کی بیشتر خواہشیں پوری نہیں ہوتیں اور وہ ہزاروں تمنائیں اپنے سینہ میں لیے اس دنیا سے جاتا ہے، وہاں اس کی ہر خواہش کی تکمیل ہوگی، وہ جو چاہے گا آن کی آن میں اسے حاصل ہوگا۔ انسان کے اندر جنسی داعیہ موجود ہے، لیکن اس کے ساتھ بہت سی آلائشیں ہیں، یہ جذبہ دیرپا بھی نہیں ہے۔ جوانی کے ڈھلنے کے ساتھ وہ مرجھا جاتا ہے۔ آخرت میں اس جذبہ کی تسکین کا اس طرح سامان ہوگا کہ عہد شباب کی بہار ہمیشہ قائم رہے گی، اس کی خرابیوں اور غلط نتائج سے بھی انسان محفوظ رہے گا۔

قرآن اہل جنت کے بارے میں کہتا ہے:

اِنَّ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ الْیَوْمَ فِیْ شُغُلٍ فٰکِھُوْنَ○ ھُمْ وَ اَزْوَاجُھُمْ عَلَی الْاَرَآئِکِ مُتَّکِئُوْنَ○ لَھُمْ فِیْھَا فَاکِھَةٌ وَّلَھُمْ مَا یَدَّعُوْنَ○

بے شک اصحابِ جنت آج اپنے مشغلہ میں خوشی سے باتیں کر رہے ہوں گے۔ وہ اور ان کی بیویاں تختوں پر ٹیک لگائے ہوں گے۔ ان کے لیے اس میں ہر طرح کے میوے ہوں گے اور وہ سب کچھ ملے گا جو وہ طلب کریں گے۔ ان

سَلٰمٌ قَوۡلًا مِّنۡ رَّبٍّ رَّحِیۡمٍ○ (یٰسٓ:۵۵-۵۸)

کے لیے رب رحیم کی طرف سے سلام کہلایا جائے گا۔

ایک اور جگہ ان لوگوں کے بے پایاں اجر وثواب کا ذکر ہے، جن کی زندگی اس دنیا میں ایمان اور عمل صالح کی زندگی ہوگی۔

وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدۡخِلُهُمۡ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡهَاۤ اَبَدًا ؕ لَهُمۡ فِیۡهَاۤ اَزۡوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۫ وَّ نُدۡخِلُهُمۡ ظِلًّا ظَلِیۡلًا○ (النساء:۵۷)

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک اعمال کیے ہم ان کو ایسی جنتوں میں ضرور داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ ان کے لیے وہاں پاکیزہ جوڑے ہوں گے اور ہم ان کو گھنے سایہ میں داخل کریں گے۔

یہ تصویر قرآن مجید میں جا بہ جا موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات اور روزِ جزا پر یقین ایک مومن کے ایمان کی اساس ہے۔ اس کے تمام اعمال اسی محور کے گرد گردش کرتے ہیں۔ یہ عقیدہ دل و دماغ میں اچھی طرح راسخ ہوجائے تو تصور گناہ سے بھی آدمی کانپ اٹھے گا۔ معصیت اس کے لیے وجہِ کیف وسرور نہ ہوگی، بلکہ اس سے وہ انقباض اور نفرت محسوس کرے گا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی داستانِ حیات میں جہاں عبرت و بصیرت کے بے شمار خزانے پوشیدہ ہیں، وہاں یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آتی ہے کہ جو دل خشیتِ الٰہی کا مسکن ہو اور جن نگاہوں میں خالق کائنات کے جلوے سمائے ہوئے ہوں انھیں دنیا کا کوئی حسن و جمال خیرہ نہیں کرسکتا۔ حسینانِ مصر اپنی دل ربائیوں سے یوسفِ پاک باز کو مسحور کرنا چاہتی ہیں، لیکن حضرت یوسف ہیں کہ خدا کے خوف سے کانپ رہے ہیں اور اپنے ہاتھ تضرع و الحاح کے ساتھ اس کے روبرو پھیلائے ہوئے ہیں کہ ان آندھیوں میں تو ہی مجھے ثابت قدم رکھ سکتا ہے۔ میرے لیے ہر مصیبت قابلِ برداشت! اگر اس کے نتیجہ میں میرا دامن معصیت کے چھینٹوں سے محفوظ رہے۔

رَبِّ السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِمَّا یَدۡعُوۡنَنِیۡۤ اِلَیۡہِ وَ اِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّیۡ کَیۡدَهُنَّ اَصۡبُ اِلَیۡهِنَّ وَ اَکُنۡ مِّنَ الۡجٰهِلِیۡنَ○

میرے رب! مجھے قید خانہ محبوب ہے اس عمل سے جس کی مجھے یہ دعوت دے رہی ہیں اور اگر تو نے ان کی چال کو مجھ سے نہیں پھیرا تو میں ان کی طرف مائل ہوجاؤں گا اور پھر نادانوں میں میرا شمار ہوگا۔ (یوسف:۳۳)

فکر ونظر کے اس تفاوت کو دیکھئے کہ ایک طرف خواہشاتِ نفس کی تسکین کے لیے صدہا چالیں چلی جاتی ہیں، ہزار طریقہ سے دام مکر وفریب پھیلایا جاتا ہے، تقویٰ و طہارت کی دنیا کو تاریک کرنے کے لیے ہر ممکن تدبیر عمل میں لائی جاتی ہے اور دوسری طرف یہی گوشت پوست اور جذبات وخواہشات والا انسان ہے کہ کائناتِ حسن و جمال کی ملتجیانہ پیشکش کو ٹھکرا دیتا ہے۔ اسے یہ پسند ہے کہ قید کی سختیاں جھیلے، لیکن وہ یہ نہیں چاہتا کہ دنیا کے عیش و آرام کے ساتھ معصیت کی گندگی اس کے ساتھ چپکی رہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ جب تک کسی علیم وخبیر ہستی کی بازپرس کا یقین نہ ہو اس حیرت انگیز کردار کا ثبوت فراہم کرنا آسان نہیں ہے؟ جو دل خوفِ خدا سے خالی ہو، اس کے لیے ممکن نہیں ہے کہ جذبات کے سیلاب میں پہاڑ کی مانند اس طرح جما رہے۔

حضرت مریم علیہا الصلوٰۃ السلام کے روبرو اچانک ایک متناسب الاعضاء اور خوب صورت انسان نمودار ہوتا ہے۔ تنہائی میں حضرت مریم اسے دیکھتے ہی خوفِ خدا سے پکار اٹھتی ہیں:

اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِالرَّحۡمٰنِ مِنۡکَ اِنۡ کُنۡتَ تَقِیًّا○

میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تو خدا سے ڈرنے والا ہے۔ (مریم:۱۸)

جب اس 'انسان' نے انھیں بتایا کہ وہ انسانی شکل میں فرشتہ ہے، جو انہیں ایک صالح اور نیک اولاد کی خوش خبری سنانے کے لیے آیا ہے تو حضرت مریم علیہا السلام حیرت سے پوچھتی ہیں:

اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّ لَمْ اَکُ بَغِیًّا ۝ (مریم:۲۰)

میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے جب کہ کسی بشر نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدکار ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ روزِ قیامت انسانوں میں سے سات قسم کے اعلیٰ کردار افراد کو اللہ تعالیٰ کے عرش کے سایہ میں جگہ ملے گی۔ ان میں سے تین کا ذکر اس طرح فرمایا:

سَبْعَةٌ یُظِلُّهُمُ اللّٰهُ فِیْ ظِلِّهٖ یَوْمَ لاَ ظِلَّ اِلَّا ظِلُّهٗ... وَ شَابٌّ نَشَأَ فِیْ عِبَادَةِ اللّٰهِ... وَ رَجُلٌ دَعَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصَبٍ وَ جَمَالٍ فَقَالَ اِنِّیْ اَخَافُ اللّٰهَ...وَ رَجُلٌ ذَكَرَ اللّٰهَ خَالِیًا فَفَاضَتْ عَیْنَاهُ[1]

سات قسم کے آدمی ہیں جنھیں اللہ تعالیٰ اس دن اپنے سایہ میں سایہ عطا کرے گا جب کہ اس کے سایہ کے سوا اور کوئی سایہ نہ ہوگا...ان میں وہ نوجوان بھی ہے، جس کی نشو ونما ہی اللہ کی بندگی میں ہوئی ہو...اور ایسا شخص جس کو کسی صاحبِ مرتبہ اور حسین وجمیل عورت نے معصیت کی پیش کش کی ہو اور اس پیش کش کو اس نے یہ کہہ کر ٹھکرا دیا ہو کہ میں گناہ کرتے ہوئے اللہ سے ڈرتا ہوں... اور ایسا شخص جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرتا ہے اور اپنی کوتاہیوں کا خیال کرکے اس کی آنکھوں سے اشکِ ندامت رواں ہو جاتے ہیں۔

یہ ہے وہ کردار جو قیامت کے خوف سے وجود میں آتا ہے اور اسلام ایسی ہی اعلیٰ سیرت کی ایک مومن سے توقع رکھتا ہے۔

گناہ کا واضح تصور

اسلام معصیت کے خلاف انسان کے ان فطری جذبات کو اُبھار کر چھوڑ نہیں دیتا، بلکہ گناہ وثواب، حق و باطل اور حسن و قبح کا واضح تصور عطا کرتا ہے، تاکہ حق کی راہ کا مسافر ظلمتوں میں بھٹکنے نہ پائے اور ایک طالبِ نجات خوب جان لے کہ معاصی کیا

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الصدقۃ بالیمین۔ مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب اخفاء الصدقۃ۔ ترمذی، ابواب الزہد، باب ماجاء فی الحب فی اللہ۔

ہیں اور حسنات کیا ہیں؟ فضائل کن اعمال کو کہا جاتا ہے اور رذائل کن افعال کو؟ اور اگر کوئی بے راہ روی اور آوارگی ہی کو کمالِ فکر و نظر سمجھتا ہے تو اس انجام سے بھی واقف ہوجائے جن سے ہر غلط کار کو لازماً دوچار ہونا ہے۔

اس نے یہ تفصیلی ہدایات زندگی کے اور معاملات کی طرح تعلقاتِ مرد و زن کے سلسلہ میں بھی دی ہیں اور بتایا ہے کہ دونوں کے درمیان روابط کی وہ کون سی نوعیت ہے، جو خدائے تعالیٰ کے رضا کی موجب ہے اور وہ کون سی صورتیں ہیں، جو مالکِ ارض و سماء کی نگاہ میں ناپسندیدہ، مبغوض اور دنیا و آخرت میں ناکامی اور خسران کا سبب بنتی ہیں۔

مرد اور عورت ایک دوسرے کے لیے وجہِ آزمائش ہیں

جنسی میلان کے متعلق وہ پہلے ہی قدم پر یہ اعلان کرتا ہے کہ اس امتحان گاہِ حیات میں وہ خدا کی جانب سے بندہ کی ابتلاء و آزمائش کا ایک ذریعہ ہے۔ مرد اور عورت کے درمیان بے پایاں کشش آدمی کو ایک ایسے موڑ پر کھڑا کر دیتی ہے، جہاں سے اس کے حق پرست اور بندۂ ہوا و ہوس ہونے کا بہ آسانی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک طرف جذبات کے ہنگامے ہیں کہ اس کو ہر بندش توڑ پھینکنے پر آمادہ کرتے ہیں اور دوسری طرف خدا کا خوف اور عقل و فطرت کے تقاضے اسے حدود کی پاسبانی پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ کشمکش آدمی کے دعوئ ایمان کے لیے ایک کسوٹی بن جاتی ہے کہ کہاں تک وہ اپنے ایمان و یقین اور عزم و ارادہ میں سچا ہے؟

بخاری، مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور مسند احمد نے نبی ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

مَا تَرَكْتُ بَعْدِىْ فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ[1]	میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے زیادہ نقصان رساں اور کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب ما یتقی من شوم المرأۃ۔ مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب اکثر اھل الجنۃ الفقراء و اکثر اھل النار النساء و بیان الفتنۃ بالنساء۔ ترمذی، کتاب الادب، باب ماجاء فی تحذیر فتنۃ النساء

ایک اور موقع پر آپؐ نے فرمایا:

مَا مِنْ صَبَاحٍ اِلَّا وَ مَلَكَانِ يُنَادِيَانِ وَيْلٌ لِّلرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ وَ وَيْلٌ لِّلنِّسَآءِ مِنَ الرِّجَالِ[1]

ہر صبح دو فرشتے اعلان کرتے ہیں کہ مردوں کے لیے عورتیں تباہ کن ہیں اور عورتوں کے لیے مرد۔

زنا کی پاداش

کامیابی اسی شخص کے لیے ہے، جو اس کشمکش میں عفت و پاک بازی کا دامن نہ چھوڑے اور جذبات کے اندھے بہرے تقاضے اس کو جادۂ مستقیم سے منحرف نہ کریں:

وَ الَّذِيْنَ لاَ يَدْعُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً آخَرَ وَلاَ يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِىْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلاَ يَزْنُوْنَ ج وَ مَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ○

(الفرقان:۶۸)

(اللہ کے نیک بندے وہ ہیں) جو اس کے ساتھ کسی اور معبود کو نہیں پکارتے اور جس جان کو اللہ نے محترم قرار دیا ہے اسے قتل نہیں کرتے، الا یہ کہ حق اس کا تقاضا کرے اور وہ زنا نہیں کرتے اور جو شخص ان بدعملیوں کا ارتکاب کرے گا وہ اپنے گناہوں کے نتائج سے ضرور دو چار ہوگا۔

حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

اَلدُّنْيَا حُلْوَةٌ خَضِرَةٌ وَ اِنَّ اللّٰهَ مُسْتَخْلِفُكُمْ فِيْهَا فَيَنْظُرُ كَيْفَ تَعْمَلُوْنَ فَاتَّقُوا الدُّنْيَا وَ اتَّقُوا النِّسَآءَ فَاِنَّ اَوَّلَ فِتْنَةِ بَنِىْ اِسْرَآئِيْلَ كَانَتْ فِى النِّسَآءِ[2]

دنیا ایک میٹھی اور سرسبز شئے ہے اور اللہ تمھیں اسی پر لذت دنیا کا جانشین بنانے والا ہے تو وہ دیکھے گا کہ تم کیسے عمل کرتے ہو۔ پس تم دنیا کی رنگینیوں سے احتراز کرو اور عورتوں کے فتنہ سے بچو۔ تم سے اگلی امت بنی اسرائیل کی پہلی آزمائش عورتوں ہی کے ذریعے ہوئی تھی۔

---

[1] ابن ماجہ، ابواب الفتن، باب فتنۃ النساء۔ مستدرک حاکم: ۲/ ۱۷۳۔ اس حدیث کے راوی خارجہ بن مصعب کو بیشتر محدثین نے ضعیف اور ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے، لیکن ابوحاتم کی رائے اتنی سخت نہیں ہے۔ یحیٰ بن یحیٰ اس کے صرف ایک سلسلۂ سند پر تنقید کرتے ہیں اور بقیہ سلسلوں کو صحیح سمجھتے ہیں۔ مذکورہ حدیث اس متروک سند سے نہیں ہے۔ ملاحظہ ہو تہذیب التہذیب: ۳/ ۷۰-۷۷

[2] رواہ مسلم، کتاب الذکر والدعاء الخ۔ رواہ ابن ماجہ فی ابواب الفتن غیر قولہ فان اول فتنۃ۔ الخ

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ خلافتِ ارضی کے وسیع اختیارات ان ہی بلند کردار اور صالح سیرت افراد کو سونپے جاتے ہیں جن کو یہ اختیارات دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں منہمک نہ کرسکیں۔ خصوصاً جو پاسبانِ عصمت ہوں، جو فرشتہ سیرت اور باعفت و پاک باز ہوں۔ لیکن جس قوم کا دامن ان اخلاقی خوبیوں سے خالی ہو وہ خدا کی اس عظیم الشان نعمت سے محروم کر دی جاتی ہے۔ اگر دیدۂ عبرت ہوتو گزشتہ امتوں سے سبق لیا جاسکتا ہے کہ بنو اسرائیل سب سے پہلے اسی فتنہ میں پڑے، ان کے اندر بدکاری عام ہوئی پھر دوسری خرابیوں نے بھی راہ پائی۔ اپنی ہوس ناکیوں کی وجہ سے وہ منصب خلافت سے ہٹادیے گئے۔

عفت کی جزا

سوال یہ ہے کہ اس تباہی سے کیسے بچا جاسکتا ہے؟ اس سوال کا جواب ایک اور سوال کے حل پر منحصر ہے، وہ یہ کہ آدمی زنا اور بدکاری کی راہ کیوں اختیار کرتا ہے؟ اس کے دو ہی سبب ہیں، ایک یہ کہ وہ اس کی شناعت کو محسوس نہیں کرتا اور محسوس کرتا بھی ہےتو وقتی لذت اور جنسی آسودگی کو ترجیح دیتا ہے۔ دوسرا سبب یہ کہ وہ باعفت زندگی نہیں گزار سکتا، اس لیے زنا پر مجبور ہے۔ یہ مجبوری خواہ ماحول اور معاشرہ کی پیدا کردہ ہو یا غلط افکار و عقائد کی، یہ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ہو یا تہذیب و ثقافت کا۔ جب تک ان دونوں محرکات کا سد باب نہیں کیا جاتا دامن عفت محفوظ نہیں رہ سکتا۔

لہٰذا زنا اور اس کے نتائج سے تحفظ کے لیے دو باتوں کی ضرورت ہے۔ اولاً انسان کی نگاہ میں معصیت کی رنگینیاں پھیکی پڑ جائیں اور اس کی جاذبیت ختم ہوجائے۔ ثانیاً اس کے سامنے صحیح راہیں کھلی ہوئی ہوں، تاکہ وہ جذبات کے مقابلہ میں نہتا اور غیر مسلح ہوکر نہ رہ جائے اور ان صحیح راستوں میں اتنی دل کشی اور رعنائی پیدا کردی جائے کہ اس کے لیے ناجائز رخ کی طرف نگاہ اٹھانے کی ضرورت نہ رہے۔

اسلام کا عقیدۂ آخرت، جیسا کہ عرض کیا گیا، انسان کو معصیت سے باز رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ وہاں کی ابدی زندگی اور لازوال مسرت و راحت کے مقابلہ میں یہاں کا آسائش و آرام اور وقتی راحت و لذت اسے ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔ آخرت پر ایمان کامل ہو تو اس کے بے پایاں جلووں کا تصور معصیت کو بے نور بنا دیا ہے اور اس ابدی کیف و سرور کی یاد دنیا کی فانی لذتوں کو بے نمک کر کے رکھ دیتی ہے۔ زندگی کے اس تابناک پہلو پر یقین، آدمی کے اندر ایک امنگ اور بے چینی پیدا کرتا ہے کہ وہ اسی کو اپنی جدوجہد کا نشانہ بنائے۔

نکاح کا مقصد

زنا کے دوسرے محرک کو ختم کرنے کے لیے اسلام نے جائز صورتوں کو بالکل آسان اور سہل الوصول کر دیا ہے۔ وہ ایک ایک فرد کو انتہائی ترغیب دیتا ہے کہ ان کو اختیار کرے تاکہ اپنے آپ کو معصیت کی آلودگی سے بچا سکے۔ اس کے نزدیک نکاح کا منشا یہ نہیں ہے کہ گھر پر بھی ایک داشتہ موجود رہے، بلکہ وہ نکاح کو معالیِ اخلاق اور پاک دامنی کی نگہداشت کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ اہلِ ایمان کے سامنے نکاح کا جو مقصد ہونا چاہیے اسے قرآن مجید نے ان بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے:

مُحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسَافِحِيْنَ (النساء:۲۴) قید نکاح میں لانے والے مرد نہ کہ زنا کرنے والے۔

اہلِ ایمان خواتین کے متعلق ارشاد ہوا:

مُحْصَنَاتٍ غَيْرَ مُسَافِحَاتٍ (النساء:۲۵) قید نکاح میں آنے والیاں نہ کہ زنا کرنے والیاں۔

ان آیات میں قرآن مجید نے '**احصان**' اور '**مسافحة**' کے دو الفاظ سے نکاح کے مقصد کو بالکل واضح کر دیا ہے۔

'مسافحہ' کا مادہ سفح ہے۔ اس کے اندر انڈیلنے اور بہا دینے کا مفہوم ہے، زنا کو 'سفاح' اس لیے کہا جاتا ہے:

لِاَنَّہٗ کَانَ عَنْ غَیْرِ عَقْدٍ کَاَنَّہٗ بِمَنْزِلَۃِ الْمَاءِ الَّذِیْ لَا یَحْبِسُہٗ شَیْءٌ[1]	کیوں کہ وہ بغیر عقد کے ہوتا ہے، گویا وہ اس پانی کی طرح ہے، جس کی راہ میں کوئی چیز مانع نہ ہو۔

گویا بے قید شہوت رانی اس پانی کی طرح ہے، جو بہا چلا جا رہا ہے اور جس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ اسی طرح جوئے کے ایسے تیر کو 'السفیح' کہا جاتا ہے، جس کا کوئی حصہ نہ ہو اور بازی میں جس کا وزن نہ محسوس کیا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ شریعت زنا کی حرمت اور نکاح کے جواز کے ذریعے دو اہم مقصد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ اول یہ کہ آدمی جنسی خواہش کے پورا کرنے میں بے قید اور آزاد نہ رہے، بلکہ حدود کی پابندی کرے۔ دوم یہ کہ پابندی تحفظِ عصمت کے لیے مفید اور کارآمد ہو۔ قرآن نے نکاح کے لیے دوسرا لفظ 'احصان' کا استعمال کیا ہے۔ 'حصن' کے معنی ہیں محفوظ قلعہ، عمدہ گھوڑا اور ہتھیار وغیرہ، یہ معانی اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ آدمی نکاح کے ذریعے حرام طریقوں سے محفوظ ہو جاتا ہے، وہ ایسے ہتھیار سے لیس ہوتا ہے، جس کے ذریعے جنسی ترغیبات کے ناروا حملوں کو بے اثر کر سکے۔

اسی مفہوم کو رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:

اِذَا اَحَدُکُمْ اَعْجَبَتْہُ الْمَرْأَۃُ فَوَقَعَتْ فِیْ قَلْبِہٖ فَلْیَعْمَدْ اِلٰی اِمْرَأَتِہٖ فَلْیُوَاقِعْھَا فَاِنَّ ذٰلِکَ یَرُدُّ مَا فِیْ نَفْسِہٖ.[2]	جب تم میں سے کسی کو کوئی عورت اچھی معلوم ہو اور اس سے اس کا دل متاثر ہو جائے تو اسے اپنی بیوی کے پاس جانا چاہیے اور اس سے ہم بستر ہونا چاہیے۔ اس طرح اس کے دل میں پیدا شدہ خیالات دور ہو سکیں گے۔

---

[1] لسان العرب، مادہ سفح [2] مسلم، کتاب النکاح، باب ندب من رای امرأۃ فوقعت فی نفسہ۔ ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی الرجل یری المرأۃ تعجب بھا

یہ حدیث ہمیں بتاتی ہے کہ ایک مومن کس مقصد کے لیے نکاح کرتا ہے؟ وہ کون سا عظیم فائدہ ہے، جس کے حصول کی وہ اس تعلق سے توقع رکھتا ہے؟ اور تجرد کی زندگی سے وہ کون سے خطرات ہیں، جن کے لاحق ہونے کا ہر آن خدشہ رہتا ہے؟

حصولِ مقصد کے لیے زوجین کی معاونت

یہی وجہ ہے کہ شریعت شدت کے ساتھ زوجین سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لیے ایک دوسرے کی معاونت کریں اور کوئی ایسی روش اختیار نہ کریں جو چاکِ عصمت کا سبب بن سکتی ہو۔ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِذَا دَعَا الرَّجُلُ امْرَأَتَهٗ اِلٰی فِرَاشِهٖ فَلَمْ تَأتِهٖ فَبَاتَ غَضْبَانَ عَلَيْهَا لَعَنَتْهَا الْمَلٰئِكَةُ حَتّٰی تُصْبِحَ[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، جب کوئی شخص اپنی بیوی کو ہم بستری کے لیے بلائے اور وہ نہ آئے اور اس وجہ سے خاوند رات بھر اس پر خفا رہے تو ایسی عورت پر فرشتے صبح تک لعنت بھیجتے ہیں۔

ایک اور موقعے پر نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا:

اِذَا الرَّجُلُ دَعَا زَوْجَتَهٗ لِحَاجَتِهٖ فَلْتَاتِهٖ وَ اِنْ كَانَتْ عَلَی التَّنُّوْرِ[2]

جب کوئی شخص اپنی بیوی کو اپنی جنسی ضرورت کے تحت بلائے تو اسے فوراً آ جانا چاہیے، خواہ وہ چولھے کے پاس (کھانا پکانے میں) مصروف ہی کیوں نہ ہو۔

اسلام یہ مطالبہ صرف عورت ہی سے نہیں کرتا بلکہ مرد کو بھی حکم دیتا ہے کہ عورت کے جذبات کی آسودگی کی فکر کرے، ورنہ ایک بہت بڑے حق کی عدم ادائیگی کا مجرم ہوگا۔

عبد الرحمٰن الجزیری لکھتے ہیں:

---

[1] بخاری، مسلم، ابوداؤد، ابواب النکاح واللفظ لمسلم، باب تحریم امتناعها من فراش زوجها۔

[2] ترمذی، ابواب الرضاع، باب ماجاء فی حق الزوج علی المرأة و رواه ابن ماجه والبیهقی والحاکم

وَ تَحتَمَّ عَلَى الرَّجُلِ اَنْ يَّعُفَّهَا بِقَدْرِ مَـا يَسْتَطِيْعُ كَمَا تَحْتَمُّ عَلَيْهَا اَنْ تُطِيْعَـهُ فِيْ مَا يَاْمُرُهَا بِهٖ مِنْ اِسْتِمْتَاعٍ اِلَّا لِعُذْرٍ صَحِيْحٍ[1]	چاروں فقہی مذاہب کے قوانین مرد پر لازم کرتے ہیں کہ وہ اپنی استطاعت کے مطابق عورت کو عفیف رکھے، اسی طرح عورت کے لیے بھی ضروری قرار دیتے ہیں کہ خاوند اگر اس سے آسودگی حاصل کرنا چاہے تو اس کے مطالبہ کو رد نہ کرے الاّ یہ کہ کوئی صحیح اور جائز عذر ہو۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے ایک خطبہ کے دوران میں فرماتے ہیں:

وَ حَصِّنُوْا فُرُوْجَ هٰذِهِ النِّسَآءِ[2]	ان عورتوں کی شرم گاہوں کو محفوظ رکھو۔

یعنی مرد پر ضروری ہے کہ وہ اپنی بیوی کی عصمت کا سامان کرے اور اسے بے راہ روی سے بچائے۔

امام ابن تیمیہؒ بیان فرماتے ہیں:

وَ يَجِبُ عَلَى الرَّجُلِ اَنْ يَّطَأَ زَوْجَتَهُ بِالْمَعْرُوْفِ وَ هُـوَ مِنْ اَوْكَـدِ حَقِّهَا عَلَيْهِ اَعْظَمُ مِنْ اِطْعَامِهَا.[3]	مرد پر واجب ہے کہ وہ معروف طریقہ سے اپنی بیوی کے ساتھ جماع کرے، یہ بیوی کا بہت ہی موکد حق ہے۔ نان و نفقہ سے بھی عظیم تر۔

عرب جاہلیت میں بعض اوقات شوہر، بیوی کو اس کے اس حق سے محروم کر دیتا تھا۔ مثلاً اگر زوجین میں ناچاقی ہوتی یا کسی وجہ سے نزاع اور اختلاف ہو جاتا تو شوہر بیوی کو دق کرنے کے لیے اس سے کہہ دیتا کہ تو مجھ پر میری ماں کی طرح حرام ہے، اور ازدواجی تعلقات منقطع کر لیتا۔ (اس طریقہ کو ظہار کہا جاتا ہے) یا ان تعلقات کے ادا نہ کرنے کی قسم کھا لیتا۔ (اس کا نام ایلاء ہے)۔

---

۱ الفقہ علی المذاہب الاربعۃ: ۴/۴

۲ مسند احمد: ۱/۳۱، حدیث نمبر ۱۰۵

۳ فتاویٰ ابن تیمیہؒ، جلد ۱، صفحہ ۵۶، طبع قدیم

اس طرح وہ بے چاری شوہر رکھنے کے باوجود، بے شوہر کے پڑی رہتی اور اپنی صنفی خواہشات کی تسکین کے لیے اس کے سامنے سوائے اس کے اور کوئی راہ نہ ہوتی کہ وہ بدکاری کرے۔

پہلی صورت اسلام کے مزاج سے بالکل متصادم تھی، اس لیے اس نے اسے حرام قرار دیا، کیوں کہ میاں بیوی میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے تحفظِ عصمت کا ذریعہ ہیں۔ یہ کتنی بڑی جہالت ہوگی کہ آدمی بیوی کو ماں اور بہن کی حیثیت عطا کردے اور اس بند کو توڑ دے جو قزاقانِ عصمت کو روکے ہوئے ہے۔

چناں چہ قرآن مجید نے ظہار کے سلسلے میں کہا کہ بیوی، بیوی ہی رہے گی۔ تمھاری لغو بیانی و لاف گوئی سے ماں نہیں بن جائے گی، لہٰذا اگر تمھاری زبان پر کبھی اس قسم کے بے ہودہ الفاظ آجائیں تو بطورِ تاوان فدیہ ادا کرو اور بیوی کے ساتھ شوہر کی طرح تعلقات رکھو، اس کے بیٹے نہ بنے رہو۔

ایلاء میں اس نے چار ماہ کی مہلت دی، تاکہ اس مدت میں خاوند یہ فیصلہ کرسکے کہ آیا بیوی کے ساتھ اس کا نباہ ہوسکتا ہے یا نہیں؟ اگر اس عرصہ کے بعد بھی وہ حقوقِ زوجیت ادا کرنے پر آمادہ نہیں ہے تو یہی سمجھا جائے گا کہ وہ ان ذمے داریوں سے دست کش ہوچکا ہے۔ لہٰذا اب عورت اپنے کسی اور پاسبانِ حقوق کے تلاش میں آزاد ہوگی۔[1]

اس سلسلے میں تیسرا اصول، جس کا ایک خاوند کو شریعت پابند بناتی ہے، یہ ہے کہ وہ صنفی خواہش کی تکمیل کا وہی فطری طریقہ اختیار کرے، جس سے عورت کے جذبات کی بھی آسودگی ہوتی ہو، اور قطعاً کوئی ایسا طریقہ نہ اپنائے جو عورت کے جائز مطالباتِ نفس کو پامال کرنے والا ہو۔ اسی لیے شریعت نے عورت کے ساتھ لواطت کو

---

[1] ملاحظہ ہو سورۂ مجادلہ آیت ۱ تا ۴ اور سورۂ بقرہ آیت ۲۲۶ اور ۲۲۷۔ اس کی کسی قدر تفصیل راقم کی کتاب 'اسلام کا عائلی نظام' ص ۷۱، ۷۲، طبع سوم، ۲۰۱۳ء میں دیکھی جاسکتی ہے۔

حرام قرار دیا ہے، کیوں کہ اس طرح ہوسکتا ہے کہ کوئی دنی الطبع اور سفلہ شعار اپنے جذبات کی آگ بجھالے، لیکن عورت اس سکون سے محروم ہوجائے گی جو باعفت زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم مَلْعُوْنٌ مَنْ اَتٰى اِمْرَأَةً فِىْ دُبُرِهَا.[1]

رسول اللہؐ نے فرمایا اللہ کی لعنت اور پھٹکار ہے اس شخص پر جو اپنی بیوی کے پاس پیچھے کے راستے سے آئے (لواطت کرے)۔

حضرت ابوہریرہؓ ہی کی ایک اور روایت ہے:

عَنِ النَّبِيِّ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ لاَ يَنْظُرُ اللّٰهُ اِلٰى رَجُلٍ جَامَعَ اِمْرَأَتَهٗ فِىْ دُبُرِهَا.[2]

وہ نبیؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ اس شخص کو دیکھے گا تک نہیں، جس نے اپنی بیوی کے ساتھ پیچھے سے مجامعت کی۔

اس ممانعت کی علت واضح کرتے ہوئے امام ابن قیمؒ تحریر فرماتے ہیں:

فَلِلْمَرْأَةِ حَقٌّ عَلَى الزَّوْجِ فِى الْوَطْيِ وَ وَطْؤُهَا فِىْ دُبُرِهَا يُفَوِّتُ حَقَّهَا وَ لاَ يَقْضِىْ وَطَرَهَا وَلاَ يُحَصِّلُ مَقْصُوْدَهَا وَ اَيْضًا فَاِنَّ الدُّبُرَ لَمْ يُتَهَيَّاء لِهٰذَا الْعَمَلِ وَلَمْ يُخْلَقْ لَهٗ وَ اِنَّمَا الَّذِىْ هُيِّءَ لَهُ الْفَرْجُ فَالْعَادِلُوْنَ عَنْهُ اِلَى الدُّبُرِ خَارِجُوْنَ عَنْ حِكْمَةِ اللّٰهِ وَ شَرْعِهٖ جَمِيْعًا.[3]

بیوی کا خاوند پر یہ حق ہے کہ وہ اس کے ساتھ فطری طریقہ پر ہم بستری کرے۔ عمل لواطت سے خاوند اس کے حق کو تلف کرتا ہے اور اس طبعی حاجت کو پورا نہیں کرتا اور نہ اس طریقہ سے عورت کا مقصد حاصل ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں، سرین اس گندے فعل کے لیے نہ تیار کی گئی اور نہ بنائی گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے تو صرف 'فرج' (شرم گاہ) ہے، پس جو لوگ خواہشِ نفس کے لیے اس فطری طریقہ کو چھوڑ کر غیر فطری طریقہ اختیار کرتے ہیں وہ اللہ کی حکمت اور اس کی شریعت سب سے خروج اختیار کرتے ہیں۔

---

[1] ابوداوٗد، کتاب النکاح، باب فی جامع النکاح۔ ترمذی، کتاب النکاح، باب ماجاء فی کراھیة ایتاء النساء فی ادبارھن۔ [2] ترمذی، کتاب النکاح، باب ماجاء فی کراھیة ایتاء النساء فی ادبارھن۔ ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب النھی عن اتیان النساء فی ادبارھن۔

[3] زاد المعاد: ۴/ ۲۶۲

احکام کی یہ سختی بلا وجہ نہیں ہے۔ اگر ازدواجی زندگی فرد کو عفت کی زندگی گزارنے میں مدد نہ دے اور اس کو اخلاق باختگی اور کردار کی پستی سے نہ بچا سکے تو یہ رشتہ ایک لغو اور مہمل رشتہ ہے۔ اس کے بعد یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ اسلام کا نظامِ معاشرت اپنے مطلوبہ ثمرات پیدا کر سکے گا۔ اس لیے شریعت ضروری سمجھتی ہے کہ نکاح زیادہ سے زیادہ عصمت کے تحفظ کا ذریعہ بنے۔

مقصد کے معاون اسباب

چناں چہ اس نے جائز حدود میں ایسی تمام صورتوں کو اختیار کرنے کی ترغیب دی ہے جو مقصدِ نکاح میں معاون ہوسکتی ہیں اور ان تمام طریقوں سے اجتناب کا حکم دیا ہے جو آدمی کو شادی شدہ ہونے کے باوجود بے شادی شدہ کی پوزیشن میں رکھتے ہیں۔

اس پہلو سے جب اسلام کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو حیرت ہوتی ہے کہ اس نے کتنی دقتِ نظر اور گہرائی سے نکاح کو محفوظ قلعہ میں تبدیل کر دیا ہے۔

اس وقت اس سلسلے کے بعض پہلوؤں کی طرف چند مجمل سے اشارات کیے جارہے ہیں۔

(۱) محبت اور دل بستگی جنسی تعلقات کی جان ہے۔ محبت ہی سے اس چمن کی بہار ہے۔ محبت کے بغیر ان تعلقات میں وہ کیفیت پیدا نہیں ہوتی جو مرد کو عورت کے لیے وجہِ سرور اور عورت کو مرد کے لیے سکونِ قلب کا باعث بناتی ہے۔ یہ انتہائی اہم بات ہے کہ متقابل جنس کے جن افراد کے درمیان طبعی مناسبت اور لگاؤ پایا جائے، شریعت ان کو نکاح کا مشورہ دیتی ہے۔ نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

لَمْ يُرَ لِلْمُتَحَابَّيْنِ مِثْلُ النِّكَاحِ[۱] — دو محبت کرنے والوں کے لیے نکاح سے بہتر اور کوئی چیز نہیں دیکھی گئی۔

---

[۱] ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب ماجاء فی فضل النکاح۔ حاکم، المستدرک: ۳/۱۶۸۔ اس میں کسی قدر ضعف ہے، لیکن یہ روایت حدیث کی متعدد کتابوں میں آئی ہے۔ ان کی اسناد پر علامہ ناصر الدین البانی نے تفصیل سے بحث کی ہے اور اسے صحیح قرار دیا ہے۔ سلسلۃ الاحادیث الصحیحہ: ۲/۱۹۶-۱۹۹

اس حدیث کا قطعاً یہ منشا نہیں ہے کہ جائز تعلقات سے قبل ہی عشق بازی اور آشنائی شروع کر دی جائے۔ اس کا تصور بھی اسلام کے مزاج پر بار ہے۔ جو دین کسی نامحرم کی طرف آنکھ اٹھانے تک کو غلط سمجھتا ہو وہ نظر بازی کی یا داستانِ حسن و عشق کہنے اور سننے کی کیسے اجازت دے سکتا ہے؟ درحقیقت یہ حدیث ہمارے سامنے دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ اگر کہیں فطری طور پر اسبابِ محبت موجود ہوں تو ان کو صحیح رُخ دے دیا جائے، تاکہ یہ اسبابِ محبت فرد اور معاشرہ کے لیے بجائے ضرر رساں ہونے کے سود بخش اور کارآمد بن جائیں۔ دوسرا پہلو یہ کہ مزاجوں کا اتحاد، تحفظ عصمت میں مددگار ہوتا ہے، کیوں کہ انسان کو جائز ذریعہ سے جتنی زیادہ وابستگی ہوگی، ناجائز ذرائع کی طرف اسی قدر اس کی توجہ کم ہوگی۔

(۲) جائز رشتوں میں دل کشی کو بڑھانے کے لیے شریعت سن وسال کی برابری کو بھی اہمیت دیتی ہے۔کیوں کہ عمروں کے بیّن تفاوت کے ساتھ تعلقات میں وہ جاذبیت مشکل ہی سے پیدا ہوسکتی ہے، جس کے بعد بے راہ روی کے لیے کوئی کشش نہ رہے۔

اس نفسیاتی حقیقت کی طرف ذیل کے دو واقعات اشارہ کررہے ہیں۔ حضرت جابرؓ نے اپنی جوانی میں ایک بیوہ سے شادی کی تو نبی ﷺ نے دریافت فرمایا:

فَهَلَّا جَارِيَةً تُلَاعِبُهَا وَ تُلَاعِبُكَ وَ تُضَاحِكُهَا وَ تُضَاحِكُكَ[1]	کیوں نہیں تم نے کسی دوشیزہ سے شادی کی کہ تم اس کے ساتھ کھیلتے اور وہ تمھارے ساتھ کھیلتی اور تم اس کے ساتھ ہنسی مذاق کرتے اور وہ تمھارے ساتھ مذاق کرتی۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت جابرؓ سے یہ بات اس لیے فرمائی کہ ہوسکتا ہے ایک بیوہ جس کے جذبات بڑی حد تک سرد ہو چکے ہوں اس آتشِ جذبات کی متحمل نہ ہوسکے جو ایک نوجوان کے سینہ میں شعلہ فگن ہے۔

---

[1] بخاری، کتاب النفقات، باب عون المرأۃ زوجھا فی ولدہ۔ اس کی تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو '**عورت اور اسلام**' عنوان: 'بہن کی خدمت و کفالت' ص ۴۲-۴۳، طبع ۲۰۱۴ء۔ ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔۲۵

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے نبی ﷺ سے درخواست کی کہ حضرت فاطمہؓ کا نکاح ان سے کر دیا جائے۔ آپؐ نے دونوں کی درخواست یہ کہہ کر رد کردی کہ وہ چھوٹی ہے۔ لیکن جب حضرت علیؓ نے یہی درخواست کی تو آپؐ نے قبول فرمالیا اور نکاح کر دیا، بلکہ بعض روایات کے مطابق خود نبی ﷺ نے حضرت علیؓ سے اس کی پیش کش کی تھی۔

اس واقعہ پر امام نسائی نے اپنی سنن میں باب باندھا ہے ''تزوج المرأة مثلها فی السن'' (عورت کا اپنے ہم سن مرد سے شادی کرنا) یعنی یہ مناسب اور اولیٰ ہے۔

امام نسائی کا یہ استدلال اس غرض سے پوری مطابقت رکھتا ہے، جس کے لیے شریعت نے نکاح پر زور دیا ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک اس کی تردید کی کوئی وجہ نہیں ہے، الّا یہ کہ شریعت کے عظیم تقاضے سن و سال کے فرق کو نظر انداز کرنے پر مجبور کرتے ہوں۔[1]

(۳) شریعت اس مقصد کی خاطر نامحرم عورت کو دیکھنے تک کی اجازت دیتی ہے، تاکہ آدمی اپنے جذبِ خاطر اور رغبت و شوق کا فیصلہ کر سکے کہ آیا یہ رشتہ عفت کی زندگی گزارنے میں معاون ہوسکتا ہے یا نہیں؟

عَنِ الْمُغِيْرَةِ بْنِ شُعْبَةَ ؓ اَنَّهٗ خَطَبَ اِمْرَأَةً فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ اُنْظُرْ اِلَيْهَا فَاِنَّهٗ اَحْرٰى اَنْ يُّؤْدَمَ بَيْنَكُمَا[2]

مغیرہ بن شعبہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک عورت سے نسبت کی تو آں حضرتؐ نے فرمایا: اسے دیکھ لو کیوں کہ یہ تم دونوں کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی بہتر صورت ہے۔

''یہ تم دونوں کے درمیان موافقت پیدا کرنے کی بہتر صورت ہے'' کے الفاظ

---

[1] مرد اور عورت کے درمیان سن و سال کا تفاوت عقد نکاح میں مانع نہیں ہے۔ کبھی مرد کی عمر زیادہ ہوسکتی ہے اور کبھی عورت کی۔ اس طرح کے عقد میں بعض اوقات جنسی محرکات بھی ہوتے ہیں اور کبھی معاشی اور معاشرتی اسباب بھی اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ اس فرق کو نظر انداز کیا جائے۔

[2] ترمذی، ابواب النکاح، باب ماجاء فی النظر الی المخطوبۃ۔ نسائی، ابواب النکاح، ابن ماجہ، ابواب النکاح، باب النظر الی المرأۃ اذا اراد ان یتزوجھا۔

صاف ظاہر کر رہے ہیں کہ شریعت چاہتی ہے کہ زوجین کے درمیان رشتۂ محبت محکم سے محکم تر ہو اور اس میں کوئی ایسا پیچ نہ آنے پائے، جس سے نکاح کی غرض کو دھکا لگتا ہو۔ کیوں کہ زوجیت کی دنیا میں اختلاف و نفرت کے راہ پانے کے بعد حریفِ عصمت طاقتیں بہ آسانی حملہ آور ہوسکتی ہیں۔ چناں چہ یہی وجہ ہے کہ آں حضرت ﷺ نے ایسا نکاح فسخ کردیا، جس میں عورت اپنے خاوند کی بدصورتی کی وجہ سے اس کی رفاقت پر آمادہ نہیں تھی۔[1]

(۴) اس کشش و جاذبیت کو فزوں تر کرنے کے لیے اسلام ازدواجی زندگی میں عورت کے لیے زینت و آسائش کو مستحسن سمجھتا ہے، جب کہ وہ کسی نامحرم کے سامنے عورت کو زیب و زینت سے آراستہ ہوکر آنے اور بناؤ سنگار کی نمائش کرنے کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ پہلی صورت میں صنفی کشش کو تقویت دینا چاہتا ہے اور دوسری صورت میں اس کا منشا یہ ہے کہ اسے کم زور سے کم زور تر کردیا جائے۔

دورِ اول کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ عورتیں اپنے خاوندوں کی خاطر زیب و زینت کا سامان کیا کرتی تھیں۔ اس کا ثبوت اس واقعہ سے ملتا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت عائشہؓ نے عثمان بن مظعونؓ کی بیوی کو ان اسبابِ زینت سے خالی پایا جن سے اس دور کی عورت، شوہر کی موجودگی میں بالعموم آراستہ ہوتی تھی۔ آپؓ نے فوراً دریافت فرمایا: کیا عثمانؓ کہیں سفر پر گئے ہوئے ہیں؟[2]

اس حدیث کی شرح میں امام شوکانیؒ فرماتے ہیں:

وَ اِسْتِنْکَارُ عَائِشَةَ عَلَیْهَا تَرْکَ الْخِضَابِ وَالطِّیْبِ یُشْعِرُ بِاَنَّ ذَوَاتِ الْاَزْوَاجِ یَحْسُنُ مِنْهُنَّ التَّزَیُّنُ لِلْاَزْوَاجِ بِذٰلِکَ.[3]	خضاب اور خوش بو کے چھوڑ دینے پر حضرت عائشہؓ کا اُن سے تعجب کے ساتھ سوال کرنا یہ ظاہر کرتا ہے کہ سہاگنوں کو اپنے شوہروں کی خاطر زیب و زینت کرنا پسندیدہ ہے۔

[1] بخاری، باب الخلع وکیف الطلاق فیہ؟ مع فتح الباری: ۱۰/ ۵۰۲

[2] مسند احمد: ۷/ ۱۵۴، حدیث نمبر ۲۴۲۳۲ [3] نیل الاوطار: ۶/ ۳۴۴

رسولِ خدا ﷺ کا ارشاد ہے کہ آدمی جب کسی دور کے سفر سے واپس ہو تو مکان میں اچانک نہ داخل ہو، کیوں کہ اس صورت میں ممکن ہے کہ ایسے ملگجے پن اور ناپسندیدہ وضع قطع میں، گھر والوں پر اس کی نظر پڑے جو نفرت کا موجب ہو۔

حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک غزوہ سے واپسی کے بعد ہم اپنے گھر جانے لگے تو آپؐ نے فرمایا:

اَمۡهِلُوۡا حَتّٰی تَدۡخُلُوۡا لَيۡلاً اَیۡ عِشَاءً لِكَیۡ تَمۡتَشِطَ الشَّعِثَةُ وَ تَسۡتَحِدَّ الۡمُغِيۡبَةُ[1]

ابھی رک جاؤ اور رات کو اپنے اپنے گھر جاؤ تاکہ جس عورت نے کنگھی چوٹی نہیں کی ہے وہ کنگھی چوٹی کرلے اور جس عورت کا شوہر غائب تھا وہ غیر ضروری بال صاف کرلے (اور نہا دھو کر صاف ستھری ہو جائے)۔

(۵) اسلام نے جس طرح مرد کے جذبات کا پاس و لحاظ رکھا ہے اسی طرح وہ عورت کے جذبات کے احترام کی بھی تعلیم دیتا ہے۔ اس نے مختلف اسالیب سے اس حقیقت کی وضاحت کی ہے کہ عورت نہ تو محض شہوت رانی اور تکمیل ہوس کا کوئی آلہ ہے اور نہ وہ احساسات سے خالی کوئی مضغۂ گوشت ہے، بلکہ اس کا دل لطیف ترین احساسات کا نشیمن ہے، جو ایسے ہی لطافتِ اعمال اور نزاکتِ کردار کے متقاضی ہیں۔ معاملات کی ناہمواری اور کرختگی اس کے جذبات کے آبگینوں کو چور چور کرسکتی ہے، پھر وہ ایک پتھر بن جائے گی جسے توڑا تو جاسکتا ہے لیکن اس سے وہ نگینہ نہیں تراشا جاسکتا، جس کی تابانی قلب و نظر کو اپنا گرویدہ کرلے اور معصیت کے ہر نظارے سے دلکشی چھین لے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

اِنَّ الۡمَرۡأَةَ كَالضِّلَعِ اِذَا ذَهَبۡتَ تُقِيۡمُهَا كَسَرۡتَهَا وَ اِنۡ تَرَكۡتَهَا

عورت پسلی کی مانند ہے۔ اگر تم اسے سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو اِسے توڑ دوگے

---

[1] بخاری، کتاب النکاح، باب طلب الولد۔ مسلم، کتاب الرضاع، باب استحباب نکاح البکر

اِستَمتَعتَ بِھَا وَ فِیھَا عِوَجٌ۔[1] لیکن اگر اسے اپنے حال پر چھوڑ دوگے تو اس کی کجی کے باوجود اس سے فائدہ حاصل کرسکوگے۔

ایک اور موقعے پر آپؐ نے فرمایا:

لاَ یَجلِدُ اَحَدُکُم اِمرَأَتَہٗ جَلدَ العَبدِ ثُمَّ یُجَامِعُھَا فِی اٰخِرِ الیَومِ[2] ایسا نہ ہو کہ تم میں سے کوئی اپنی بیوی کو غلام کی طرح پیٹنے لگے اور پھر شام کو اسی سے ہم بستری کرے۔

عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ میں اپنی بیوی کے (ذوقِ تسکین) کے لیے آراستہ پیراستہ رہنا پسند کرتا ہوں، جیسا کہ خود میری خواہش ہے کہ وہ میرے لیے زیب و زینت کے ساتھ رہے۔[3]

(۶) زوجین کے باہمی تعلقات کے سلسلے میں اسلام نے حسنِ خلق اور بلند کرداری کی جو تعلیم دی ہے اس کی بھی ایک اہم غرض یہی ہے کہ دونوں کی باہمی آویزش اور کشیدگی اس جاذبیت کو ختم نہ کردے جو صنفی آوارگی سے بچائے رکھتی ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی سیرت ہمیں بتاتی ہے کہ آپ نے ازواجِ مطہرات کے ساتھ ایسے امور میں دلچسپی لی جو بہت ممکن ہے زہد و اتقا کے عام تصور کے خلاف معلوم ہوں، لیکن در حقیقت ان سے ازدواجی تعلقات میں شگفتگی اور حسن پیدا ہوتا ہے۔

اس قسم کے چند واقعات ہم ذیل میں درج کر رہے ہیں، جن سے ہر شخص ان کی تہ میں کارفرما روح کا اندازہ لگا سکتا ہے۔

ایک مرتبہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عائشہؓ کو گیارہ عورتوں کی ایک دلچسپ

۱؎ بخاری، باب النکاح، باب المداراۃ مع النساء۔ مسلم کتاب الرضاع، باب الوصیۃ بالنساء۔ ترمذی ابواب الطلاق واللفظ لمسلم۔

۲؎ بخاری، کتاب النکاح، باب ما یکرہ من ضرب النساء

۳؎ بیہقی، السنن الکبریٰ: ۷/ ۴۸۲

کہانی سنائی، جن میں سے بیشتر نے اپنے شوہروں کی شکایت کی تھی، لیکن گیارہویں (ام زرع) نے کہا کہ میں اپنے شوہر ابوزرع کی کیا مدح وتوصیف کرسکتی ہوں۔ انھوں نے میرے کانوں کو زیورات سے ڈھک دیا اور میرے دبلے پتلے بازوؤں کو پرگوشت بنا دیا۔ غرض مجھے خوش وخرم رکھنے کا اتنا سامان کیا کہ میری زندگی مسرت سے گزرنے لگی۔ میری خوش بختی کا کیا کہنا، میں بکریوں والے (کم حیثیت) خاندان میں عسرت کی زندگی گزار رہی تھی۔ مجھے انھوں نے گھوڑے، اونٹ اور کھیتی باڑی والے لوگوں میں بسایا۔ میں ان سے بے تکلف گفتگو کرتی، لیکن کبھی انھوں نے میری زبان نہیں پکڑی۔ میں بلا کسی خوف کے صبح تک آرام کرتی اور لذیذ ترین کھانے اور پینے کی چیزیں سیر ہوکر کھاتی پیتی ہوں۔

اس کے بعد آپؐ نے حضرت عائشہؓ سے فرمایا: میں تمھارے حق میں ابوزرع ہوں[1]

ایک موقع پر حضرت عائشہؓ نے اپنے بارے میں ایک دلچسپ تمثیل نبی ﷺ کے سامنے پیش کی تھی۔ یا رسول اللہ! بتایئے! اگر درختوں والی وادی میں آپ کا گزر ہو تو کیا آپ بکریوں کو کسی برگ دار درخت کے پاس چراتے یا ایسے پیڑ کے پاس جسے جانوروں نے صاف کر دیا ہو؟ آپؐ نے جواب دیا: پتوں والے درخت ہی کے پاس چراتا[2]

(رسول اللہ ﷺ کی ازواج مطہرات میں صرف حضرت عائشہؓ باکرہ تھیں، باقی سب بیوہ تھیں۔ غور کیجیے، یہ کنایہ مزاج کے حسن اور لطافت ذوق کی کتنی عمدہ دلیل ہے)

۱؎ اس حدیث کو امام بخاری (کتاب النکاح، باب حسن المعاشرۃ مع الاہل) امام مسلم اور نسائی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ پوری کہانی، نبی ﷺ نے سنائی اور بعض روایات ظاہر کرتی ہیں کہ نبی ﷺ نے صرف آخری فقرہ ارشاد فرمایا۔ حافظ ابن حجر کی تحقیق میں یہ مکمل داستان نبی ﷺ ہی کی زبان مبارک سے ادا ہوئی تھی۔ (فتح الباری: ۱۰/ ۳۱۹، ۳۲۰)

۲؎ بخاری، کتاب النکاح، باب نکاح الابکار۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ ایک سفر میں، میں نے حضورِ اکرم ﷺ کے ساتھ دوڑ لگائی۔ میں اس وقت دبلی پتلی تھی، اس لیے آگے نکل گئی۔ اس کے کچھ عرصہ کے بعد ہم دونوں میں پھر مسابقت ہوئی تو میں پیچھے رہ گئی، کیوں کہ میں ان دنوں فربہ ہوگئی تھی۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: لو! ہم نے پہلے کا بدلہ چکا دیا۔[1]

صحاح کی مشہور روایت ہے کہ کسی عید میں حبشی، کھیل کود کی نمائش کر رہے تھے تو نبی ﷺ نے خود حضرت عائشہؓ سے دریافت کیا کہ کیا تماشا دیکھوگی؟ یا یہ کہ خود حضرت عائشہؓ نے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو آپؐ نے انھیں اپنے پیچھے کھڑا کرلیا۔ جب حضرت عائشہؓ اکتا گئیں تو آپؐ نے کہا: اچھا تو اب چلی جاؤ۔[2]

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ گوشت سے بھری ہوئی ہڈی تھوڑی سی کھا کر میں نبی ﷺ کو دیتی تھی اور آپؐ اسے اسی جگہ سے تناول فرماتے جہاں سے میں نے چھوڑا تھا۔ اسی طرح کوئی چیز پی کر آپ کی طرف بڑھاتی اور آپ اپنا دہنِ مبارک پیالے کے اسی حصہ کو لگا کر پیتے جہاں سے میں نے پیا تھا۔[3]

اس قسم کے واقعات اگر جمع کیے جائیں تو ایک مستقل کتاب تیار ہوسکتی ہے، لیکن یہ چند مثالیں بھی اس بات کا بہ آسانی ثبوت فراہم کرتی ہیں کہ اسلام ازدواجی زندگی کو کوئی ضابطہ کی بندش نہیں بنانا چاہتا، بلکہ وہ اس میں اتنی رنگا رنگی اور جمال آرائی پیدا کر دیتا ہے کہ وہ خود ایک عالمِ کیف و سرور بن جاتی ہے صنفی داعیات میں سے کوئی ایسا داعیہ نہیں ہے، جس کا ازدواجی رشتہ میں اس نے سامان نہ کیا ہو۔

احتیاطی تدابیر

اس کے باوجود یہ ایک حقیقت ہے کہ جنسی تقاضے ایسے طوفان کی حیثیت رکھتے

---

[1] مسند احمد: ۷/۶۰، حدیث نمبر ۲۳۵۹۸۔ ابو داؤد، کتاب الجهاد، باب فی السبق علی الرجال۔
[2] بخاری، کتاب العیدین، باب الحراب والدرق یوم العید۔ مسلم، کتاب العیدین۔
[3] مسند احمد: ۷/۹۱، ۹۲۔ حدیث نمبر ۲۳۸۰۷

ہیں، جس کے بارے میں فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ وہ کس وقت، سیرت و کردار کی دنیا کو تہ و بالا کر کے رکھ دے، اس لیے شریعت، بعض ایسی احتیاطی تدابیر کے اختیار کرنے کا حکم دیتی ہے جو معصیت کی راہ کو تنگ سے تنگ کرنے والی ہیں اور جن پر عمل پیرا ہوکر انسان بڑی حد تک جنسی آلودگیوں سے دامن کش رہ سکتا ہے۔

قرآن نے اس سلسلہ میں ایک اہم اصول ہمیں عطا کیا ہے:

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنٰٓی اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً ؕ وَ سَآءَ سَبِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل:۳۲)

زنا کے قریب نہ جاؤ کیوں کہ وہ بے حیائی اور بری راہ ہے۔

غور کیجیے! زنا سے اجتناب کی تعلیم کے لیے کتنا اچھوتا اسلوب اختیار کیا گیا ہے!، اس اندازِ بیان نے انسانی نفسیات کے ایسے گوشوں کی طرف اشارہ کیا ہے، جن کی عدم رعایت سے موجودہ دور فواحش کا دور بن گیا ہے۔ قرآن صرف زنا سے ملوث نہ ہونے ہی کا حکم نہیں دیتا، بلکہ ان تمام صورتوں سے بھی احتراز کا حکم دیتا ہے جو بظاہر کتنی ہی معصوم اور بے ضرر کیوں نہ معلوم ہوں، لیکن بالآخر اس عملِ بد تک پہنچانے والی ہیں۔

اگر آپ انسانی اعمال کا ذرا ژرف نگاہی سے تجزیہ کریں تو وہ آپ کو مربوط اور منظّم معلوم ہوں گے اور ان میں ایک طرح کا تدریجی ارتقا ملے گا۔ ایسا نہیں ہوتا کہ آدمی ایک ہی جست میں نیکی اور تقویٰ کے تمام مراحل طے کرلے یا گناہ کی آخری سرحد پر پہنچ جائے۔ بلکہ اس کا ہر پہلا قدم، دوسرے قدم کے لیے محرک کا کام دیتا ہے، جس طرح داخلی اور خارجی عوامل انسان کے فکر و خیال پر اثر انداز ہوتے ہیں، اسی طرح اس کے اپنے اعمال بھی اس کے مزاج اور داخلی کیفیات کو متاثر کرتے ہیں۔ ایک شخص جھوٹ بولتا ہے، فریب دیتا ہے، اور خیانت کرتا ہے تو یہ اعمال اس کی اگلی پچھلی زندگی سے بے تعلق نہیں ہوتے۔ ان میں ماضی کی جھلک اور مستقبل کا نشان ملتا ہے۔ وہ اس کے اگلے اقدامات کے لیے سمت سفر متعین کرتے ہیں اور ان میں ممد و معاون ہوتے ہیں۔ یہی حال نیکی کا ہے۔ اس کی ہر منزل دوسری منزل تک پہنچانے والی اور اس کو

آسان کرنے والی ہوتی ہے۔

اسلام انتہائی باریک بینی کے ساتھ نشان دہی کرتا ہے کہ آدمی کن حدود کے اندر اپنی خواہشات اور جذبات کی تسکین کر سکتا ہے اور کہاں سے تباہی و بربادی کی سرحدیں شروع ہوجاتی ہیں۔ چناں چہ اس نے ان اعمال و افعال ہی کو ممنوع نہیں قرار دیا جو انسانیت کے لیے مہلک ہیں، بلکہ ان تمام راہوں پر بھی قدغن لگائی ہے، جو تباہی کا پیش خیمہ ہیں اور جن پر چلنے والا کسی گھناؤنے نتیجہ سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

یہ موقع ان مباحث کی تفصیل کا نہیں ہے۔ ہم اپنے موضوع کی مناسبت سے چند ایسی پیش بندیوں کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں، جن پر شریعت نے خاص زور دیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے، جسے حضرت ابو ہریرہؓ نے نقل فرمایا ہے:

كُتِبَ عَلَى ابْنِ اٰدَمَ نَصِيْبُهٗ مِنَ الزِّنىٰ مُدْرِكٌ ذٰلِكَ لاَ مَحَالَةَ فَالْعَيْنَانِ زِنَا هُمَا النَّظَرُ وَالْاُذُنَانِ زِنَا هُمَا الْاِسْتِمَاعُ وَاللِّسَانُ زِنَاهُ الْكَلَامُ وَالْيَدُ زِنَاهَا الْبَطْشُ وَالرِّجْلُ زِنَاهَا الْخُطَا وَالْقَلْبُ يَهْوٰى وَ يَتَمَنّٰى وَ يُصَدِّقُ ذٰلِكَ الْفَرْجُ وَ يُكَذِّبُهٗ۔[1]

انسان پر زنا کا جو حصہ لکھ دیا گیا وہ ضرور اس کا ارتکاب کرکے رہے گا۔ (اس کی مختلف صورتیں ہیں) آنکھوں کا زنا (حرام چیزوں کو) دیکھنا ہے، کانوں کا زنا (گندی باتوں کو) توجہ سے سننا ہے، زبان کا زنا (اس سلسلے میں) اس کا بولنا ہے، ہاتھ کا زنا پکڑنا اور پیر کا زنا اس طرف چلنا ہے۔ دل کا زنا یہ کہ وہ خواہش اور تمنا کرتا ہے اور آخر میں شرم گاہ اس کے اقدامات کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہے۔

معصیت کے محرکات معصیت کی راہ کھولتے ہیں۔ زنا کے ابتدائی اقدامات زنا

---

[1] بخاری، کتاب الاستیذان، باب زنیٰ الجوارح دون الفرج۔ کتاب، القدر، باب حرام علی قریۃ الآیۃ۔ مسلم، کتاب القدر، باب قدر علی ابن آدم حظہ من الزنا واللفظ لمسلم۔ امام ابوداؤد نے حدیث کے مختلف ٹکڑوں کو مختلف سندوں سے نقل کیا ہے۔ کتاب النکاح، باب مایؤمر بہ من غض البصر۔

کی طرف لے جاتے ہیں، اس لیے انھیں بھی زنا سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ان سے پوری طرح بچنا گو مشکل ہے، لیکن آدمی ان کے زنا ہونے کا تصور کرے تو اس سے دامن کش رہ سکتا ہے۔

قرآن و حدیث میں بہت تفصیل سے محرکات زنا سے دور رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔ یہاں اس کے بعض پہلوؤں کو پیش کیا جا رہا ہے۔

غضِّ بصر

قدرت نے انسان کے اندر ذوقِ جمال پیدا کیا ہے، اس لیے وہ کائنات کے ایک ایک ذرّہ میں نکھار اور جمال کا متلاشی ہے۔ وہ دنیا کی کسی بھی شے کو بے ڈھب اور بے ہنگم حالات میں نہیں، بلکہ حسن و خوب صورتی کے قالب میں دیکھنا چاہتا ہے۔ وہ شب و روز قدرت کے دلکش مناظر سے کیف و سرور حاصل کرتے ہوئے اکتاتا نہیں، کیوں کہ وہ حسین ہیں، ان میں دل رُبائی اور زیبائی ہے۔ اسی ذوق کی جلوہ گری تمدن کے مختلف مظاہر میں دیکھی جاتی ہے۔

یقیناً یہ ذوق انسان کا ایک فطری ذوق ہے اور اس کی تکمیل نہ کرنا فطرت کے ساتھ زیادتی اور اس پر ظلم کے مترادف ہوگا۔ انسان اس ذوق سے محروم ہوتو دنیا تمدن کے ان بے شمار فوائد سے محروم ہوجائے گی، جن سے آج وہ مالا مال ہے۔ لیکن ذوق جمال اسی وقت تک خیر اور افادیت کا حامل رہتا ہے، جب تک کہ وہ حدِّ اعتدال میں رہے۔ اس کی بے اعتدالی زندگی کے اور میدانوں کی طرح صنفی خواہش کے میدان میں بھی ظاہر ہوتی ہے اور یہ زیادہ خطرناک ہے، اس لیے کہ مقابل صنف کا رُخ زیبا جتنی سرعت کے ساتھ انسان کو کج رو بنا سکتا ہے اتنی تیزی سے حسن و جمال کا اور کوئی مظہر اس کو فساد کی طرف نہیں لے جاسکتا۔ اس کی ایک وجہ تو خود انسان کی ساخت کا حسن ہے کہ وہ اس قدر متناسب الاعضا اور موزوں قد و قامت کا مالک ہے کہ اس کی کوئی دوسری مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ دوسری اہم ترین وجہ یہ ہے کہ جنس مقابل اپنے قد و

قامت کی درستی اور بناوٹ کی خوب صورتی کے ساتھ انسان کے ایک زبردست داعیہ کی تسکین کا مرکز ہوتی ہے اور وہ بے اختیار اس کی طرف رغبت اور کشش محسوس کرتا ہے۔ اس لیے شریعت جنس مقابل کے نظارے سے روکتی ہے، کیوں کہ نظر کی آوارگی کے بعد جنسی آوارگی سے محفوظ رہنا انتہائی مشکل ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے:

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ○ وَ قُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ (النور: ۳۰، ۳۱)

(اے نبیؐ!) تم مومنوں سے کہہ دو کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔ یہ اُن کے حق میں بہت بہتر ہے اور بلاشبہ اللہ، جو کچھ وہ کرتے ہیں اس سے باخبر ہے اور ایمان والی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ (بھی) اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کریں۔

قرآن مجید نے غضِ بصر اور شرم گاہ کی حفاظت کا بالکل ایک ساتھ ذکر کیا ہے۔ گویا پاک دامنی کے لیے نظر کی پاکی پہلی شرط ہے۔

احادیث میں غضِ بصر اور بد نگاہی سے بچنے کی بڑی تاکید ہے۔ ایک حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ سے فرمایا:

يَا عَلِيُّ لاَ تُتْبِعِ النَّظْرَةَ النَّظْرَةَ فَاِنَّ لَكَ الْاُوْلٰى وَ لَيْسَتْ لَكَ الْاٰخِرَةُ۔[1]

اے علی! (رضی اللہ علیہ) نظر کے پیچھے نظر نہ دوڑاؤ، کیوں کہ پہلی (اتفاقی) نظر تو تمھارے لیے معاف ہوسکتی ہے، لیکن دوسری کا کسی طرح تمھیں حق نہیں پہنچتا۔

یعنی پہلی نگاہ اتفاقی ہوتی ہے، اس لیے قابل عفو و درگزر ہے، لیکن اس کے بعد جو نگاہ اٹھے گی اس میں قصد و ارادہ شامل ہوگا۔ اس کی اجازت نہیں ہے۔ نظر بازی وہ شیطانی تیر ہے جو شرافت و اخلاق کو چھلنی کر کے رکھ دیتی اور آدمی کو غلط رخ پر لے

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب مایؤمر بہ من غض البصر۔ ترمذی، ابواب الآداب، باب ماجاء فی نظرۃ المفاجاۃ۔

جاتی ہے۔

حضرت جریر بن عبد اللہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے نبی ﷺ سے دریافت کیا: اگر کسی نامحرم پر اچانک نظر پڑ جائے تو کیا کیا جائے؟ آپؐ نے جواب دیا: ''فوراً اپنی نظر پھیر لو۔''[1]

محرمات کے ساتھ اختلاط کی شریعت اس لیے اجازت دیتی ہے کہ یہاں بالعموم جذباتِ محبت موج زن ہوتے ہیں۔ اگر کوئی دیوّث، ان جذباتِ محبت کو ہوس اور شہوت کی آگ میں تبدیل کر کے نظر اٹھاتا ہے تو شریعت کی نگاہ میں وہ حرام کا ارتکاب کرتا ہے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

فَلَوْ نَظَرَ اِلٰی اُمِّهٖ وَ اُخْتِهٖ وَ ابْنَتِهٖ يَتَلَذَّذُ بِالنَّظْرِ اِلَيْهَا كَمَا يَتَلَذَّذُ بِالنَّظْرِ اِلٰی وَجْهِ الْمَرْاَةِ الْاَجْنَبِيَّةِ كَانَ مَعْلُوْمًا لِكُلِّ اَحَدٍ اَنَّ هٰذَا حَرَامٌ[2]

اگر کوئی شخص اپنی ماں، بہن بیٹی کو اس خیال سے دیکھتا ہے کہ ان سے لذت حاصل کرے، جس طرح وہ ایک اجنبی عورت کو دیکھ کر لذت یاب ہوتا ہے تو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ حرام ہے۔

سماع پر پابندی

سمع و بصر انسان کے بہترین ذرائع علم بھی ہیں اور ان سے وہ لذت بھی حاصل کرتا ہے۔ بینائی کی طرح قوتِ سامعہ بھی انسان کے جذبات و احساسات پر گہرے اثرات ڈالتی ہے۔ وہ نفع بخش بھی ثابت ہوسکتی ہے اور نقصان دہ بھی۔ کسی قانون کی کامیابی یہ ہے کہ اس کے سود و زیاں کے خطوط کو واضح الفاظ میں نمایاں

---

[1] مسلم، کتاب الادب، باب نظرۃ الفجأۃ۔ ترمذی، ابواب الآداب۔ باب ماجاء فی نظرۃ الفجأۃ۔ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب ما یومر بہ من غض البصر۔

[2] فتاویٰ ابن تیمیہ: جلد ۱، ص ۴۹، طبع قدیم

کردے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو صاف صاف بتاتا ہے کہ وہ اس چمنستانِ عالم کے ہر حسین نغمہ سے اپنے ذوقِ سماع کو بہرہ یاب کرسکتے ہیں، اِلّا یہ کہ وہ مہیج شہوت اور غارت گرِ اخلاق ہو۔ کیوں کہ عفت اور کردار کی پاکیزگی، انسانیت کا تاج ہے۔ اس کے لیے دنیا کے ہر نشاط و سرور کو قربان کیا جاسکتا ہے، لیکن کسی عیش و راحت کے عوض اس کی سودے بازی نہیں ہوسکتی۔ اسی لیے اس کے نزدیک موسیقی اور آلاتِ موسیقی کے استعمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اس معاملہ میں اسلام کے موقف کی وضاحت سورۂ لقمان کی ایک آیت سے ہوتی ہے۔ جو لوگ حق کی مخالفت کر رہے ہیں اور دوسروں کو اس سے باز رکھنا چاہتے ہیں انھوں نے اس کے لیے 'لھو حدیث' کو ذریعہ بنایا ہے۔

وَ مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡتَرِیۡ لَھۡوَ الۡحَدِیۡثِ لِیُضِلَّ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ بِغَیۡرِ عِلۡمٍ وَّ یَتَّخِذَھَا ھُزُوًا ؕ اُولٰٓئِکَ لَھُمۡ عَذَابٌ مُّھِیۡنٌ ○	لوگوں میں بعض وہ ہیں جو 'لہو الحدیث' (کھیل کی باتوں) کو خریدتے ہیں، تاکہ اللہ کے راستے سے بے سمجھے گم راہ کریں اور اسے مذاق بنا لیں۔ ان کے لیے رسوا کن عذاب ہے۔ (لقمان:۶)

'لہو الحدیث' میں دین کا مذاق اور استہزاء، بے معنی گفتگو، گندہ لٹریچر، فحش گانے اور نغمے، موسیقی کے آلات، ناچنے اور گانے کا پیشہ، اسے اختیار کرنے والے مغنی اور مغنیات جیسی وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں، جو خدا اور رسول کے دین سے انسان کو غافل کر دیتی ہیں۔ اس کے لیے آدمی اپنا پیسہ بھی صرف کرتا ہے اور کم از کم اسے تفریح کا ذریعہ سمجھتا اور اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ غنا اور موسیقی انسان کو خدا سے غافل کرتی اور دینِ حق سے پھیرتی ہے، اس لیے علماء نے اس میں دلچسپی سے منع کیا ہے[1]

گانے سے دلچسپی اور اس کے سماع سے کیوں منع کیا گیا ہے اس کی نفسیاتی توجیہ کے لیے ہم اس وقت حافظ ابن جوزیؒ کے الفاظ مستعار لیتے ہیں:

---

[1] تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو۔ قرطبی، الجامع لاحکام القرآن، جلد ۷ جزء ۱۴ ص ۳۶-۳۹

اِعْلَمْ اَنَّ سِمَاعَ الْغِنَاءِ يَجْمَعُ شَيْئَيْنِ اَحَدُهُمَا اَنَّهٗ يُلْهِى الْقَلْبَ عَنِ التَّفَكُّرِ فِىْ عَظْمَةِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ وَ الْقِيَامِ بِخِدْمَتِهٖ وَالثَّانِىْ اَنَّهٗ يُمِيْلُهٗ اِلَى اللَّذَّاتِ الْعَاجِلَةِ الَّتِىْ تَدْعُوْ اِلٰى اسْتِيْفَائِهَا مِنْ جَمِيْعِ الشَّهْوَاتِ الْحِسِّيَّةِ وَ مُعْظَمُهَا النِّكَاحُ وَ لَيْسَ تَمَامُ لَذَّتِهٖ اِلَّا فِى الْمُتَجَدِّدَاتِ وَلَا سَبِيْلَ اِلٰى كَثْرَةِ الْمُتَجَدِّدَاتِ مِنَ الْحِلِّ فَلِذٰلِكَ يَحُثُّ عَلَى الزِّنَا فَبَيْنَ الْغِنَآءِ وَالزِّنَا تَنَاسُبٌ مِنْ جِهَةِ اَنَّ الْغِنَآءَ لَذَّةُ الرُّوْحِ وَالزِّنَا اَكْبَرُ لَذَّاتِ النَّفْسِ وَ لِهٰذَا جَاءَ فِى الْحَدِيْثِ الْغِنَاءُ رُقْيَةُ الزِّنَا[1]

معلوم ہونا چاہیے کہ گانا سننے سے دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ پہلی یہ کہ گانا آدمی کو خدا کی عظمت میں تفکر اور اس کی خدمت سے غافل کر دیتا ہے۔ دوسری خرابی گانے کی یہ ہے کہ وہ آدمی کو دنیوی لذتوں کی طرف مائل کر دیتا ہے جو اس کی تمام مادی خواہشات کی تکمیل پر مجبور کرتے ہیں۔ ان خواہشات میں سرِ فہرست نکاح کی خواہش یعنی صنفی خواہش ہے اور صنفی خواہش کی پوری طرح آسودگی نئے نئے تعلقات کا تقاضا کرتی ہے، جس کی جائز حدود میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ موسیقی آدمی کو زنا پر اُکساتی ہے۔ پس گانے اور زنا کے درمیان ایک طرح کی مناسبت ہے، بایں طور گانا روح کی لذت ہے تو زنا نفس کی ایک بڑی لذت ہے، اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ گانا آدمی کو زنا کی طرف لے جانے میں جادو کا حکم رکھتا ہے۔

زبان کی حفاظت

زبان کے معاملہ میں انسان بہت ہی بے احتیاط واقع ہوا ہے، حالاں کہ جو کلمات ہماری زبان سے نکلتے ہیں وہ فضا میں تحلیل ہوکر نہیں رہ جاتے، بلکہ ہمارے افکار و خیالات پر عکس ریز ہوتے ہیں اور زبان کے یہ اثرات سمع و بصر کے اثرات سے بھی زیادہ اپنے اندر وسعت اور گہرائی رکھتے ہیں، کیوں کہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جو چیز آپ کے لیے باصرہ نواز اور راحتِ گوش ثابت ہو رہی ہو وہ خود کو بھی کسی تاثر کے حوالے

---

[1] ابن جوزی، نقد العلم والعلماء، صفحہ ۲۳۷

کردے اور دوسرے بھی اس کے زیر اثر آتے چلے جائیں۔ برعکس اس کے زبان اظہارِ خیال کا ایسا ذریعہ ہے جس کے توسط سے آدمی اپنے اچھے برے خیالات کا پرتو اپنے مخاطب پر ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر اس کوشش کے نتیجہ میں مخاطب کا ردعمل اس کے موافق ہو تو اس کے خیالات کو مزید تقویت پہنچتی ہے اور وہ انفرادیت کے دائرے سے نکل کر اجتماعی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور اسی تناسب سے ان کی قوت میں بھی اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

گویائی کی یہ عظیم قوت راہ راست سے ہٹ جائے اور جذبات جیسے نازک اور کم زور گوشوں پر حملہ آور ہو تو اس کی فتنہ سامانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

عَنْ سَهْلِ بْنِ سَعْدٍؓ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم قَالَ مَنْ يَّضْمَنُ لِيْ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَ مَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنُ لَهُ الْجَنَّةَ۔[1]	حضرت سہل بن سعد رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا: جو شخص اپنی زبان اور اپنی شرم گاہ کی حفاظت کی مجھے ضمانت دے، میں اس کو جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔

ایک اور موقعے پر آپؐ نے فرمایا:

مَنْ وَقَاهُ اللّٰهُ شَرَّ مَا بَيْنَ لِحْيَتِهٖ وَ شَرَّ مَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ دَخَلَ الْجَنَّةَ۔[2]	جس شخص کو اللہ تعالیٰ زبان اور شرم گاہ کے شر سے بچالے وہ جنت میں داخل ہوجائے گا۔

لباس کا اہتمام

عریانی اس دور کا ایک عظیم فتنہ ہے، جس نے جذبات کی دنیا میں آگ لگادی اور انسان کو شہوت اور ہوس کا دیوانہ بنا دیا ہے۔ صنفِ مقابل ویسے بھی اپنے اندر جاذبیت رکھتی ہے۔ عریانی اس جاذبیت کو اس قدر بڑھا دیتی ہے کہ آدمی کا معصیت سے دور رہنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ اس لیے فطرت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ فحاشی اور

---

۱ بخاری، کتاب الرقاق، باب حفظ اللسان۔ ترمذی، ابواب الزہد، باب ماجاء فی حفظ اللسان
۲ ترمذی، ابواب الزہد، باب ماجاء فی حفظ اللسان

بدکاری کے اس محرک کو ختم کیا جائے۔ چناں چہ اسی مطالبۂ فطرت کے تحت آدمی نے لباس کا اہتمام کیا۔

لیکن تہذیبِ نو کے نزدیک آدمی کی معراج یہ ہے کہ وہ عفت و پاک دامنی کے تصور ہی سے بے نیاز ہو۔ چوں کہ لباس اس ترقی کی راہ میں ایک طرح کی رکاوٹ ہے، اس لیے اس نے اسے اتارنا شروع کر دیا اور بات عریانی تک پہنچ گئی۔ اسلام کی نگاہ میں زنا حرام ہے، اور وہ آدمی کو اس جرم سے باز رکھنا چاہتا ہے، اس لیے وہ اس مانعِ معصیت قوت کو اور مضبوط کرنا چاہتا ہے۔ اس نے تفصیل کے ساتھ مرد اور عورت کے حدودِ ستر کا تعین کیا ہے اور دونوں کو ان کے التزام کی سخت تاکید کی ہے۔

اسلام عریانیت کو کس قدر ہلاکت خیز تصور کرتا ہے، اس کا اندازہ آپ ایک حدیث سے فرما سکتے ہیں۔ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے، فرماتی ہیں:

سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَقُوْلُ أَيُّمَا امْرَأَةٍ نَزَعَتْ ثِيَابَهَا فِيْ غَيْرِ بَيْتِ زَوْجِهَا هَتَكَتْ سِتْرَ مَا بَيْنَهَا وَ بَيْنَ رَبِّهَا۔[1]

میں نے رسول اللہ کو فرماتے سنا ہے کہ جو عورت اپنے شوہر کے مکان کے علاوہ کسی اور جگہ اپنے کپڑوں کو اتارتی ہے وہ اپنے اور اپنے رب کے درمیان تعلق کو توڑتی ہے۔

نامحرم کے ساتھ تنہائی کی ممانعت

تحفظِ عصمت کی راہ میں ایک اور مرحلہ آتا ہے، جو نظر بازی، ہیجان انگیز نغموں، فحش گفتگو اور عریانی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے اور وہ ہے صنفِ مقابل کے ساتھ تنہائی، جب کہ دونوں کے درمیان کوئی طبعی حجاب بھی نہ ہو۔ ایسے نازک موقع پر کوئی ایسا خارجی دباؤ نہیں ہوتا، جو انسان کو جذبات کے ہاتھوں مارے جانے سے بچا سکے۔

اسلام انسان کی اس کم زوری کے پیش نظر کسی نامحرم کے ساتھ خلوت کو سختی سے منع کرتا ہے۔ حضرت جابرؓ نبی اکرم ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

---

[1] مسند احمد: ۷/ ۶۳، حدیث نمبر ۲۳۶۲۰

قَالَ لاَ تَلِجُوْا عَلَى الْمُغِيْبَاتِ فَاِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِىْ مِنْ اَحَدِكُمْ مَجْرَى الدَّمِ.[1]

آپؐ نے فرمایا: جن عورتوں کے گھروں میں محرم مرد نہ ہوں ان کے ہاں نہ جاؤ۔ کیوں کہ شیطان آدمی کے اندر خون کی طرح گردش کرتا رہتا ہے (پتہ نہیں کب وہ آدمی کو گناہ کے دلدل میں پھنسا دے)۔

اسی سلسلے کی ایک اور حدیث حضرت عمرؓ سے مروی ہے۔ وہ رسول اللہ ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

لاَ يَخْلُوَنَّ رَجُلٌ بِامْرَأَةٍ اِلّاَ كَانَ ثَالِثُهُمَا الشَّيْطَانُ[2]

کوئی مرد کسی عورت کے ساتھ تنہائی میں ہرگز نہ رہے۔ کیوں کہ اس صورت میں شیطان ان دو کا تیسرا ہوتا ہے۔

شریعت نے انسان کو پاک باز بنانے اور معصیت سے بچانے کے لیے جو پابندیاں عائد کی ہیں، ان کی مزید عنوانات کے تحت تشریح کی جاسکتی ہے، لیکن وہ کسی نہ کسی صورت سے مذکورہ بالا تفصیل کے تحت آجاتے ہیں، اس لیے انھیں یہاں نظر انداز کیا جارہا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے، اسلام، فرد کی تربیت کے ساتھ معاشرہ کی اصلاح کا کیا طریقہ اختیار کرتا ہے، جس سے عفت کی زندگی گزارنے میں مدد ملے۔

---

[1] مسلم، کتاب اللباس والزینۃ۔ ترمذی، کتاب الرضاع، باب (۱۷)

[2] ترمذی، کتاب الرضاع، باب ماجاء فی کراہیۃ الدخول علی المغیبات۔ مشکوٰۃ المصابیح، کتاب النکاح، باب النظر الی المخطوبۃ و بیان العورات

☙❧

معاشرہ کی اصلاح

ہر معاشرہ کے کچھ بنیادی مطالبات ہوتے ہیں، جن کا پورا کرنا افراد کے لیے ناگزیر ہوتا ہے۔ ان مطالبات سے اعراض یا مخالفت کو کوئی بھی معاشرہ برداشت نہیں کرسکتا، کیوں کہ ان تقاضوں سے انحراف سوسائٹی سے بغاوت کے ہم معنی ہوتا ہے۔ اگر کوئی سوسائٹی ان مطالبات سے دست بردار ہوجائے یا عوام کو ان کا پابند نہ کرسکے تو اس کی ہستی فنا ہو جاتی ہے۔

اسلامی معاشرے کے بھی کچھ اساسی تقاضے ہیں، جن کا پورا کرنا اس کے ہر ماننے والے کے لیے ضروری ہے۔ قرآن مجید نے ان تقاضوں کو مختلف مقامات پر پیش کیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰٓى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ يَّفْتَرِيْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْهِنَّ وَ اَرْجُلِهِنَّ وَلَا يَعْصِيْنَكَ فِيْ مَعْرُوْفٍ فَبَايِعْهُنَّ وَاسْتَغْفِرْ لَهُنَّ اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝ (الممتحنۃ:۱۲)

اے نبیؐ! جب تمھارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے ارادے سے آئیں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گی اور نہ چوری کریں گی، اور نہ زنا کریں گی اور نہ اپنی اولاد کو قتل کریں گی اور نہ جانتے بوجھتے کسی پر بہتان باندھیں گی، اور یہ کہ کسی بھلی بات میں آپ کی نافرمانی نہ کریں گی تو ان سے بیعت کرلیجیے اور اللہ سے ان کے گناہوں کی معافی کی دعا کیجیے۔ بلاشبہ اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔

ان احکام کا رُخ عورتوں کی طرف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ جس وقت مدینہ میں اسلامی سوسائٹی کی تعمیر جاری تھی، اسلامی ریاست نے حدیبیہ میں ۶ھ میں بعض مصالح کے تحت اہلِ مکہ سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ قریش کے کسی فرزند کو ان کی مرضی کے خلاف پناہ نہیں دے گی۔ اس لیے وہ قانوناً صرف ان خواتین ہی کو امان دینے کی مجاز تھی، جو اس کے زیرِ سایہ رہنا چاہتی ہوں۔ اس پس منظر میں قرآن مجید نے ان شرائط کی توضیح کردی، جن کی پابندی کا عہد کرنے کے بعد کوئی عورت مسلم سوسائٹی کا جز قرار پاتی ہے۔ اس مخصوص پس منظر سے قطع نظر یہ اسلامی معاشرہ کے ایسے حتمی تقاضے ہیں، جن سے مرد بھی قطعاً مستثنیٰ نہیں ہیں۔

حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اَخَذَ عَلَيْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ كَمَا اَخَذَ عَلَى النِّسَاءِ اَنْ لَّا نُشْرِكَ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّلَا نَسْرِقَ وَلَا نَزْنِىَ وَلَا نَقْتُلَ اَوْلَادَنَا وَلَا يَعْضَهَ بَعْضُنَا بَعْضًا.[1]

رسول اللہ ﷺ نے جس طرح عورتوں سے عہد لیا تھا اسی طرح ہم سے بھی عہد لیا کہ ہم خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں، چوری نہ کریں، زنا نہ کریں، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں اور یہ کہ ہم ایک دوسرے پر تہمت نہ تراشیں۔

اس عہد نامہ کو دیکھ کر ہر شخص معلوم کرسکتا ہے کہ اسلامی معاشرہ کسے کہتے ہیں؟ اس کا مقصدِ وجود کیا ہے؟ وہ انسانیت کے قافلہ کو کس راہ پر لے جانا چاہتا ہے؟ اور یہ کہ اس کی فضا میں کس قسم کے افراد پرورش پاسکتے ہیں؟ کیوں کہ معاشرہ ہی فرد کی تگ و دو کے لیے میدان فراہم کرتا ہے اور فرد اپنی ساری جدوجہد کو اس کے کھینچے ہوئے دائرے میں محدود رکھنے پر مجبور ہے۔ اگر وہ اس سے باہر قدم رکھنا چاہے تو معاشرہ کی قوتیں اس کا ساتھ دینے سے انکار کر دیتی ہیں، بلکہ مزاحمِ راہ اور بندشِ پا بن جاتی ہیں۔ لہٰذا معاشرہ جس قسم کے افکار و رجحانات کا حامل ہوگا اسی قسم کا کردار اُبھر کر سامنے آئے گا۔ ایک پاکیزہ ماحول اپنے اندر گندہ اطوار و عادات کو جگہ نہیں دے سکتا اور نہ کوئی معصیت پرست

---

[1] مسلم، کتاب الحدود، باب الحدود کفارات لاھلہا

سوسائٹی کسی خوگرِ اخلاق کو برداشت کرسکتی ہے۔ اس کی ایک مثال قومِ لوط ہے۔ اس سے ایک غلط معاشرہ کے رویہ کو آسانی سے سمجھا جاسکتا ہے۔

وَ لُوۡطًا اِذۡ قَالَ لِقَوۡمِہٖۤ اَتَاۡتُوۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مَا سَبَقَکُمۡ بِہَا مِنۡ اَحَدٍ مِّنَ الۡعٰلَمِیۡنَ۝ اِنَّکُمۡ لَتَاۡتُوۡنَ الرِّجَالَ شَہۡوَۃً مِّنۡ دُوۡنِ النِّسَآءِ ؕ بَلۡ اَنۡتُمۡ قَوۡمٌ مُّسۡرِفُوۡنَ۝ وَمَا کَانَ جَوَابَ قَوۡمِہٖۤ اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَخۡرِجُوۡہُمۡ مِّنۡ قَرۡیَتِکُمۡ ۚ اِنَّہُمۡ اُنَاسٌ یَّتَطَہَّرُوۡنَ۝

(الاعراف: ۸۰،۸۱،۸۲)

(اے نبیؐ) تم لوط علیہ السلام کا واقعہ ان لوگوں کو سناؤ جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ تم انتہائی بے حیائی کا کام کرتے ہو۔ تم سے پہلے اس گندے فعل کا ارتکاب کسی نے نہیں کیا۔ تم تو اپنی شہوت رانی کے لیے عورتوں کے بجائے مردوں کے پاس جاتے ہو۔ بلکہ (واقعہ یہ ہے کہ) تم حد سے بڑھ جانے والی قوم ہو اور (یہ سن کر) اس کی قوم کا جواب سوائے اس کے کچھ نہیں تھا کہ نکالو ان کو اپنی بستی سے، یہ تو بڑے ہی پاک باز لوگ ہیں۔

لہٰذا اگر آپ عیاشی اور بدکاری کو اپنے اور انسانیت کے لیے تباہ کن سمجھتے ہیں تو آپ کو سب سے پہلے موجودہ جرائم پرور ماحول کو بدلنا ہوگا اور ایسی فضا تیار کرنی ہوگی، جس میں عفت و پاک دامنی کی نشو ونما ہوسکے۔

موجودہ معاشروں کی ناکامی کی ایک اہم ترین وجہ یہی ہے کہ وہ افراد سے جن قوانین کا اتباع کرانا چاہتے ہیں خود ہی ان کی راہ کا سنگِ گراں بن جاتے ہیں۔ مثلاً ہمارے زیرِ بحث موضوع ہی کو لے لیجیے۔ آج بھی دنیا کی بیشتر سوسائٹیوں میں زنا قانوناً ممنوع ہے۔ لیکن ہر جگہ کے افکار و عقائد، تعلیم و تربیت، تہذیب و معاشرت، غرض تمام اجتماعی قوتیں اس قانون کی بے حرمتی اور پامالی کی ترغیب دینے اور اکسانے والی ہیں۔ اس وقت کے تمدن و تہذیب کا کوئی جز ایسا نہیں ہے، جس پر شہوانیت اور خواہشِ نفس کا تسلط نہ ہو۔ یہ فحش لٹریچر، ننگی تصاویر، عریاں لباس، عورت اور مرد کا آزادانہ اختلاط، رقص و سرور کی ہیجان انگیز محفلیں، کیا یہ سب کچھ آدمی کو باعفت زندگی گزارنے میں مدد دینے والے اسباب ہیں یا آلودۂ معصیت کرنے والے؟ ایسے گندے معاشرہ میں پاک دامنی

کا مطالبہ نامانوس اور بے ہنگم محسوس ہونے لگتا ہے۔ جب سوسائٹی افراد پر کوئی فرض عائد کرتی ہے تو اس کے لیے لازم ہوتا ہے کہ وہ اس فرض کی ادائیگی میں ہر طرح سے معاونت کرے، ورنہ قانون کی پابندی کے مطالبہ کا اسے کوئی حق نہیں پہنچتا۔

اسلام کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ قانون دینے سے پہلے ایسا ماحول تیار کرتا ہے جس میں اس کا نفاذ ہوسکے اور جس پر عمل درآمد افراد کے لیے ممکن ہو۔ وہ زنا کو حرام قرار دیتا اور عفت کا مطالبہ کرتا ہے تو سوسائٹی میں ایسی فضا بھی پیدا کرتا ہے، جس میں معصیت کا درخت خزاں رسیدہ ہوکر رہ جائے، جہاں باعفت و پاک دامن رہنا زیادہ آسان اور زانی اور اوباش بنا رہنا دشوار سے دشوار تر ہوجائے۔

کسی نظریہ کے نفاذ کے لیے معاشرہ کے پاس تین قوتیں ہوتی ہیں۔ افکار و نظریات کی قوت، اجتماعی احساس کی قوت اور قانون کی قوت۔ آیئے اب ہم دیکھیں کہ اسلام معاشرہ کو بااخلاق اور عفت شعار بنانے کے لیے اپنی ان توانائیوں کو کس طرح صرف کرتا ہے۔

نظریات کی قوت

کسی معاشرہ کی کامیابی ان نظریات میں مضمر ہوتی ہے، جو اس کی قیادت کرتے ہیں۔ اگر نظریات کھوکھلے اور کمزور ہوں تو دنیا کی کوئی قوت اس کی تلافی نہیں کرسکتی۔ دنیا قوانین کے صدہا دفتر تیار کرچکی، لیکن اس کے باوجود انسان کو بے راہ روی سے باز نہیں رکھ سکی۔ اس کے پاس وہ طاقت ہی نہیں جو آدمی کو ہر آن آئین کی زنجیر میں باندھے رکھے۔

اسلام ایسے نظریات عطا کرتا ہے جو انسان کے ارادہ وعمل پر شب و روز، خفیہ اور علانیہ ہر حال میں یکساں حکم رانی کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی ایسا لمحہ نہیں ہے جس میں ان کی گرفت ڈھیلی پڑجاتی ہو۔

وَ ذَرُوْا ظَاهِرَ الْاِثْمِ وَ بَاطِنَهٗ اِنَّ الَّذِیْنَ یَكْسِبُوْنَ الْاِثْمَ سَیُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوْا یَقْتَرِفُوْنَ۝ (الانعام:۱۲۰)

اور چھوڑ دو خفیہ اور علانیہ ہر قسم کے گناہ کو بلاشبہ جو لوگ گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، انھیں ان کی بدعملی کی سزا مل کر رہے گی۔

ایک دوسرے مقام پر فرمایا:

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَ مَا بَطَنَ. (الاعراف:۳۳)

کہہ دو (اے نبیؐ) کہ میرے رب نے تو کھلے اور چھپے تمام فحش کاموں کو حرام کیا ہے۔

معصیت و فحاشی کا ظہور جس شکل اور جس رنگ میں بھی ہو، اس کے جواز کی سند اسلام کی جانب سے نہیں مل سکتی، کیوں کہ جس نقشہ پر وہ فرد کی تربیت اور معاشرہ کی تعمیر چاہتا ہے اس میں گناہ اور بدکاری کی کسی بھی صورت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس کے پیشِ نظر حیوانوں کا کوئی جنگل نہیں بسانا ہے، جس میں آدمی ہر طرف چرتا چگتا اور شہوت رانی کرتا پھرے، بلکہ وہ انسانوں کی ایسی بستی آباد کرنا چاہتا ہے، جو انسانیت اور شرافت و اخلاق کا گہوارہ ہو، جو صفاتِ حسنہ اور پاکیزہ کردار کو نشو و نما دے سکے۔ وہ انسان کو انسانیت کے سانچے میں ڈھالتا ہے، تاکہ اس کا ہر نقشِ پا کردار کی پاکیزگی اور حسنِ سیرت کا نشان بن جائے اور اس کے پاک انفاس سے روح کو بالیدگی اور احساسات کو جلا نصیب ہو، اور سوسائٹی اس اعلیٰ کردار کی بدولت پاسبانِ عصمت و ناموس بن جائے۔

اگر آدمی سفر پر ہو اور گھر سے دور رہ رہا ہو تو ایک گندی سوسائٹی میں اس کے بیوی بچوں پر بری نگاہیں اٹھنے لگتی ہیں۔ لیکن اسلام ان کی عزت و ناموس کی حفاظت کو پورے معاشرے کی ذمے داری قرار دیتا ہے۔ حضرت سلیمان بن بریدہؓ کی روایت ہے کہ جو لوگ راہ خدا میں وطن سے دور جہاد پر ہیں ان کی خواتین ماؤں کی طرح محترم ہیں، ان کی حرمت سے کھیلنا ماں کی حرمت سے کھیلنا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ حُرْمَةُ نِسَآءِ

رسول اللہؐ نے فرمایا جو لوگ میدانِ جنگ میں

اَلْمُجَاهِدِيْنَ عَلَى الْقَاعِدِيْنَ كَحُرْمَةِ اُمَّهَاتِهِمْ وَ مَا مِنْ رَجُلٍ مِّنَ الْقَاعِدِيْنَ يَخْلُفُ رَجُلاً مِّنَ الْمُجَاهِدِيْنَ فِيْ اَهْلِهٖ فَيَخُوْنُهٗ فِيْهِمْ اِلَّا وُقِفَ لَهٗ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فَيَاْخُذُ مِنْ عَمَلِهٖ مَا شَاءَ فَمَا ظَنُّكُمْ[1]

نہ جائیں اور اپنے گھروں ہی میں رہ جائیں ان پر مجاہدین کی عورتیں ان کی ماؤں کی طرح محترم ہیں۔ جنگ سے پیچھے رہ جانے والوں میں سے جو شخص کسی مجاہد کے اہل و عیال میں اس کا جانشین ہو اور وہ ان میں خیانت کرے تو قیامت کے دن اس خائن کو مجاہد کے سامنے کھڑا کیا جائے گا اور وہ اس کی نیکیوں سے جتنا چاہے گا لے لے گا۔ خیال کرو کہ اس وقت اس مجرم کا کیا حال ہوگا۔

یہ وعید ہے غلط کار افراد کے لیے۔ اس کے برخلاف جو لوگ جہاد پر جانے والوں کی ساز و سامان سے مدد کریں، ان کی عدم موجودگی میں ان کے اہل و عیال کی خبرگیری اور ان کے ساتھ حسن سلوک کریں وہ جہاد میں براہِ راست شریک نہ ہونے کے باوجود بالواسطہ شریک جہاد اور مستحق اجر و ثواب ہیں۔ حضرت زید بن خالدؓ کی روایت ہے:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ مَنْ جَهَّزَ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَقَدْ غَزَا وَ مَنْ خَلَفَ غَازِيًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِخَيْرٍ فَقَدْ غَزَا.[2]

نبی ﷺ نے فرمایا: جس نے اللہ کی راہ میں کسی جہاد کرنے والے کے لیے سامانِ جنگ فراہم کیا تو گویا اس نے بھی جہاد کیا اور جس شخص نے کسی اللہ کی راہ کے مجاہد کی اس کے اہل و عیال میں بہتر طریقہ سے جانشینی کی تو اس نے بھی جہاد کیا۔

جہاد کا ذکر ایک مثال ہے۔ دیگر دینی خدمات بھی اس میں شامل ہوسکتی ہیں۔ اس سے تصور کیا جاسکتا ہے کہ اسلام معاشرہ کی فضا کو غلط روی اور بدکاری سے کس طرح پاک کرنا چاہتا ہے۔

---

[1] مسلم، کتاب الامارۃ، باب حرمۃ نساء المجاہدین و اثم من خانہم فیھن۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی حرمۃ نساء المجاہدین۔

[2] بخاری، کتاب الجہاد، باب فضل من جہز غازیا او خلفہ بخیر۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل اعانۃ الغازی۔ الخ

اخلاق کی قدر و قیمت

ظاہر ہے، جس سوسائٹی کی اساس اس قدر شائستہ خیالات اور پاکیزہ جذبات پر رکھی گئی ہو، اس میں اخلاقی اقدار کی قدر و قیمت لازماً بڑھ جائے گی۔ عفت و عصمت، پاک دامنی و نیک سیرتی جیسی اعلیٰ صفات صرف واعظانہ مسکینی کی مظہر نہیں ہوں گی، بلکہ ان میں قانون کی قوت اور سیاست کا زور پیدا ہوجائے گا اور ہر فرد ان اخلاقی خوبیوں کو اپنی عزت و آبرو کا سرمایہ سمجھے گا اور سوسائٹی میں باعزت و مفتخر رہنے کے لیے جان و مال اور خاندان وقبیلہ کی طرح ان کی حفاظت کرے گا۔

اسلامی معاشرہ فرد کے جذبۂ عفت و پاک بازی کی انتہائی قدر کرتا ہے اور اس کو اتنی اہمیت دیتا ہے کہ امام ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

وَ مَنْ طُلِبَ مِنْـهُ الْفُجُـوْرُ كَانَ عَلَيْهِ اَنْ يَّدْفَعَ الصَّائِلَ عَلَيْهِ فَاِنْ لَّمْ يَنْدَفِـعْ اِلَّا بِالْقَتْلِ كَانَ لَـهٗ ذٰلِكَ بِاِتِّفَاقِ الْفُقَهَاءِ۔[1]

اگر کسی شخص سے سختی کے ساتھ بدکاری کا مطالبہ کیا جائے تو اس پر ضروری ہے کہ حملہ آور کی مدافعت کرے۔ اگر وہ دفع ہوجائے تو ٹھیک لیکن اگر سوائے قتل کے مدافعت کی اور کوئی صورت نہ ہو تو فقہاء کا متفقہ فیصلہ ہے کہ اسے قتل کا بھی حق حاصل ہے۔

اسلام فرد کے اس پاکیزہ جذبہ کو اس کا فطری حق سمجھتا ہے، جس کی توہین و تحقیر کسی طرح برداشت نہیں کی جاسکتی اور اس کو مجروح کرنے کی ہر کوشش اسلامی معاشرہ کی نگاہ میں قابلِ مواخذہ اور مستحق تعزیر ہے۔ اسی لیے اسلامی معاشرہ کسی کو یہ حق نہیں دیتا کہ دوسرے کی عصمت دری کرے اور اس کی پاک دامنی پر بٹہ لگائے، کیوں کہ تہمت تراشنے والا متعلقہ فرد کی سیرت ہی پر حملہ نہیں کرتا بلکہ سوسائٹی میں اس کو جو باعزت مقام حاصل ہے، اسے بھی وہ خطرہ میں ڈال رہا ہے۔

وَ الَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ

جو لوگ پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت باندھیں اور پھر چار گواہ نہ پیش کریں ان کو

---

[1] الاختیارات العلمیۃ، صفحہ ۱۷۳

ثَمَانِيْنَ جَلْدَةً وَّلاَ تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ○
اسی (۸۰) کوڑے مارو اور ان کی شہادت کبھی نہ قبول کرو (کیوں کہ) ایسے ہی لوگ فاسق ہیں۔ (النور: ۴)

یہاں پاک دامن عورتوں پر زنا کی تہمت لگانے کا ذکر ہے۔ یہی حکم باعفت مرد پر تہمتِ زنا لگانے کا ہے[1]

بدکاروں کی توہین

ایک طرف اسلامی معاشرہ کسی باعفت انسان کے خلاف افترا پردازی کو قانوناً جرم قرار دیتا ہے، تاکہ وہ عزت و وقار کی زندگی بسر کرسکے، دوسری طرف وہ کسی بے حیا اور عصمت فروش کو اپنے اندر وہ پوزیشن دینے کے لیے قطعاً آمادہ نہیں ہے، جو ایک صالح سیرت انسان کو حاصل ہوتی ہے۔

مغربی تہذیب نے جن سوسائٹیوں کو جنم دیا ہے، چوں کہ ان کی نگاہ میں سیرت کی پاکیزگی اور اخلاقی اقدار کوئی حیثیت نہیں رکھتے، اس لیے ان میں ایک شخص انتہائی عیاش اور غنڈہ صفت ہوتے ہوئے بھی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح سوسائٹی بالواسطہ افراد کی بدعملی کی ہمت افزائی کرتی رہتی ہے۔

لیکن اسلام ایسا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں بدکار اپنا مقام کھودے، اس کی قدر و قیمت گھٹ جائے، اس کی طرف بجائے عزت کی نگاہوں کے حقارت کی نظریں اٹھنے لگیں، وہ سوسائٹی کا انتہائی ناپاک اور گندہ عنصر قرار پائے، جس سے شریف اور باعزت افراد کنارہ کشی اختیار کرلیں اور وہ اپنے ہی جیسے کم ظرف انسانوں سے تعلقات قائم کرنے پر مجبور ہوجائے۔

---

[1] زنا کی تہمت کو 'قذف' کہا جاتا ہے۔ اس کے احکام سے راقم نے اپنے ایک مضمون میں تفصیل سے بحث کی ہے۔ ملاحظہ ہو '**تحقیقات اسلامی کے فقہی مباحث**' مضمون 'قذف اور لعان کے احکام' ناشر: مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی۔ ۲۵

اَلزَّانِیْ لاَ یَنْکِحُ اِلّآ زَانِیَةً اَوْ مُشْرِکَةً وَّالزَّانِیَةُ لاَ یَنْکِحُھَآ اِلّآ زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ۚ وَ حُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ○ (النور:۳)

زانی نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ سے نکاح نہیں کرتا سوائے زانی یا مشرک کے اور یہ مومنوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔

ایک حدیث سے اسلام کا یہ مزاج مزید واضح ہوسکتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور زیدبن خالدؓ کی روایت ہے:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ سُئِلَ عَنِ الْاَمَةِ اِذَا زَنَتْ وَلَمْ تُحْصَنْ قَالَ اِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوْھَا ثُمَّ اِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوْھَا ثُمَّ اِنْ زَنَتْ فَاجْلِدُوْھَا ثُمَّ بِیْعُوْھَا وَ لَوْ بِضَفِیْرٍ[1]

رسول اللہ ﷺ سے لونڈی کے بارے میں دریافت کیا گیا کہ اگر اس کی شادی نہ ہوئی ہو اور وہ زنا کرے تو کیا کیا جائے؟ آپؐ نے جواب دیا اگر وہ زنا کرے تو اس کو کوڑے لگاؤ، دوبارہ زنا کرے تو پھر کوڑے لگاؤ اور اگر اس کے بعد بھی زنا کرے تو کوڑے مارو اور پھر اسے بیچ دو، خواہ ایک رسّی کی قیمت پر ہی کیوں نہ ہو۔

تجرد کا خاتمہ

کیا مجرم کی توہین وتحقیر اور اس سے کنارہ کشی کے ساتھ معاشرہ کی ذمے داری ختم ہوجاتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اس کا اصل فرض تو یہ ہے کہ بدچلن کو نیک راہ پر لے چلے، سرگشتۂ معصیت کو عصمت کا شیدائی بنا دے، تاکہ اس کا ہر فرد عصمت و پاک بازی کا منادّ اور شایستہ زندگی کا علم بردار بن جائے اور رفعتِ اخلاق کا طالب جنگل کا تنہا مسافر نہ ہو، بلکہ کاروانِ صلاح وتقویٰ اس کا ہم صفیر رہے۔ وہ گناہ سے دامن کش ہونا چاہے تو ہزار اسے بچانے والے ہوں۔ وہ معصیت کے خلاف صدا بلند کرے تو صدہا زبانیں اس کی ہم آواز ہوجائیں۔ وہ فسق و بدکاری کے مقابلہ کے لیے اٹھے تو پوری سوسائٹی اس کے لیے ڈھال بن جائے۔

---

[1] بخاری، کتاب الحدود، باب اذا زنت الامۃ۔ مسلم، کتاب الحدود باب رجم الیہود و اہل الذمۃ فی الزنیٰ

قدرتی طور پر یہ ذمے داری ہر شخص کے متعلقین پر سب سے زیادہ عائد ہوتی ہے۔ ایک شخص جن لوگوں کو زندگی کے تمام معاملات میں قابل اعتماد سمجھتا ہے، جن کی طرف اپنی پریشانیوں میں رجوع کرتا ہے اور جن کو اپنی کم زوری اور ناتوانائی میں سہارا تصور کرتا ہے وہی اس بات کے مستحق ہیں کہ آدمی انھیں طلب عفت و عصمت میں ہاتھ بٹانے والا، نیکی کی راہ کا ساتھی اور بھلائی کے کاموں کا معاون خیال کرے۔

آپ کسی خاندان کے فرد ہوں تو آپ کا صرف یہی فرض نہیں ہے کہ وہ بھوکے ہوں تو ان کو کھانا کھلائیں، برہنہ تن ہوں تو پوشاک فراہم کریں، بے گھر ہوں تو مکان کا انتظام کریں، بلکہ یہ بھی آپ کی ذمے داری ہے کہ ان کو اخلاقی گراوٹ سے بچائیں، ان کے جنسی مطالبات پورے کریں، ان کے نفسیاتی امراض کا علاج کریں اور ان کے روحانی تقاضوں کی تکمیل کا سامان فرمائیں۔ جس بچہ کے بدن پر ایک ادنیٰ چوٹ آپ دیکھنا پسند نہیں کرتے، کیا اس کا صفاتِ رذیلہ میں گرفتار ہوجانا آپ کو گوارا ہے؟

قرآن مجید نے اس فطری حق کو حسبِ ذیل الفاظ میں یاد دلایا ہے:

وَ اَنۡکِحُوا الۡاَیَامٰی مِنۡکُمۡ وَ الصّٰلِحِیۡنَ مِنۡ عِبَادِکُمۡ وَ اِمَآئِکُمۡ (النور:۳۲)

تم میں سے جو بے شادی شدہ ہوں ان کا نکاح کرو اور اپنے صالح غلاموں اور لونڈیوں کا بھی۔

اس حکم کو فقہی زبان میں جس اصطلاح سے بھی تعبیر کیا جائے اور اس کے مخاطب خواہ اولیاء و سرپرست ہوں یا حکومت و ریاست، اس آیت کا واضح مطالبہ یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ میں کوئی شخص تجرد کی زندگی نہ گزارنے پائے، تاکہ اسے اپنی جنسی تشنگی کو ختم کرنے کے لیے ناجائز صورتیں نہ تلاش کرنی پڑیں۔

آیت کے الفاظ عام ہیں۔ اس میں مسلم معاشرہ کے مرد اور عورت، لونڈی اور غلام سب ہی اصناف شامل ہیں۔ دورِ اول کی اسلامی سوسائٹی ان تمام طبقات کے جنسی مطالبات کی تکمیل کا انتظام کرتی تھی۔

مشہور تابعی احنفؒ کہتے ہیں کہ تین معاملات ایسے ہیں، جن میں کسی قسم کی تاخیر نہیں کی جاسکتی۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ وہ کون سے معاملات ہیں تو جواب دیا: عملِ صالح کی انجام دہی، میت کو سپردِ خاک کرنا اور کسی نا کتخدا کے لیے مناسب بَر مل جانے پر اس کی شادی کرنا۔

فرماتے تھے: میرے گھر کے کسی کونے میں اژدھے کا پایا جانا مجھے زیادہ پسندیدہ ہے اس بات سے کہ کسی بے شوہر عورت کے لیے اس کے ہم مرتبہ مرد کی جانب سے پیغام آئے اور میں اسے رد کر دوں[1]

شداد بن اوسؓ اپنے اعزہ سے فرماتے ہیں: میری شادی کا انتظام کرو، کیوں کہ نبی ﷺ نے مجھے وصیت کی ہے کہ میں بے شادی شدہ رہ کر خدا سے ملاقات نہ کروں[2]

مجاہدؒ کہتے ہیں کہ عبد اللہ بن عباسؓ اپنے غلاموں کو شادی کی پیش کش کرتے تھے اور فرماتے: تم میں سے جو شادی کرنا چاہے میں اس کی شادی کرانے کے لیے تیار ہوں (یاد رکھو) تجرد کی زندگی بسر کرنے میں زنا میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ ہے اور زنا کی خباثت کا یہ حال ہے کہ زانی جب زنا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی گردن سے ایمان کا قلادہ نکال دیتا ہے، اگر وہ چاہے تو دوبارہ یہ قلادہ پہنائے اور نہ چاہے تو نہ پہنائے[3]

امام نخعیؒ کہتے ہیں: ''سلف اپنے غلاموں کو نکاح پر مجبور کرتے تھے۔ (اگر وہ نکاح کے لیے آمادہ نہ ہوتے تو) ان کو مکانات میں بند کر دیتے تھے۔''[4] (تاکہ معاشرہ کے بگاڑ کا سبب نہ بنیں)۔

اسلامی معاشرہ میں یہ صرف افراد ہی کی ذمے داری نہیں ہے، بلکہ ریاست کے فرائض میں بھی شامل ہے کہ وہ باعفت زندگی گزارنے میں مدد دے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

---

[1] جاحظ، البیان والتبیین: ۲/ ۲۰۴ [2] جصاص، احکام القرآن: ۳/ ۳۱۳

[3] ابن حزم، المحلی: ۱۱/ ۱۲۱

[4] قرطبی، الجامع لاحکام القرآن: جلد ۶، جزء ۱۲/ ۱۶۰، ۱۶۱

اَلسُّلْطَانُ وَلِيُّ مَنْ لاَ وَلِيَّ لَهُ[۱] — جس شخص کا کوئی سرپرست نہ ہو حاکمِ وقت اس کا سرپرست ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کو ہدایت فرمائی:

يَا عَلِيُّ ثَلاَثٌ لاَ تُؤَخِّرْهَا الصَّلوٰةُ إِذَا آنَتْ وَالْجَنَازَةُ إِذَا حَضَرَتْ وَالْاَيِّمُ إِذَا وَجَدْتَ لَهَا كُفُوًّا[۲] — اے علیؓ تین باتوں میں تاخیر نہ کرو۔ نماز کا جب وقت ہوجائے، جنازہ جب موجود ہو اور بے شادی شدہ کے لیے جب تمھیں اس کا کفو مل جائے۔

مطلب یہ کہ نماز کی اہمیت یہ ہے کہ اول وقت ادا کی جائے، اس میں تاخیر صحیح نہیں ہے۔ کسی کا انتقال ہو تو اس کے کفن دفن میں دیر نہیں ہونی چاہیے۔ اسی طرح کسی بے شادی شدہ عورت کے لیے مناسب جوڑا مل جائے تو شادی میں جلدی کرنی چاہیے۔ یہ ہدایت پورے مسلم معاشرے کے لیے ہے۔

حضرت عمر بن عبد العزیزؒ گورنر کوفہ زید بن عبد الرحمٰن کے ایک خط کے جواب میں تحریر فرماتے ہیں:

”تم نے لکھا ہے کہ فوج کو تنخواہ دینے کے بعد بھی تمھارے پاس مال بچا ہوا ہے۔ پس اس مال کے ذریعے ان میں سے جو شخص حقیقی ضروریات کے تحت مقروض ہو اس کا قرض ادا کرو اور جو لوگ ادائی مہر سے قاصر ہوں ان کو مہر دو۔“[۳]

چار بیویاں رکھنے کی اجازت

مرد کے اندر ایک خاص عمر تک جنسی جذبات پوری شدت کے ساتھ موجود ہوتے ہیں، لیکن عورت بار بار ایسے حالات سے گزرتی رہتی ہے جن میں اس کے جذبات کم زور پڑ جاتے ہیں اور بعض اوقات یہ حالات لمبے عرصے تک اس پر طاری رہتے ہیں۔ اس لیے وہ ہر وقت مرد کی جنسی خواہش پوری نہیں کرسکتی۔ اس وجہ سے

---

۱ ترمذی، ابواب النکاح۔ ابوداؤد، کتاب النکاح، باب فی الولی

۲ ترمذی، کتاب الصلوٰۃ، باب ماجاء فی الوقت الاول من فضل۔ مسند احمد: ۱/۱۶۹، حدیث نمبر ۸۳۰

۳ سیرۃ عمر بن عبد العزیز، عبد اللہ بن عبد الحکم المتوفی ۲۱۴ھ

اسلامی معاشرہ مرد کو یہ حق دیتا ہے کہ وہ چار تک بیویاں رکھے۔ یہ حق عیاشی کے لیے نہیں، بلکہ اس لیے ہے کہ مرد اپنی جنسی خواہش کی تسکین کے لیے بعض اوقات ایک سے زائد جائز ذرائع کا محتاج ہوتا ہے۔ لیکن شریعت کے اس حق سے فائدہ اٹھانے کے لیے ضروری ہے کہ مرد بیویوں کے درمیان ان تمام معاملات میں عدل و مساوات کا پابند رہے، جو اس کے بس میں ہیں۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ؕ (النساء:۳)

پس جو عورتیں تم کو پسند آئیں ان میں سے دو دو اور تین تین اور چار چار سے نکاح کرو اور اگر تم کو اس کا خوف ہو کہ تم ان کے ساتھ عدل نہیں کرسکو گے تو صرف ایک پر اکتفا کرو یا لونڈیوں پر۔

علامہ ابن الہمام حنفیؒ نے اس آیت کے قانونی پہلو پر ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے:

فَاسْتَفَدْنَا اَنَّ حَلَّ الْاَرْبَعِ مُقَيَّدٌ بِعَدَمِ خَوْفِ عَدَمِ الْعَدْلِ وَ ثُبُوْتُ الْمَنْعِ عَنْ اَكْثَرِ مِنْ وَاحِدَةٍ عِنْدَ خَوْفِهٖ فَعُلِمَ اِيْجَابُهٗ عِنْدَ تَعَدُّدِهِنَّ۔[1]

اس سے معلوم یہ ہوا کہ چار عورتیں اس شرط کے ساتھ حلال ہیں کہ ان کے ساتھ ناانصافی کا خوف نہ ہو لیکن اگر اس کا خوف ہو تو ایک سے زائد شادی کرنا ممنوع ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ متعدد بیویاں ہوں تو ان کے ساتھ انصاف ضروری ہے۔

علاّمہ بدر الدین کاشانیؒ فرماتے ہیں:

لَوْ كَانَتْ تَحْتَهٗ اِمْرَأَتَانِ حُرَّتَانِ اَوْ اَمَتَانِ يَجِبُ عَلَيْهِ اَنْ يَّعْدِلَ بَيْنَهُمَا فِي الْمَاكُوْلِ وَ الْمَشْرُوْبِ

اگر خاوند دو آزاد عورتیں یا دو لونڈیاں رکھتا ہو تو اس کے لیے واجب ہے کہ ان دونوں کے درمیان غذا، لباس، مکان اور شب باشی

۱۔ فتح القدیر: ۳/۴۱۰

وَ الْمَلْبُوْسِ وَ السُّکْنٰی وَ الْبَیْتُوْتَۃِ[1] میں عدل اور برابری کا سلوک کرے۔

عورت کے لیے عقدِ ثانی کا حق

عورت کے طبعی حالات مرد کے طبعی حالات سے مختلف ہیں، اس لیے اسلام یہ تو صحیح نہیں سمجھتا کہ ایک عورت کے بہت سے شوہر ہوں۔ البتہ یہ ضروری سمجھتا ہے کہ وہ تسکینِ نفس کے جائز ذریعے سے کبھی محروم نہ رہے۔ چناں چہ وہ اس کے نکاح کی اتنی ہی شدت سے تاکید کرتا ہے جتنی شدت سے مرد کے نکاح پر زور دیتا ہے اور اگر بیوگی یا طلاق اور خلع نے اس کو شوہر سے الگ کر دیا ہے تو معاشرہ کو ترغیب دیتا ہے کہ فوراً اس کا دوسرا نکاح کر دے۔

چناں چہ آپ دیکھیں گے کہ حضور اکرم ﷺ اور آپ کے خلفاء کے دور میں بڑی آسانی سے عورتوں کا عقدِ ثانی ہو جاتا تھا۔

عاتکہ بنت زیدؓ کی شادی حضرت ابوبکرؓ کے صاحب زادے عبد اللہؓ سے ہوئی۔ بعض اسباب کی بنا پر حضرت ابوبکرؓ نے عبد اللہ کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دیں۔ عبد اللہ نے اپنے والد کے مشورہ پر بیوی کو طلاق دے تو دی لیکن ان کو اس اقدام کا سخت افسوس تھا، کیوں کہ وہ عاتکہ کو بہت چاہتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے عبد اللہ کا رجحان دیکھا تو دوبارہ نکاح کی اجازت دے دی اور عبد اللہ نے اس پر عمل کیا، لیکن طائف کی جنگ میں وہ زخمی ہوئے اور اس سے جان بر نہ ہوسکے اور شہید ہوگئے۔ اس کے بعد بعض روایات کے مطابق زید بن خطابؓ نے عاتکہ سے نکاح کر لیا۔ جب وہ جنگ یمامہ میں شہید ہوگئے تو حضرت عمرؓ اور حضرت عمرؓ کے بعد حضرت زبیرؓ سے ان کی شادی ہوئی۔ حضرت زبیرؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ نے ان کو پیغام بھیجا، لیکن خود

---

[1] کاشانی، بدائع الصنائع: ۲/ ۳۷۵۔ اس موضوع پر مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو '**مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ**' بحث 'تعدد ازواج' ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی، طبع پنجم، ۲۰۰۶ء

ہی انھوں نے انکار کر دیا اور کہا کہ میں نہیں چاہتی کہ آپ بھی شہید ہو جائیں۔ لیکن بعد میں حضرت حسنؓ سے ان کا نکاح ہوا۔

سہیلہ بنت سہیلؓ کا نکاح یکے بعد دیگرے چار اصحاب حضرت حذیفہؓ، حضرت عبد الرحمٰن بن عوفؓ، عبد اللہ بن الاسودؓ اور شماخ بن سعیدؓ سے ہوا۔

اسی طرح عبد اللہ بن اُبی کی لڑکی جمیلہ کا عقد حضرت حنظلہؓ سے ہوا۔ وہ احد میں شہید ہوگئے تو ثابت بن قیسؓ نے اور ثابتؓ کے بعد مالک بن دخشمؓ نے ان سے شادی کی۔ آخر میں وہ حبیب بن یساف کے عقد میں آئیں۔

اسماء بنت عمیسؓ کی پہلی شادی حضرت علیؓ کے بھائی حضرت جعفرؓ سے ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد حضرت ابوبکرؓ نے اور حضرت ابوبکرؓ کے بعد حضرت علیؓ نے ان سے نکاح کیا۔

حضرت علیؓ کی صاحب زادی ام کلثوم حضرت عمرؓ سے بیاہی گئیں۔ حضرت عمرؓ شہید ہوگئے تو عون بن جعفرؓ سے ان کا نکاح ہوا۔ عون کی وفات کے بعد ان کے بھائی عبد اللہ نے ان سے نکاح کر لیا[1]

رسولِ اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے دور میں عورت کے لیے نکاح ثانی کے معیوب یا ناپسندیدہ ہونے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا، جیسا کہ ہندو مذہب یا دوسرے مذاہب میں پایا جاتا ہے۔ اس لیے خواتین کے ایک سے زائد نکاح بکثرت ہوئے ہیں۔ ہم نے کسی خاص چھان بین اور تلاش کے بغیر چند مثالیں آپ کے سامنے پیش کی ہیں، ورنہ اس طرح کے واقعات کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ یہاں ان کی تفصیل بھی دشوار ہے۔

---

[1] ان مثالوں کے حوالہ کے لیے ملاحظہ ہو، ابن سعد کی طبقات اور ابن عبد البر کی الاستیعاب فی اسماء الاصحاب میں متعلقہ صحابیات کا تذکرہ۔

فسخِ نکاح کا اختیار

اسلام کے نزدیک نکاح کا اہم ترین مقصد یہ ہے کہ انسان کو عفت کی زندگی گزارنے میں مدد ملے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب کہ میاں بیوی میں سے ہر ایک اس قابل ہو کہ دوسرے کے جنسی تقاضے پورا کرسکے۔ اس لیے اسلام زوجین کو یہ حق دیتا ہے کہ فریقِ ثانی میں اس کی صلاحیت نہ ہو تو ازدواجی بندھن کو توڑ دے۔

حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور بعض دیگر صحابہ و تابعین کی رائے میں جنسی نقص ہی نہیں، بلکہ برص، جذام، اندھا پن اور جنون بھی ایسے عیوب ہیں، جن کی بنا پر زوجین کو ایک دوسرے سے جدا ہونے کا اختیار ہے[1]

امام ابن قیمؒ نے ان عیوب پر دوسرے عیوب کو بھی قیاس کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

اَمَّا الْاِقْتِصَارُ عَلٰی عَیْبَیْنِ اَوْ سِتَّۃٍ اَوْ سَبْعَۃٍ اَوْ ثَمَانِیَۃٍ دُوْنَ مَا ھُوَ اَوْلٰی مِنْھَا مُسَاوٍ لَھَا فَلَا وَجْہَ لَہٗ وَالْقِیَاسُ اَنَّ کُلَّ عَیْبٍ یُنَفِّرُ الزَّوْجَ الْاٰخِرَ مِنْہُ وَلَا یَحْصُلُ بِہٖ مَقْصُوْدُ النِّکَاحِ مِنَ الرَّحْمَۃِ وَالْمَوَدَّۃِ یُوْجِبُ الْخِیَارَ[2]

دو یا چھ یا سات یا آٹھ عیبوں پر اختصار کرنا اور ان سے بڑے بڑے یا ان کے برابر کے عیوب کو شمار نہ کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ قیاس یہ کہتا ہے کہ ہر اس عیب پر علیحدگی کا اختیار ملنا چاہیے جو میاں بیوی میں سے ایک کو دوسرے سے متنفر کرے اور جس کی وجہ سے باہمی رحمت و مودت ختم ہوجائے جو نکاح کا مقصود ہے۔

یہ نقطۂ نظر مقصدِ نکاح سے ہم آہنگ ہے۔ اس پر اس پہلو سے غور ہونا چاہیے۔

جائز رشتوں کا احترام

ایک طرف اسلام ان رشتوں کو توڑنے اور ختم کرنے کی آزادی دیتا ہے، جن سے عفت کی زندگی گزارنے میں مدد نہ ملے۔ دوسری طرف وہ ایسے رشتوں کو مستحکم

---

[1] بیہقی، السنن الکبریٰ: ۷/ ۳۰۸-۳۱۰۔ حنفیہ کے نزدیک خاوند کو اگر جذام یا برص کی قسم کا کوئی عیب ہو تو بیوی کو فسخ نکاح کے مطالبہ کا حق نہیں ہے۔ البتہ اگر خاوند مقطوع الذکر، عنین یا خصی ہو تو اس کو تفریق کے مطالبہ کا حق ہے۔ فقہی تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو 'الفقہ علی المذاہب الاربعۃ' جلد ۴، صفحہ ۱۸۱ تا ۱۹۰

[2] زاد المعاد: ۵/ ۱۸۲، ۱۸۳

کرنے اورحتی الوسع ان سے چمٹے رہنے کی تعلیم دیتا ہے، جو طلبِ عفت میں معاون ہوں، کیوں کہ جب تک یہ رشتے مضبوط نہ ہوں اور ان کی عظمت اور احترام دلوں میں بیٹھ نہ جائے اس وقت تک وہ ذہنیت ختم نہیں ہوسکتی جو آدمی کو ہر وقت ایک نئے دلبر کی تلاش میں سرگرداں رکھتی ہے۔ آج جو لوگ بدکار و بدچلن ہیں، ایسا نہیں ہے کہ وہ جنسی آسودگی کے لیے جائز ذرائع نہ رکھتے ہوں، لیکن وہ ان کو ایسے ذرائع سمجھتے ہیں جو جذبات کی آگ بجھانے کے لیے ہر وقت ان کے قبضہ میں ہیں۔ وہ اس تصور ہی سے نا آشنا ہیں کہ ان مخصوص طریقوں کے علاوہ کسی اور طریقہ سے نفسانی خواہشات کی تسکین صحیح نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی جنسی محبت کا مرکز آج ایک ہے تو کل دوسرا ہوسکتا ہے۔ معمولی سی ناگواری پر رشتۂ رفاقت اس طرح ختم ہو جاتا ہے جیسے راستہ چلتے چلتے کسی غنڈے کو دھتکار دیا جائے۔

اسلام اس ذہنیت کا دشمن ہے۔ وہ سختی کے ساتھ اسے بدلنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس کے نزدیک نکاح ایک قابلِ احترام عہد و پیمان ہے۔ وہ اس لیے نہیں باندھا جاتا کہ آدمی جب تک چاہے حظ نفس اٹھاتا رہے اور جب چاہے توڑ پھینکے۔ اگر نکاح اتنا ہی بے وقعت تعلق ہے تو اس میں اور کھلی کھلی حرام کاری میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص جو ہر دن نئے نکاح اور نئے تعلق کی ضرورت محسوس کرتا ہو، آخر اس میں اور اس شخص میں کیا فرق و امتیاز ہے جو اپنی صنفی بھوک کو ختم کرنے کے لیے کسی بیسوا کے کوٹھے کی طرف رجوع کرتا ہے؟

اس ناپاک جذبہ کے خلاف اسلام کی تعلیمات بہت ہی سخت ہیں۔ ایک موقع پر نبی ﷺ نے فرمایا:

اَلْمُنْتَزِعَاتُ وَالْمُخْتَلِعَاتُ هُنَّ الْمُنَافِقَاتُ[1]	جو عورتیں بلا وجہ اپنے شوہروں سے طلاق و خلع کا مطالبہ کرتی ہیں، وہ منافق ہیں۔

ایک دوسرے موقع پر فرمایا:

---

[1] ترمذی، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی المختلعات۔ نسائی، کتاب الطلاق، باب ماجاء فی الخلع

اَیُّمَا امْرَأَۃٍ سَأَلَتْ زَوْجَهَا طَلاَقًا مِنْ غَیْرِ بَأسٍ فَحَرَامٌ عَلَیْهَا رَائِحَۃُ الْجَنَّۃِ[۱]	جو عورت بلا کسی حقیقی وجہ کے اپنے شوہر سے طلاق کا مطالبہ کرے، اس پر جنت کی خوشبو تک حرام ہے۔

اس مزاج کے مردوں کو آپ نے ان الفاظ میں وعید سنائی:

اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰهِ رَجُلٌ تَزَوَّجَ امْرَأَۃً فَلَمَّا قَضٰی حَاجَتَهٗ طَلَّقَهَا وَ ذَهَبَ بِمَهْرِهَا.[۲]	اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ ایک شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور جب اپنی خواہش پوری کرلے تو اسے طلاق دے دے اور ساتھ ہی اس کا مہر بھی کھا جائے۔

جائز حدود میں قائم ہونے والے تعلقات کا احترام صرف فرد ہی کے لیے ضروری نہیں، بلکہ معاشرہ بھی اس کا پابند ہے۔ اسلام کہتا ہے کہ جب سوسائٹی ناپسندیدہ تعلقات کی مذمت کرتی ہے تو جائز رشتوں کی توقیر و عزت بھی اس کا فرض ہے۔ چناں چہ وہ ایک شرعی رشتہ کو پوری سوسائٹی کے لیے ماں کی طرح محترم قرار دیتا ہے۔ جب تک قانون کی قینچی اس رشتہ کو کاٹ نہ دے، کسی کو اس حرمت کے توڑنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے ''شادی شدہ عورتیں تم پر حرام ہیں۔'' (النساء:۲۴) اس حرمت کو ختم کرنے والی ہر کوشش اسلام کی نگاہ میں انتہائی مبغوض اور سخت ناپسندیدہ ہے۔

نبی ﷺ کا ارشاد ہے:

لَیْسَ مِنَّا مَنْ خَبَّبَ اِمْرَأَۃً عَلٰی زَوْجِهَا اَوْ عَبْدًا عَلٰی سَیِّدِهٖ.[۳]	وہ شخص ہم میں سے نہیں جو کسی عورت کو اس کے خاوند سے برگشتہ کردے یا کسی غلام کو اس کے آقا سے۔

امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ''اگر کوئی شخص کسی کی بیوی سے خود نکاح کرنے یا

۱۔ ترمذی، ابواب الطلاق واللعان، باب ماجاء فی المختلعات۔ ابن ماجہ، ابواب الطلاق، باب کراهیۃ الخلع للمرأۃ۔

۲۔ حاکم، المستدرک: ۲/۱۹۹

۳۔ ابوداؤد، کتاب الطلاق، باب فی من خبب امرأۃ علی زوجها و رواہ النسائی وابن حبان فی صحیحہ و ابویعلیٰ والطبرانی۔ الترغیب والترهیب: ۳/۵۹

کسی دوسرے سے نکاح کرانے کے لیے اس کے شوہر کو قتل کر دیتا ہے تو خواہ عورت اس سازش میں شریک ہو یا نہ ہو، دونوں صورتوں میں اصولِ دین اور اس کی روح کا تقاضا یہ ہے کہ متعلقہ شخص کو حق نکاح سے محروم کر دیا جائے۔''[1]

اجتماعی احساس

انسان اپنے ماحول پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر اس کی زندگی میں کردار کا نور ہے تو اس سے بہت سی زندگیاں تب و تاب حاصل کرتی ہیں اور اگر وہ برا ہے تو اس کی برائی بھی اس کی ذات تک محدود نہیں رہتی، بلکہ اس کے ماحول میں پھیلتی ہے۔ اس طرح انسان اپنی سیرت و کردار سے دوسروں کو بناتا بھی ہے اور بگاڑتا بھی ہے، اس لیے جب تک ہر شخص یہ نہ محسوس کرے کہ وہ سوسائٹی کی سیرت و کردار کا محافظ اور نگراں ہے اس وقت تک اخلاق کی دنیا آباد نہیں ہو سکتی۔

اسلام فرد کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ تم سوسائٹی کے معمار ہو۔ تمھارا کام صرف اپنی سیرت کی تعمیر ہی نہیں بلکہ دوسروں کی اصلاح بھی ہے۔ تمھیں اپنے ماحول میں بااخلاق ہی نہیں، بلکہ معلّم اخلاق بن کر رہنا ہے۔ تمھارا فرض صرف اپنے کردار ہی کو بلند کرنا نہیں ہے، بلکہ دوسروں کو پستیِ کردار سے بچانا بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا واضح ارشاد ہے:

اَلاَ کُلُّکُمْ رَاعٍ وَ کُلُّکُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ فَالْاِمَامُ الَّذِیْ عَلَی النَّاسِ رَاعٍ وَ ھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ وَالرَّجُلُ رَاعٍ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِہٖ وَھُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِیَّتِہٖ وَالْمَرْأَۃُ رَاعِیَۃٌ عَلٰی اَھْلِ بَیْتِ

سن لو، تم میں کا ہر شخص نگراں ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال کیا جائے گا۔ امام جو لوگوں کا حاکم ہوتا ہے وہ نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ مرد اپنے گھر والوں کا نگراں ہے اور اس سے اس کی رعیت کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

---

[1] اقامۃ الدلیل علی ابطال التحلیل۔ المطبوع مع الفتاویٰ، صفحہ ۱۴۷، ۱۴۸

زَوْجِهَا وَ وَلَدِهٖ وَهِيَ مَسْئُوْلَةٌ عَنْهُمْ وَ عَبْدُ الرَّجُلِ رَاعٍ عَلٰى مَالِ سَيِّدِهٖ وَهُوَ مَسْئُوْلٌ عَنْهُ اَلاَ فَكُلُّكُمْ رَاعٍ وَ كُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ۔[1]

عورت اپنے شوہر کے گھر والوں اور اس کے بچوں کی نگراں ہے اور اس سے ان کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ غلام اپنے آقا کے مال کا نگراں ہے اور اس مال کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا (دوبارہ) سن لو، تم میں سے ہر ایک نگراں ہے اور تم میں سے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا۔

سوسائٹی کا دباؤ بہت سخت ہوتا ہے۔ اگر وہ اخلاق کی تخریب کی اجازت نہ دے تو کوئی شخص اس کی ہمت نہیں کرسکتا، لیکن اگر سوسائٹی کی مجموعی فضا خراب ہو تو ہر طرف سے فسق و فجور کا سیلاب امنڈ پڑتا ہے اور اخلاق و سیرت کے چشمے خشک ہونے لگتے ہیں۔

اسلام کی خوبی یہ ہے کہ وہ سوسائٹی کی اخلاقی حس کو اس قدر بیدار کرتا ہے کہ وہ کسی معمولی سی بداخلاقی کو بھی برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتی۔

ایک عورت خوب عطر اور خوشبو لگائے راستہ سے گزر رہی تھی کہ حضرت ابوہریرہؓ نے اسے دیکھ لیا۔ پوچھا، کیا مسجد سے آرہی ہو؟ اس نے کہا، ہاں! آپ نے دوبارہ سوال کیا: کیا مسجد جانے ہی کے لیے تم نے یہ خوشبو استعمال کی تھی؟ عورت نے اثبات میں جواب دیا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا کہ میں نے اپنے محبوب ابوالقاسم ﷺ کو فرماتے سنا ہے کہ جو عورت خوشبو لگا کر مسجد جائے اللہ تعالیٰ اس کی نماز نہیں قبول کرتا، جب تک کہ وہ پورے اہتمام سے اس طرح غسل نہ کرے جیسے جنابت سے غسل کیا جاتا ہے۔[2]

اسی طرح نبی ﷺ نے ام درداءؓ کو حمام سے آتے دیکھا تو ان کو حمام جانے

---

[1] بخاری، کتاب الاحکام، باب قولہ اللہ اطیعوا اللہ الخ۔ مسلم کتاب الامارۃ، باب ۲۰۔ ترمذی، کتاب الجہاد، باب ماجاء فی الامام۔

[2] ابوداؤد، کتاب الترجل، باب فی طیب المرأۃ للخروج

سے منع کرتے ہوئے فرمایا: جو عورت اپنے گھر کے علاوہ کسی اور جگہ کپڑے اتارتی ہے، وہ اس پردے کو چاک کرتی ہے جو اس کے اور اللہ کے درمیان ہے[۱]

اسلام انسان کی یہ ذمے داری سمجھتا ہے کہ جن لوگوں سے اس کے سماجی و رحمی اور معاشرتی تعلقات ہوں وہ ان کی اخلاقی نگرانی بھی کرے۔ یہ تعلقات جتنے گہرے اور قریبی ہوں انسان کی ذمے داری بھی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے نزدیک اپنے کسی عزیز کی عصمت دری انسان کی سیاہ کاریوں کی بدترین مثال ہے۔ بعض فقہاء ایسے شخص کی سزا قتل سے کم نہیں سمجھتے[۲]

یہی حال پڑوسی کی عورت کی عصمت پر دست درازی کا ہے۔ حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں:

قَالَ رَجُلٌ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ اَیُّ الذَّنْبِ اَکْبَرُ عِنْدَ اللّٰہِ قَالَ اَنْ تَدْعُوَ لِلّٰہِ نِدًّا وَھُوَ خَلَقَکَ قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ اَنْ تَقْتُلَ وَلَدَکَ خَشْیَۃَ اَنْ یَّطْعَمَ مَعَکَ قَالَ ثُمَّ اَیٌّ قَالَ اَنْ تَزْنِیَ حَلِیْلَۃَ جَارِکَ.[۳]

ایک شخص نے رسول اللہؐ سے سوال کیا کہ اللہ کے نزدیک سب سے بڑا گناہ کون سا ہے؟ آپؐ نے جواب دیا: سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرے حالاں کہ تنہا اس نے تجھ کو پیدا کیا ہے۔ اس نے پوچھا: اس کے بعد کون سا گناہ؟ آپؐ نے فرمایا: اس کے بعد سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تو اپنے بچہ کو اس خوف سے قتل کردے کہ وہ تیری روزی میں شریک ہوجائے گا (اور تجھ کو بھوکا رہنا پڑے گا)۔ اس نے پھر سوال کیا کہ ان دونوں گناہوں کے بعد کون سا گناہ سب سے بڑا ہے؟ آپؐ نے فرمایا کہ تو اپنے پڑوسی کی بیوی سے زنا کرے۔

زنا ہر حال میں ایک جرم ہے، اور انتہائی گھناؤنا جرم ہے لیکن جب اس کا

---

۱ مسند احمد: ۷/ ۵۰۴، حدیث نمبر ۲۶۴۹۸

۲ زاد المعاد: ۵/ ۱۵

۳ بخاری، کتاب الدیات، باب قول اللہ تعالیٰ ومن یقتل مومناً الخ۔ مسلم، کتاب الایمان، باب کون الشرک اقبح الذنوب۔

ارتکاب کوئی ایسا شخص کرے جسے سب سے زیادہ عفت و عصمت کا نگراں ہونا چاہیے تو اس جرم کی شناعت بھی دس گنا بڑھ جاتی ہے۔ یہ حدیث بتاتی ہے کہ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کی جان، مال اور عزت و آبرو کا فطری محافظ ہے۔ اگر وہی پڑوسی کی عزت و آبرو پر دست درازی کرے تو اس کا جرم دوسروں کے جرم سے زیادہ سنگین ہوگا اور خدا کے ہاں اس کی گرفت بھی زیادہ سخت ہوگی۔

ایک مرتبہ نبی ﷺ نے صحابہ سے پوچھا: زنا کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے؟ صحابہ نے جواب دیا کہ خدا اور اس کے رسول نے اس کو حرام کیا ہے اور وہ قیامت تک حرام ہی رہے گا۔ آپؐ نے فرمایا: دس عورتوں کے ساتھ زنا کرنا نسبتاً ہلکا جرم ہے، اس سے کہ انسان اپنے پڑوسی کی بیوی کا دامنِ عفت چاک کرے[1]

اسلامی قانون

آیئے، اب اسلامی قانون کا جائزہ لیں کہ وہ سوسائٹی کو کس طرح جنسی بے راہ روی سے بچاتا ہے۔

(۱) محارمِ ابدیہ

انسان پیدا ہوتے ہی سب سے پہلے اپنے ماں باپ، بھائی بہن اور دوسرے قریبی عزیزوں سے آشنا ہوتا ہے۔ یہ انسان کا قریب ترین ماحول ہے، جس میں وہ بڑھتا اور نشو ونما پاتا ہے۔ اس ماحول کو وہ اپنی جدوجہد سے نہیں پیدا کرتا، بلکہ یہ فطری طور پر اسے ملتا ہے۔ اگر اس ماحول کو اس سے چھین لیا جائے تو وہ کوئی ایسا ماحول نہیں پیدا کرسکتا جو اس کا بے لوث خادم ہو، جو اس کے رنج و راحت اور خوشی اور غم کو اپنا رنج و راحت اور خوشی اور غم سمجھے، جو زندگی کے تمام مراحل میں اس کا حقیقی معاون اور مددگار ہو۔ یہی وجہ ہے کہ انسان غیر شعوری طور پر اپنے اس قریبی ماحول کو ایک ایسی مدد سمجھتا

---

[1] مسند احمد: ۷/۱۵، حدیث نمبر ۲۳۳۴۲

رہا ہے، جو اس کی ساخت و پرداخت اور پرورش کے لیے غیب سے فراہم کی جاتی ہے۔ اس احساس نے اس ماحول کو ایک مقدس حرم کی حیثیت دے دی اور اس کے ساتھ انتہائی عقیدت اور محبت کے جذبات وابستہ ہوگئے۔

اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ انسان جس دائرہ میں شب و روز رہتا اور زندگی گزارتا ہے وہ اخلاقی خرابیوں سے بڑی حد تک محفوظ رہتا ہے، حالاں کہ اس دائرہ میں میل جول، بے تکلفی اور اختلاط کی کثرت کی وجہ سے ہر طرح کی بے راہ روی کے امکانات پائے جاتے ہیں۔

اسلام نے ان امکانات کو اور بھی گھٹا دیا ہے۔ اس نے قانون کے ذریعہ ان افراد کے درمیان جنسی تعلق کو ممنوع قرار دیا جو فطری طور پر ایک دوسرے سے قریب ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ اس نے ان افراد کا تعین بھی کردیا، جن سے جنسی تعلق جائز نہیں ہے، تاکہ نہ تو کوئی تقشّف پسند ایسے افراد کو ان میں شامل کردے، جن سے جنسی تعلق رکھنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے اور نہ کسی اباحت پسند کو یہ موقع ملے کہ وہ اس دائرہ کو بھی اپنی ہوس رانی کا نشانہ بنالے، جسے جنسی آوارگیوں سے پاک ہونا چاہیے[1]

(۲) خفیہ تعلقات کی ممانعت

اس مخصوص دائرہ سے باہر وہ صنفی روابط قائم کرنے کی اجازت دیتا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ آدمی ان تمام ذمے داریوں کو اٹھانے کا عہد کرے جو ان تعلقات سے لازمی طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ یہ تعلقات برملا اور معاشرہ کی آنکھوں کے سامنے وجود میں آئیں، تاکہ معاشرہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے میں فرد کی دست گیری کرے اور اگر فرد ان کی انجام دہی سے گریز کرے یا تساہل برتے تو اس سے مواخذہ ہوسکے۔

---

[1] اس کی تھوڑی سی تفصیل 'اسلام کا عائلی نظام' میں دیکھی جاسکتی ہے۔ ملاحظہ ہو 'قریبی رشتہ داروں کا تقدس' صفحہ: ۶۴، ۶۵۔ ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی پبلشرز، نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵، طبع ۲۰۰۸ء

قرآن مجید نے جہاں جنسی تعلق سے بحث کی ہے وہاں اس بات کی صاف تصریح کردی ہے۔ عورتوں سے متعلق ارشاد ہے:

وَلاَ مُتَّخِذَاتِ اَخْدَان (النساء:۲۵) اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والیاں۔

ایک جگہ مردوں کے بارے میں فرمایا:

وَلاَ مُتَّخِذِیْٓ اَخْدَان (المائدۃ:۵) اور نہ چوری چھپے آشنائی کرنے والے۔

آدمی ان تعلقات کو پوشیدہ اسی لیے رکھنا چاہتا ہے تاکہ سوسائٹی کا کوئی دباؤ اس پر نہ پڑے اور وہ ماحول کی عائد کردہ بندشوں سے بالکل آزاد رہے، کیوں کہ یہ بندشیں اس کی بے راہ روی میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ ان کے ٹوٹ جانے کے بعد وہ ہر وادی میں بھٹک سکتا ہے اور ان تعلقات اور ان کے نتائج کو جس رنگ میں چاہے بدل سکتا ہے۔ اسلام انسان کو اسی آوارگی سے بچانے کے لیے مجبور کرتا ہے کہ وہ اپنے اس تعلق کو خفیہ نہ رکھے، بلکہ اس کا اعلان کرے۔ ایک مرتبہ حضرت عمرؓ کے سامنے ایک ایسے نکاح کا ذکر آیا، جس کی شہادت صرف ایک مرد اور ایک عورت دے رہے تھے تو آپ نے فرمایا: یہ خفیہ نکاح ہے، اسے میں جائز نہیں کرسکتا۔ اگر نبی ﷺ یا حضرت ابوبکرؓ کا کوئی اسوہ میرے سامنے ہوتا تو میں (اس تعلق کو زنا کے حکم میں شامل کرکے) رجم کرتا۔[۱]

(۳) بیسوائی کے پیشہ پر قدغن

جنسی تعلقات کے سلسلے میں جائز حدود پر اصرار کرنے کے لیے لازمی ہے کہ بدکاری پر آمادہ کرنے والے محرکات کو معاشرہ سے ختم کیا جائے اور ایسی تمام راہیں بند کردی جائیں جو فکر و عمل کی آوارگی کا سبب بنتی ہیں، اس کے بغیر انسان کا صحیح راہ پر قائم رہنا دشوار ہے۔ کبھی نہ کبھی ناپاک طریقوں پر اس کے قدم پڑ ہی جائیں گے۔

اس مقصد کے لیے اسلام معاشرہ کو بیسوائی کی گندگی سے پاک کرتا ہے۔ وہ اس شاخ ہی کو کاٹ پھینکتا ہے، جس پر منحوس پرندے اپنے آشیانے تعمیر کرتے ہیں۔

---

[۱] موطا، امام مالک، کتاب النکاح، باب جامع ما لایجوز۔

عرب جاہلیت کی تہذیب نے باقاعدہ زنا کے اڈے قائم کر رکھے تھے، جہاں شہوت رانی کی تمام سہولتیں مہیا تھیں۔ سرمایہ دار اپنی لونڈیوں کو مجبور کرتے تھے کہ وہ اپنی عصمت فروخت کرکے ان کو پیسہ فراہم کریں اور ان کے حرص و آز کی بھوک مٹائیں۔

قرآن مجید نے اس ذلت آمیز کاروبار کو یک قلم ممنوع قرار دیا:

وَلاَ تُكْرِهُوْا فَتَيَاتِكُمْ عَلَى الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا لِّتَبْتَغُوْا عَرَضَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ مَنْ يُّكْرِهْهُّنَّ فَاِنَّ اللّٰهَ مِنْ بَعْدِ اِكْرَاهِهِنَّ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ○ (النور:۳۳)

دنیوی زندگی کے (حقیر) ساز و سامان کے حاصل کرنے کے لیے اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ عفت کی زندگی گزارنا چاہیں۔ اور جو انھیں مجبور کرے گا (اس کا وبال اس پر ہوگا) اور ان کو مجبور کرنے کے بعد (اللہ انھیں معاف کردے گا) اللہ غفور و رحیم ہے۔

''اگر وہ عفت کی زندگی گزارنا چاہیں'' کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ باعفت زندگی گزارنا نہ چاہیں تو انھیں اس پیشہ میں لگایا جاسکتا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ اپنی فطری شرافت اور اسلامی تعلیم و تربیت کے نتیجہ میں باعفت زندگی گزارنا چاہتی ہیں تو اس گندے کام میں انھیں لگانا اور اس سے مفاد دنیا حاصل کرنا تمھارے اخلاق و شرافت کی توہین ہے۔ وہ اگر آوارگی اختیار کرتی ہیں تو خود ذمے دار ہیں، لیکن تم نے ان کو مجبور کیا تو تم سے باز پرس ہوگی اور جبر و اکراہ کی وجہ سے اللہ انھیں معاف کردے گا۔

کبھی ایسا بھی ہوتا کہ گو مالک صراحتاً لونڈی کو عصمت فروشی کا حکم نہیں دیتا لیکن اس پر اتنی بھاری رقم کی ادائیگی لازم کردیتا کہ بے چاری کسی جائز طریقہ سے اس کو ادا نہیں کر پاتی۔ اس لیے اپنا جسم فروخت کرنے پر مجبور ہوتی۔ رسول اللہ ﷺ نے مالک کے اس ظالمانہ حق کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور بتایا کہ وہ لونڈی کو حدود عفت میں رکھتے ہوئے کوئی بھی کام کرانے اور اس کی اجرت کھانے کا مجاز ہے۔

رافع بن رفاعہؓ کہتے ہیں:

نَهٰی (رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ) عَنْ کَسْبِ الْاَمَةِ اِلَّا مَا عَمِلَتْ بِیَدِهَا وَ قَالَ هٰکَذَا بِاَصَابِعِهٖ نَحْوَ الْخُبْزِ وَالْغَزْلِ وَالنَّفْشِ.[۱]

رسول اللہ ﷺ نے لونڈی کی 'کمائی' کھانے سے منع کیا۔ الا یہ کہ وہ اپنے ہاتھ سے کوئی خدمت کرکے کمائے اور آپ نے اپنی انگلیوں سے اشارہ کرکے فرمایا: مثلاً روٹی پکانا، کاتنا اور روئی دھنکنا۔

رافع بن خدیجؓ کی روایت ہے:

نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنْ کَسْبِ الْاَمَةِ حَتّٰی یُعْلَمَ مِنْ اَیْنَ هُوَ.[۲]

رسول اللہؐ نے لونڈی کی کمائی کھانے سے منع فرمایا جب تک کہ قطعی طور پر یہ معلوم نہ ہو جائے کہ اُس نے کس طریقہ سے کمایا ہے۔

دورِ جاہلیت میں حرام کاری کے پیشہ کے لیے لونڈیاں مخصوص تھیں۔ اس لیے مذکورہ بالا آیت و احادیث میں ان کو اس پیشہ سے باز رکھنے کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن اگر نئی تہذیب کی روشنی 'شریف و مہذب' بیٹیوں سے یہ تجارت کراتی ہے تو اسلام کی تعلیمات اس کے بھی ناپاک و حرام ہونے کا اعلان کرتی ہیں۔ اسلام کسی کام کے کرنے والے کی شکل و صورت، حیثیت و مرتبہ اور خاندان و قبیلہ سے نہیں، بلکہ کام کی نوعیت سے بحث کرتا ہے۔ اسی لیے نبی ﷺ نے بعض دوسرے مواقع پر عام الفاظ میں بیسوائی کی آمدنی کو ناجائز قرار دیا ہے۔

حضرت مسعود انصاریؓ فرماتے ہیں:

اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ نَهٰی عَنْ ثَمَنِ الْکَلْبِ وَ مَهْرِ الْبَغِیِّ.[۳]

رسول اللہ ﷺ نے کتے کی قیمت اور بیسوائی کی آمدنی سے فائدہ اٹھانے سے منع فرمایا ہے۔

ایک دوسری حدیث کے الفاظ ہیں:

مَهْرُ الْبَغِیِّ خَبِیْثٌ[۴]

زانیہ کی آمدنی گندی اور ناپاک ہے۔

اس 'کاروبار' کے خلاف اسلامی علوم کے محققین کی رائے کتنی سخت ہے، اس کا

۱۔ ابوداؤد، ابواب الاجارۃ، باب فی کسب الاماء

۲۔ ابوداؤد، ابواب الاجارۃ، باب فی کسب الاماء

۳۔ بخاری، کتاب الاجارۃ، باب کسب البغی والاماء۔ مسلم، کتاب المساقاۃ والمزارعۃ، باب تحریم فضل بیع الماء

۴۔ ابوداؤد، ابواب الاجارۃ، باب فی کسب الحجام۔ ترمذی، ابواب البیوع، باب ثمن الکلب

اندازہ امام ابن تیمیہؒ کی حسب ذیل تصریح سے کیا جاسکتا ہے:

فَاَمَّا اِذَا كَانَ هُوَ يُرْسِلُهَا لِتَبْغِيَ وَ تُنْفِقَ عَلٰى نَفْسِهَا مِنْ مَهْرِ الْبِغَاءِ اَوْ يَأْخُذَ هُوَ شَيْئًا مِّنْ ذٰلِكَ فَهٰذَا مِمَّنْ لَعَنَهُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَ هُوَ فَاسِقٌ خَبِيْثٌ اٰذِنٌ فِي الْكَبِيْرَةِ وَ اٰخِذُ مَهْرَ الْبَغْيِ وَ لَمْ يَنْهَهَا عَنِ الْفَاحِشَةِ وَ مِثْلُ هٰذَا لاَ يَجُوْزُ اِقْرَارُهٗ بَيْنَ الْمُسْلِمِيْنَ بَلْ يَسْتَحِقُّ الْعُقُوْبَةَ الْغَلِيْظَةَ حَتّٰى يَصُوْنَ اِمَاءَهٗ وَ اَقَلُّ الْعُقُوْبَةِ اَنْ يُّهْجَرَ فَلاَ يُسَلَّمَ عَلَيْهِ وَ لاَ يُصَلّٰى خَلْفَهٗ اِذَا اَمْكَنَتِ الصَّلٰوةُ خَلْفَ غَيْرِهٖ وَ لاَ يُسْتَشْهَدَ وَلاَ يُوَلّٰى وَلاَيَةً اَصْلاً وَ مَنِ اسْتَحَلَّ ذٰلِكَ فَهُوَ كَافِرٌ مُرْتَدٌّ يُسْتَتَابُ فَاِنْ تَابَ وَ اِلَّا قُتِلَ وَ كَانَ مُرْتَدًّا لاَ تَرِثُهٗ وَرَثَتُهُ الْمُسْلِمُوْنَ وَ اِنْ كَانَ جَاهِلاً بِالتَّحْرِيْمِ عُرِّفَ ذٰلِكَ حَتّٰى تَقُوْمَ عَلَيْهِ الْحُجَّةُ فَاِنَّ هٰذَا مِنَ الْمُحَرَّمَاتِ الْمُجْمَعِ عَلَيْهَا۔[1]

اگر کوئی شخص اپنی لونڈی کو زنا کے لیے بھیجتا ہے تا کہ کمائے اور اپنے آپ پر خرچ کرے یا وہ خود اس کمائی میں شریک ہوتا ہے، ایسے شخص پر اللہ اور اس کے رسول نے لعنت بھیجی ہے۔ وہ فاسق و بدکردار ہے (کیوں کہ) اس نے ایک بہت بڑے گناہ کی اجازت دے رکھی ہے اور ایک فاحشہ کی آمدنی حاصل کر رہا ہے اور اسے اس فحاشی سے باز نہیں رکھتا، ایسے شخص کو قانوناً ساقط الاعتبار سمجھا جائے، بلکہ اسے مسلمانوں کے اندر رہنے ہی نہ دیا جائے۔ ایسا بدکردار انتہائی سخت سزا کا مستحق ہے یہاں تک کہ وہ اپنی لونڈیوں کو اس پیشہ سے باز رکھے۔ اس کی کم سے کم یہ سزا ہوسکتی ہے کہ اس سے تعلقات منقطع کر لیے جائیں، اس کو سلام نہ کیا جائے، اس کے پیچھے نماز نہ پڑھی جائے بشرطے کہ کوئی دوسرا امام مل سکتا ہو، اس کو گواہ نہ بنایا جائے اور اس کو قطعاً کوئی عہدہ نہ دیا جائے۔ اگر وہ اپنے اس عمل کو حلال سمجھتا ہے تو وہ کافر اور مرتد ہے، اس سے توبہ کرائی جائے گی، اگر وہ توبہ کر لے تو ٹھیک ہے ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔ اس کے ارتداد کی وجہ سے اس کے مسلم ورثاء اس کے مال کے وارث نہیں ہوں گے۔ اگر اس کو اس کی حرمت کا علم نہ ہو تو بتایا جائے گا تا کہ حجت پوری ہوجائے (اور پھر اس کے ساتھ اوپر والا معاملہ کیا جائے گا) کیوں کہ یہ ایسا فعل ہے، جس کی حرمت پر پوری امت کا اجماع ہے۔

---

[1] فتاویٰ ابن تیمیہ، طبع قدیم، جلد ۴، صفحہ ۲۴۵

(۴) آزادانہ اختلاط پر پابندی

آدمی بیسواؤں کے کوٹھوں اور معصیت کے مراکز سے آنکھیں میچ کر آگے بڑھ سکتا ہے، لیکن جہاں پورے معاشرہ کو بدکاری کے اڈے میں تبدیل کر دیا گیا ہو وہاں وہ کس طرف بھاگے؟ اپنے اخلاق و کردار کی حفاظت کے لیے کون سی دنیا آباد کرے؟ آج حال یہ ہے کہ ایک شخص خواہ بازار کا تاجر ہو یا کارخانہ کا ملازم، کالج کا طالب علم ہو یا آفس کا کلرک، وہ کسی ہوٹل میں بیٹھا ہو یا پارک میں سیر و تفریح کر رہا ہو، ہر جگہ صنف مقابل معصیت کا پیغام لیے موجود ہوتی ہے۔ زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں موجودہ تہذیب نے عورت اور مرد کے ایک ساتھ عمل دخل کو لازم نہ کر دیا ہو۔ یہی نہیں، بلکہ اس یک جائی کو اس قدر رنگین و جاذب بنا دیا ہے کہ قدم قدم پر نگاہیں بھٹکنے لگتی ہیں، اور عزم و ارادہ جواب دیتا جاتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرہ پر جنسی بھوک اور فاقہ کی کیفیت طاری ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شہوانیت اپنی تسکین کے لیے ہر طرف بھیک کا پیالہ لیے گھوم رہی ہو۔

جب تک عورت اور مرد کے آزادانہ اختلاط کو ختم نہیں کیا جاتا، معاشرہ اس کیفیت سے نجات نہیں پاسکتا۔ آگ اور روئی کا اتحاد ہمیشہ تباہی کا سبب بنا ہے۔ اسلام نے عورت اور مرد کے حدودِ کار بالکل جدا رکھے ہیں، اس لیے ایسے معاشرہ میں میل جول کے مواقع بہت کم آسکتے ہیں جو اسلام کی بنیاد پر قائم ہو اور اگر کبھی دونوں کو ایک ہی دائرہ میں کام کرنا پڑے تو اختلاط سے بچے رہنے کا اسلام سختی سے حکم دیتا ہے۔

عَنِ ابْنِ عُمَرؓ اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ نَھٰی اَنْ یَّمْشِیَ یَعْنِی الرَّجُلَ بَیْنَ الْمَرْأَتَیْنِ۔[1]

عبد اللہ بن عمرؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے اس سے منع فرمایا کہ کوئی مرد دو عورتوں کے درمیان میں چلے۔

ایک مرتبہ نبی ﷺ نے عورتوں اور مردوں کو خلط ملط ہوتے دیکھا تو عورتوں کو حکم دیا:

---

[1] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق

اِسۡتَأۡخِرۡنَ فَاِنَّهٗ لَيۡسَ لَكُنَّ اَنۡ تَحۡقُقۡنَ الطَّرِيۡقَ عَلَيۡكُنَّ بِحَافَّاتِ الطَّرِيۡقِ۔[۱]

پیچھے ہوجاؤ، کیوں کہ تمھیں بیچ راستہ پر قبضہ کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ تمھیں راستے کے کنارے کنارے چلنا چاہیے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عورتیں راستہ چلتے وقت اس قدر سمٹی ہوئی اور دیواروں سے لگی ہوئی گزرتی تھیں کہ بسا اوقات ان کے کپڑے دیواروں میں اٹک اٹک جاتے تھے۔[۲]

حضرت علیؓ فرماتے ہیں:

اَلَا تَسۡتَحۡيُوۡنَ فَاِنَّهٗ بَلَغَنِیۡ اَنَّ نِسَآءَكُمۡ يَخۡرُجۡنَ فِی الۡاَسۡوَاقِ يُزَاحِمۡنَ الۡعُلُوۡجَ۔[۳]

کیا تمھیں شرم نہیں آتی؟ مجھے اطلاع ملی ہے کہ تمھاری عورتیں بازاروں میں جاتی ہیں اور وہاں کفار سے ٹکراتی رہتی ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت عمرؓ بازار میں گشت لگا رہے تھے۔ دیکھا کہ ایک شخص کسی عورت سے مصروفِ گفتگو ہے۔ آپ نے تعزیراً اس پر درّے برسانے شروع کردیے۔ اتنے میں اس نے کہا: امیر المومنین! یہ تو میری بیوی ہے۔ یہ سن کر آپ کو بڑی ندامت ہوئی اور فرمایا: میں نے تمھارے ساتھ زیادتی کی ہے۔ اگر تم چاہو تو مجھ سے بدلہ لے سکتے ہو۔ اس نے کہا: میں نے معاف کیا۔[۴]

شریعت اختلاط ہی کو نہیں روکتی، بلکہ اس سے بھی منع کرتی ہے کہ عورت انتہائی شوخ لباس میں اور بن سنور کر گھر سے نکلے اور معاشرہ کی پاکیزہ فضا میں معصیت کے جراثیم پھیلائے۔

عَنۡ اَبِیۡ مُوۡسٰی عَنِ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ كُلُّ عَيۡنٍ زَانِيَةٌ وَ الۡمَرۡأَةُ اِذَا اسۡتَعۡطَرَتۡ فَمَرَّتۡ بِالۡمَجۡلِسِ

حضرت ابوموسیٰؓ نبی ﷺ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: ہر آنکھ زنا کرتی ہے (اس لیے عورت کو چاہیے کہ مردوں کی نگاہوں

---

[۱] ابوداؤد، کتاب الادب، باب فی مشی النساء مع الرجال فی الطریق

[۲] ابوداؤد، حوالہ سابق

[۳] مسند احمد: ۱/ ۱۲۳، حدیث نمبر ۱۱۱۸

[۴] العقد الفرید:

فَهِیَ کَذَا وَ کَذَا یَعْنِیْ زَانِیَةٌ.[1]

سے بچ کر گزر جائے) جب عورت عطر لگا کر کسی مجلس سے گزرتی ہے تو وہ ایسی اور ایسی ہوتی ہے، یعنی زانیہ ہوتی ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم اَیُّمَا امْرَأَةٍ اَصَابَتْ بَخُوْرًا فَلاَ تَشْهَدْنَ مَعَنَا الْعِشَآءَ.[2]

حضرت ابو ہریرہؓ راوی ہیں کہ رسول اللہؐ نے فرمایا: جو عورت خوشبو استعمال کرے وہ ہمارے ساتھ عشاء کی نماز میں شریک نہ ہو۔

امام نوویؒ فرماتے ہیں: مختلف احادیث کی بنا پر علماء نے کہا کہ عورت کو مسجد جانے کی اجازت اسی وقت دی جائے گی جب کہ وہ حسبِ ذیل امور کی پابندی کرے:

اَنْ لاَ تَکُوْنَ مُتَطَیِّبَةً وَلاَ مُتَزَیِّنَةً وَلاَ ذَاتَ خَلاَخِلَ لِیُسْمِعَ صَوْتَهَا وَلاَ ثِیَابًا فَاخِرَةً وَلاَ مُخْتَلِطَةً بِالرِّجَالِ وَلاَ شَابَّةً وَ نَحْوَهَا مِمَّنْ یَّفْتَتِنُ بِهَا وَ اَنْ لاَ تَکُوْنَ فِی الطَّرِیْقِ مَا یُخَافُ بِهٖ مَفْسَدَةٌ وَ نَحْوَهَا.[3]

خوشبو لگائے ہوئے نہ ہو، زیب و زینت سے آراستہ نہ ہو، ایسے پازیب نہ پہنے ہوئی ہو جن کی جھنکار سنائی دے، بھڑکیلے لباس میں ملبوس نہ ہو، مردوں کے ساتھ خلط ملط نہ ہو، جوان یا اس جیسی نہ ہو جس سے وہ فتنہ کا باعث بنے اور نہ راستہ میں کسی فساد کا خدشہ ہو۔ اسی قسم کے شرائط علماء نے بیان کیے ہیں۔

علامہ ابن الہمام حنفیؒ فرماتے ہیں:

وَ حَیْثُ اَبَحْنَا لَهَا الْخُرُوْجَ فَاِنَّمَا یُبَاحُ بِشَرْطِ عَدَمِ الزِّیْنَةِ وَ تَغْیِیْرِ الْهَیْئَةِ اِلٰی مَا لاَ یَکُوْنُ دَاعِیَةً اِلٰی نَظَرِ الرِّجَالِ وَالْاِسْتِمَالَةِ.[4]

جب ہم یہ کہتے ہیں کہ عورت کے لیے گھر سے نکلنا جائز ہے تو یہ جواز اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ زیب و زینت کے ساتھ نہیں نکلے گی اور ایسی ہیئت میں ہوگی، جو مردوں کو دیکھنے اور مائل ہونے پر نہ اُبھارے۔

---

[1] ترمذی، ابواب الآداب، باب ماجاء فی کراہیۃ خروج المرأۃ متعطرۃ۔
[2] ابوداؤد، کتاب الترجل، باب فی المرأۃ تتطیب للخروج۔
[3] شرح مسلم: ۱/ ۱۸۳ [4] فتح القدیر: ۴/ ۳۵۸

امام ابن قیمؒ کی حسب ذیل تصریحات شریعت کے منشا کی پوری پوری تائید کرتی ہیں:

اِنَّ وَلِیَّ الْاَمْرِ یَجِبُ عَلَیْهِ اَنْ یَّمْنَعَ مِنْ اِخْتِلَاطِ الرِّجَالِ بِالنِّسَآءِ فِی الْاَسْوَاقِ وَ الْفُرُوْجِ وَ مَجَامِعِ الرِّجَالِ فَالْاِمَامُ مَسْئُوْلٌ عَنْ ذٰلِکَ وَالْفِتْنَةُ بِهٖ عَظِیْمَةٌ قَالَ صلی اللہ علیہ وسلم مَا تَرَکْتُ بَعْدِیْ فِتْنَةً اَضَرَّ عَلَی الرِّجَالِ مِنَ النِّسَآءِ وَ فِیْ حَدِیْثٍ اٰخَرَ اَنَّهٗ قَالَ لِلنِّسَآءِ لَکُنَّ حَافَّاتُ الطُّرُقِ وَ یَجِبُ عَلَیْهِ مَنْعُ النِّسَآءِ مِنَ الْخُرُوْجِ مُتَزَیِّنَاتٍ مُتَجَمِّلَاتٍ وَ مَنْعُهُنَّ مِنَ الثِّیَابِ الَّتِیْ یَکُنَّ بِهَا کَاسِیَاتٍ عَارِیَاتٍ کَالثِّیَابِ الْوَاسِعَةِ وَالرِّقَاقِ وَ مَنْعُهُنَّ مِنَ حَدِیْثِ الرِّجَالِ فِی الطُّرُقَاتِ وَ مَنْعُ الرِّجَالِ مِنْ ذٰلِکَ وَ اِنْ رَأی وَلِیُّ الْاَمْرِ اَنْ یُّفْسِدَ عَلَی الْمَرْأَةِ اِذَا تَجَمَّلَتْ وَ تَزَیَّنَتْ ثِیَابَهَا بِحِبْرٍ وَ نَحْوِهٖ فَقَدْ رَخَّصَ فِیْ ذٰلِکَ بَعْضُ الْفُقَهَاءِ وَ اَصَابَ وَ هٰذَا مِنْ اَدْنٰی عُقُوْبَتِهِنَّ

حاکم کا فرض ہے کہ وہ بازاروں، کھلے مقاموں اور مردوں کے مجمعوں میں مردوں کو عورتوں کے ساتھ خلط ملط ہونے سے باز رکھے۔ اس لیے کہ امام اس سلسلے میں خدا کے یہاں جواب دہ ہے، کیوں کہ یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے (اور فتنہ کی روک تھام امام پر لازمی ہے)۔ نبیؐ نے فرمایا: میں نے اپنے بعد مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر اور کوئی فتنہ نہیں چھوڑا۔ ایک دوسری حدیث میں آپ نے عورتوں سے فرمایا: ”تمھیں راستہ کے کناروں پر چلنا چاہیے۔“ امام کی یہ بھی ذمے داری ہے کہ عورتوں کو آراستہ پیراستہ ہوکر نکلنے سے منع کرے اور انھیں ایسے کپڑوں میں ملبوس ہوکر نکلنے کی اجازت نہ دے جن کے پہننے کے بعد بھی وہ عریاں معلوم ہوتی ہوں۔ مثلاً چوڑے چوڑے اور پتلے کپڑے اور راستوں میں عورتوں کو مردوں سے گفتگو کرنے اور مردوں کو عورتوں سے گفتگو کرنے سے روکنا بھی اس پر ضروری ہے۔ بعض فقہاء کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ جب عورت بن سنور کر باہر نکلے تو امام کو یہ حق ہے کہ روشنائی وغیرہ سے اس کے کپڑے

اَلْمَالِيَّةِ وَ لَهُ اَنْ يَّحْبِسَ الْمَــرْأَةَ اِذَا اَكْثَرَتِ الْخُرُوْجَ مِنْ مَنْزِلِهَا وَلاَ سِيَّمَا اِذَا خَرَجَتْ مُتَجَمِّلَةً بَلْ اِقْرَارُ النِّسَآءِ عَلٰى ذٰلِكَ اِعَانَةٌ لَّهُمْ عَلَى الْاِثْمِ وَ الْمَعْصِيَةِ وَاللّٰهُ سَائِلٌ وَلِيَّ الْاَمْرِ عَنْ ذٰلِكَ وَ قَدْ مَنَعَ اَمِيْرُ الْمُؤْمِنِيْنَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِؓ النِّسَآءَ مِنَ الْمَشْيِ فِيْ طَرِيْقِ الرِّجَالِ وَ الْاِخْتِلاَطِ بِهِمْ فِي الطَّرِيْقِ فَعَلٰى وَلِيِّ الْاَمْرِ اَنْ يَّقْتَــدِيَ بِهٖ فِي ذٰلِكَ[1]

خراب کردے، یہ بہت ہی ہلکی مالی سزا ہے۔ اگر عورت (بلا ضرورت) بار بار گھر سے باہر گھومنے لگے خصوصاً بھڑکیلے لباس میں، تو امام کو اسے قید کرنے کا بھی حق حاصل ہے بلکہ عورتوں کو اس حالت پر چھوڑ دینا ان کے ساتھ معصیت میں تعاون کرنے کے مترادف ہے۔ اللہ تعالیٰ ذمہ دار سے اس کے سلسلے میں بازپرس کرے گا۔ حضرت عمرؓ نے عورتوں کو مردوں کے راستہ (یعنی راستہ کے بیچ) میں چلنے اور ان کے ساتھ خلط ملط ہونے سے روک دیا تھا۔ اس معاملہ میں حاکم کو حضرت عمرؓ کی اقتدا کرنا ضروری ہے۔

(۵) فحاشی کی اشاعت کا عدمِ جواز

بدکاری کی نشر و اشاعت، عورت اور مرد کے بے حجابانہ میل جول سے کچھ کم فتنہ انگیز نہیں ہے۔ خیالات و جذبات کے بنانے اور بگاڑنے میں پبلسٹی کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ آدمی کے پاس فکر، احساس اور جذبات کا جو کچھ سرمایہ ہے نشر و اشاعت کے ذرائع، اس کا مصرف متعین کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس پونجی کو کس جذبہ کی تسکین میں لگانا چاہیے۔

عفت کی زندگی اسی وقت گزاری جا سکتی ہے جب کہ بدکاری کی طرف دعوت دینے والی زبان کاٹ دی جائے اور معصیت کے چرچوں کو بند کر دیا جائے، جس سوسائٹی میں تعلیمی ادارے عفت و پاک بازی کے تصور سے نا آشنا ہوں، ریڈیو اور اخبار و رسائل بدکاری کے اعلاچی بنے ہوئے ہوں، ادب اور آرٹ کے نام پر معصیت پھیلائی

---

[1] الطرق الحکمیۃ فی السیاسۃ الشرعیۃ، صفحہ ۲۵۸، ۲۵۹

جا رہی ہو، وہاں کیسے ممکن ہے کہ انسان خواہشاتِ نفس کی اتباع سے بچا رہے۔ جہاں جذبات میں آگ لگانے والی بے شمار قوتیں کام کر رہی ہوں وہاں آدمی اپنے دامن عفت کی کس طرح حفاظت کرے؟ جس تہذیب میں دن ہو کہ رات، گھر ہو یا بازار، تنہائی ہو یا بھری محفل، ہر جگہ ہوس پرستی کی ترغیب دی جا رہی ہو، وہاں آدمی گناہ سے اجتناب کرنا چاہے تو بھی کیسے کرے؟

اسلام کے آنے سے قبل عرب کا یہی کچھ حال تھا۔ ان کی مجلسوں میں اخلاق و شرافت کا ایک طرح سے مذاق اڑایا جاتا تھا۔ شاعر اپنی شاعری سے سفلی جذبات کو برانگیختہ کرنے کا کام لے رہے تھے، ادیب اپنے ادب کے ذریعے بدکاری کے مختلف مراحل اور کیفیات کو اس فحش طریقہ سے بیان کرتے تھے کہ کسی شریف انسان کے لیے ان کا زبان پر لانا بھی گراں گزر سکتا ہے۔

اسلام نے اعلان کیا کہ معصیت و فحاشی کی اشاعت، خواہ زبان وقلم سے ہو یا آرٹ کے نمونوں اور تمدن کے آثار سے، اس کا اظہار بھری محفلوں میں ہو یا انفرادی صحبتوں میں، یہ ایک جرم ہے اور انتہائی گھناؤنا جرم، جسے کسی طرح برداشت نہیں کیا جاسکتا:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُحِبُّوْنَ اَنْ تَشِیْعَ الْفَاحِشَةُ فِی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَھُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ وَ اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ○ (النور:۱۹)

جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان والوں میں بے حیائی پھیلے بلاشبہ ان کے لیے دنیا اور آخرت میں درد ناک عذاب ہے (اور اس کی مصلحت) اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

عطاء تابعیؒ کہتے ہیں:

عَلٰی مَنْ اَشَاعَ الْفَاحِشَةَ نِکُلٌ وَ اِنْ صَدَقَ۔[۱]

جو شخص بے حیائی پھیلائے اسے عبرت ناک سزا دی جائے گی خواہ وہ سچا ہی کیوں نہ ہو۔

---

[۱] ابن حزم، المحلیٰ: ۲۸۱/۱۱

بعض لوگ جائز تعلقات کے مختلف احوال و کیفیات کی بھی اس انداز سے تصویر کشی کرتے ہیں کہ سننے والے کے حیوانی جذبات جاگ اٹھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی سختی سے ممانعت فرمائی ہے۔ آپؐ کا ارشاد ہے:

اِنَّ مِنْ اَشَرِّ النَّاسِ مَنْزِلَةً يَوْمَ الْقِيَامَةِ الرَّجُلُ يُفْضِىْ اِلٰى اِمْرَأَتِهٖ ثُمَّ يَنْشُرُ سِرَّهَا۔[1]

قیامت کے دن تمام لوگوں میں بدترین ٹھکانا اس شخص کا ہوگا، جو اپنی بیوی سے ہم بستری کرے اور اس کی خفیہ حالت کو پھیلاتا پھرے۔

ایک مرتبہ آپؐ نے نماز کے بعد حاضرین سے سوال کیا کہ جب تم میں سے کوئی اپنی بیوی سے مجامعت کرتا ہے تو کیا پردہ لٹکاتا اور دروازہ بند کرلیتا ہے؟ لوگوں نے جواب دیا: ہاں۔ پھر آپؐ نے پوچھا: کیا وہ اس کے بعد لوگوں میں بیٹھے اس تعلق کی کیفیت پر گفتگو نہیں کرتا؟ یہ سن کر سب لوگ خاموش ہوگئے۔ یہی سوال دوبارہ آپؐ نے عورتوں کے مجمع سے کیا۔ وہاں بھی سکوت طاری رہا۔ لیکن ایک نوجوان لڑکی اٹھی اور اس نے کہا: یا رسول اللہ! عورتیں اور مرد سب کے سب آپس میں ایسی گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ لڑکی کا جواب سننے کے بعد آپؐ نے فرمایا:

هَلْ تَدْرُوْنَ مَا مَثَلُ ذٰلِكَ فَقَالَ اِنَّمَا مَثَلُ ذٰلِكَ مَثَلُ شَيْطَانَةٍ لَقِيَتْ شَيْطَاناً فِي السِّكَّةِ فَقَضٰى مِنْهَا حَاجَتَهٗ وَالنَّاسُ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْهِ اَلاَ اِنَّ طِيْبَ الرِّجَالِ مَا ظَهَرَ رِيْحُهٗ وَ لَمْ يَظْهَرْ لَوْنُهٗ وَ طِيْبَ النِّسَاءِ مَا ظَهَرَ لَوْنُهٗ وَلَمْ يَظْهَرْ رِيْحُهٗ۔[2]

معلوم ہے اس کی مثال کیسی ہے؟ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی گلی میں کسی مادہ شیطان کی نر شیطان سے ملاقات ہوجائے اور وہ اسے پکڑ کر وہیں لوگوں کی آنکھوں کے سامنے اپنی خواہش پوری کرنے لگے۔ سن لو (بے حیائی اور فحاشی کا اشتہار ہر طریقہ سے ہوتا ہے یہاں تک کہ زیب و زینت سے بھی، اس لیے) مردوں کا عطر وہ ہے، جس کی خوشبو ظاہر ہو اور رنگ نمایاں نہ ہو اور عورتوں کے لیے ایسی خوشبو مناسب ہے، جس کا رنگ تو ظاہر ہو لیکن خوشبو نہ پھیلے۔

---

[1] مسلم، کتاب النکاح، باب تحریم افشاء سر المرأۃ

[2] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب ما یکرہ من ذکر الرجل ما یکون من اصابۃ اہلہ

یہی بات حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ کی ایک روایت میں بیان ہوئی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لاَ تُبَاشِرُ الْمَرْأَۃُ الْمَرْأَۃَ لِتَنْعَتَھَا لِزَوْجِھَا کَاَنَّمَا یَنْظُرُ اِلَیْھَا۔[1]

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی عورت کسی دوسری عورت کے ساتھ ایک چادر میں نہ سوئے کہ بعد میں وہ اس کے جسم کی نزاکتوں کا حال اپنے شوہر سے اس طرح بیان کرنے لگے گویا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے۔

(۶) تعزیر

ان ساری اصلاحات کے بعد اگر کوئی فرد یا جماعت، عفت کی راہ کا پتھر ثابت ہو تو اسلام پوری قوت کے ساتھ اسے اکھاڑ پھینکتا ہے۔ وہ ایسی کوششوں کو برگ و بار لانے کا موقع ہی نہیں دیتا جو انسانیت کی کشتی کو معصیت کے منجدھار کی طرف لے جارہی ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کے دورِ مسعود میں منافقین اپنے کردار سے اس بات کی گواہی دے رہے تھے کہ وہ سوسائٹی کو باعفت دیکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ انسانیت کا جو قافلہ اخلاق و شرافت کی طرف بڑھ رہا ہے اس کو اپنی منزل سے بیگانہ کردیں۔ قرآن مجید نے ان فتنہ پردازوں کی سخت تہدید کی اور آگاہ کیا کہ وہ اپنی روشِ بد سے باز آجائیں، ورنہ ان کے ارادوں کے رو بہ عمل آنے سے پہلے ہی ان کا سر کچل دیا جائے گا۔

لَئِنْ لَّمْ یَنْتَہِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَۃِ لَنُغْرِیَنَّکَ بِھِمْ ثُمَّ لاَ یُجَاوِرُوْنَکَ فِیْھَا اِلاَّ قَلِیْلاً۝

منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں مرض ہے، اور دلوں کو ہلا دینے والی باتیں مدینہ میں پھیلانے والے اگر اپنی روش سے باز نہ آئیں تو ہم تجھ کو (اے محمدؐ) ان پر مسلط کردیں گے۔ پھر وہ تیرے قریب کم ہی

---

[1] ابوداؤد، کتاب النکاح، باب مایؤمر بہ من غض البصر۔

مَلْعُوْنِيْنَ اَيْنَمَا ثُقِفُوْا اُخِذُوْا وَ قُتِّلُوْا تَقْتِيْلاً○ (الاحزاب: ۶۰، ۶۱)

رہ سکیں گے۔ پھٹکار ہے ان پر جہاں کہیں وہ پائے جائیں، پکڑے جائیں اور بری طرح قتل کیے جائیں۔

حضرت عمرؓ نے ایسے افراد کو جلا وطن کر دیا تھا جو معاشرہ کو بگاڑنے میں مصروف تھے۔ جعدۃ السلمیٰ نام کے ایک صاحب تھے۔ جب مجاہدین محاذ جنگ پر ہوتے تو یہ ان کی عورتوں کو شہر سے باہر بقیع کی طرف لے جاتے اور ان سے گفتگو کرتے رہتے۔ مجاہدین کو اس کی اطلاع ملی تو انھوں نے حضرت عمرؓ کو صورتِ حال لکھ کر بھیجی۔ آپ نے فوراً ان صاحب کو مدینہ سے نکال باہر کیا۔[1]

ایک رات حضرت عمرؓ پہرہ دے رہے تھے کہ ایک عورت کو یہ شعر پڑھتے سنا:

هَلْ مِنْ سَبِيْلٍ اِلٰى خَمْرٍ فَاشْرَبُهَا اَوْ مِنْ سَبِيْلٍ اِلٰى نَصْرِ بْنِ حَجَّاجٍ

کیا شراب پینے کی کوئی صورت نکل سکتی ہے اور نصر بن حجاج تک پہنچنے کا کوئی طریقہ ممکن ہے؟

دوسرے دن آپ نے نصر بن حجاج کو طلب کیا۔ حاضر ہوا تو دیکھا کہ وہ بہت ہی حسین و جمیل ہے۔ اس سے کہا: ذرا اپنے بال ٹھیک کرلو۔ جب اس نے بال ٹھیک کیے تو اس کی خوب صورتی اور بڑھ گئی۔ پھر آپ نے کہا: اچھا تو عمامہ باندھ لو۔ اس نے عمامہ باندھا تو اس کے حسن میں مزید اضافہ ہوگیا۔

گزشتہ رات اس عورت کی بے کلی اور حسرت بھری تمنا صاف ظاہر کر رہی تھی کہ نصر بن حجاج اور اس کے درمیان ناجائز محبت راہ پاچکی ہے، اس لیے آپ نے اس کی ضرورت کا انتظام کرکے اسے بصرہ بھیج دیا۔ کیوں کہ مدینہ میں اس کی موجودگی سے اس کا قوی امکان تھا کہ دونوں معصیت میں مبتلا ہوں۔[2]

مدینہ میں ایک مخنث ضرورت پر بغیر کسی روک ٹوک کے گھروں میں آجایا کرتا تھا، کیوں کہ اس کے بارے میں لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ صنفی داعیات سے خالی ہے۔

---

[1] فتح الباری: ۱۴/ ۱۳۰

[2] ابن حجر، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ: ۳/ ۵۸۵

ایک مرتبہ وہ حضرت ام سلمہؓ کے بھائی عبد اللہ سے کہہ رہا تھا کہ اگر طائف فتح ہوتو میں تمھیں فلاں پیکرِ حسن و جمال دکھاؤں گا۔ پھر وہ اس عورت کے حسن کا اس انداز سے نقشہ کھینچنے لگا جس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ صنفی رجحانات رکھتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے اتفاق سے اس کی یہ گفتگو سن لی۔ آپؐ نے ایک طرف ازواجِ مطہرات سے فرمایا کہ یہ کبھی تمھارے پاس نہ آنے پائے[1] اور دوسری طرف بعض روایات کے مطابق اسے مدینہ سے باہر صحرا میں بھیج دیا۔[2]

حضرت عمرؓ نے بھی ایک مخنث کو جلا وطن کیا تھا۔[3]

حضرت ابوبکرؓ کے بارے میں بھی اسی قسم کا ایک اقدام منقول ہے۔[4]

(۷) رجم اور کوڑوں کی سزا

بدکاری کی راہ میں جو شخص جتنا آگے بڑھتا جائے، اسلام کا قانون بھی اس کے حق میں اتنا ہی سخت ہوتا جاتا ہے۔ عشق و محبت کے تذکروں پر وہ انسان کو جلاوطن کرتا ہے تو عفت شکنی پر برملا دُرّے لگانے کا حکم دیتا ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنے جذبہ کی آسودگی کے لیے جائز ذریعہ رکھتے ہوئے ناجائز طریقوں سے لذت حاصل کرتا پھرے تو اسے اس قابل نہیں سمجھتا کہ وہ کسی پاکیزہ سوسائٹی میں زندہ سلامت چلے پھرے۔ اس کے نزدیک ایسے ناپاک عنصر سے معاشرہ کو پاک کرنا ضروری ہے۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِىْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ	زنا کرنے والی اور زنا کرنے والا ان میں
وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِـاَةَ جَلْـدَةٍ وَّلَا	سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور اللہ کے
تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِىْ دِيْنِ اللّٰهِ	قانون کے نفاذ میں تمھارے اندر کوئی نرمی

---

[1] بخاری، کتاب المغازی، باب غزوۃ الطائف۔ مسلم، کتاب السلام، باب منع المخنث من الدخول علی النساء الاجانب۔

[2] ابوداؤد، کتاب اللباس، باب فی قولہٖ غیر اولی الاربۃ

[3] بخاری، کتاب اللباس۔ [4] بیہقی، السنن الکبریٰ: ۸/۲۹۱

اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ○ (النور:۲)

نہیں ہونی چاہیے، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو اور دونوں کی سزا کے وقت مومنین کی ایک جماعت کو موجود ہونا چاہیے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کی تشریح میں فرمایا کہ یہ حکم بے شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے ہے۔ جو شخص شادی کے بعد زنا کا ارتکاب کرے اسے رجم کیا جائے گا۔

عَنْ عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ خُذُوْا عَنِّىْ خُذُوْا عَنِّىْ فَقَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيْلاً اَلْبِكْرُ بِالْبِكْرِ جَلْدُ مِأَةٍ وَّ نَفْىُ سَنَةٍ. اَلثَّيِّبُ بِالثَّيِّبِ جَلْدُ مِأَةٍ وَّالرَّجْمُ.[1]

عبادہ بن صامتؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا: لوسنو میرے اس حکم کو۔ لو سنو میرے اس حکم کو۔ اللہ نے زانی عورتوں کے لیے صورت نکال دی ہے۔ جب کسی دوشیزہ کا کسی مجرد شخص سے زنا ہو تو دونوں کو سو کوڑے مارے جائیں گے اور ایک سال کے لیے جلا وطن کیا جائے گا اور اگر کوئی شادی شدہ عورت کسی شادی شدہ مرد سے زنا کرے تو دونوں کو سو کوڑے اور رجم کی سزا دی جائے گی۔

اس حدیث کی بنا پر امام احمدؒ، اسحاقؒ اور داؤد ظاہریؒ کہتے ہیں کہ شادی شدہ شخص اگر زنا کرے تو اس کو پہلے کوڑے لگائے جائیں گے، پھر رجم کیا جائے گا۔ لیکن امام ابوحنیفہؒ، ابو یوسفؒ، زفرؒ، محمدؒ، امام شافعیؒ، امام مالکؒ، ابن ابی لیلیٰؒ، اوزاعیؒ، ثوریؒ، حسن بن صالحؒ وغیرہ جمہور کی رائے یہ ہے کہ رجم کے ساتھ کوڑوں کی سزا نہیں دی جائے گی۔

بے شادی شدہ شخص اگر بدکاری کا مرتکب ہو تو امت کا اجماع ہے کہ اسے سو کوڑے مارے جائیں گے، لیکن فقہاء کے خیالات اس امر میں مختلف ہیں کہ جلاوطنی جزء حد ہے یا نہیں؟ امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ زانی خواہ مرد ہو یا عورت، اگر اس کی شادی نہیں ہوئی ہے تو اس کو سو کوڑوں کی سزا بھی دی جائے گی اور

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحدود، باب حد الزنا۔ اس مفہوم کی روایات مستند طریقہ سے مروی ہیں اور صحاح کی تمام کتابوں میں موجود ہیں۔ اس لیے سوائے خوارج اور بعض معتزلہ کے تمام امت کا حدِّ رجم پر اجماع ہے۔ ملاحظہ ہو نیل الاوطار، جلد ۷/صفحہ ۲۴۹

ایک سال کے لیے جلا وطن بھی کیا جائے گا۔ امام شافعیؒ اس میں اتنا اور اضافہ کرتے ہیں کہ زانی غلام ہے تو اس کو صرف چھ ماہ کے لیے جلا وطن کیا جائے گا۔

امام مالکؒ اور امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں کہ جلا وطنی کی سزا صرف مردوں کو دی جائے گی، عورتوں کو نہیں۔ فقہاء احناف جلا وطنی کو جزء حد نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق امام کی رائے اور وقت کے مصالح سے ہے۔ جن حالات میں امام ضروری سمجھے گا اس پر عمل کرے گا اور جب اس کو مملکت اور اسلام کے لیے نقصان دہ خیال کرے گا، عمل نہیں کرے گا۔[1]

جلاوطنی کے دو اہم مقصد ہیں، ایک تو یہ کہ مجرم کے حق میں حالات ناسازگار کر دیے جائیں او اسے ایسے ماحول سے ہٹا دیا جائے جہاں معصیت کے محرکات موجود ہوں اور جہاں رہتے ہوئے اس کے لیے برائی سے دامن بچانا دشوار ہو رہا ہو۔ اس کا دوسرا مقصد یہ ہے کہ مجرم کو راہِ راست پر آنے کے مواقع فراہم کیے جائیں۔ کیوں کہ وطن سے دوری اور آرام و آسائش سے محرومی آدمی کے جنسی جذبات کو اُبھرنے نہیں دیتی۔ زندگی کی حقیقی کلفتوں میں اس کا موقع کم ہی ملتا ہے کہ انسان اپنی جنسی خواہش کی طرف توجہ کرے۔

ان تفصیلات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام چند خاص حدود ہی کے اندر جنسی تسکین کی اجازت دیتا ہے۔ ان حدود سے باہر جو شخص قدم رکھے اسلام اس کے خلاف سخت سے سخت اقدام کرنے سے بھی نہیں چوکتا۔ وہ یہ ضرور چاہتا ہے کہ انسان اپنے فطری جذبہ کی آسودگی کا سامان کرے اور اس کے لیے معاشرہ کو تمام سہولتیں بہم پہنچانے کا حکم بھی دیتا ہے، لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دیتا کہ انسان انسانیت کا لباس ہی اُتار پھینکے اور معاشرہ کو حیوانیت کا مسکن بنا دے۔ وہ انسان جیسی کائنات کی عزیز ترین متاع کو بے دردی کے ساتھ ختم کر دینا پسند کرتا ہے، لیکن اس کو یہ گوارا نہیں کہ سوسائٹی میں زنا کے مہلک جرثومے پرورش پاتے رہیں۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھی جائے، جصاص، احکام القرآن: ۳/ ۳۳۳ تا ۳۳۸۔ شوکانی، نیل الاوطار: ۷/ ۲۴۹-۲۵۶۔

کتابیات

کتاب میں جہاں قرآن مجید کی آیات آئی ہیں، ان کے نیچے سورتوں کے نام اور آیات کے نمبر دے دیے گئے ہیں۔ قرآن مجید کے علاوہ جن کتبِ مآخذ سے استفادہ کیا گیا ہے، حواشی میں ان کے نام، جو کتاب ایک سے زیادہ جلدوں میں ہے اس کی جلد اور صفحات کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہاں موضوع کے لحاظ سے کتاب اور مصنف کا پورا نام، سن وفات اور کتاب کے پیشِ نظر نسخے کے مطبع اور سن طباعت کی تفصیل دی جا رہی ہے۔ حدیث کی جن کتابوں کے حوالے کتب و ابواب کی صراحت کے ساتھ دیے گئے ہیں، ان کے مطابع وغیرہ کے ذکر کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ عہد نامہ قدیم و جدید کے حوالے برسرِ موقع دے دیے گئے ہیں۔

۱- قرآن مجید

۲- عہد نامہ قدیم و جدید

تفسیر و احکام القرآن

۳- آلوسی: شهاب الدين السيد محمود الآلوسی البغدادی (م ۱۲۷۰ھ) روح المعانی فی تفسیر القرآن العظیم والسبع المثانی۔ ادارة الطباعة المنيرية، مصر، دار الكتب العلمية بيروت، لبنان، ۱۹۹۴ء

۴- ابن عطية: عبد الحق بن غالب بن عبد الرحمن بن عطية المُحاربی (م ۵۴۲ھ) المُحرر الوجيز فی تفسير الكتاب العزيز، طبع دولة قطر

۵- ابن کثير: ابو الفداء عماد الدين اسماعيل بن كثير الدمشقی (م۷۷۴ھ)

تفسیر القرآن العظیم، تحقیق: دکتور السید محمد السید وغیرہ، دار الحدیث القاھرۃ، ۱۴۲۶ھ/۲۰۰۵ء

۶- ابن المنیّر: ناصر الدین احمد بن محمد بن منصور المنیر الاسکندری المالکی (م۶۸۳ھ) الاِنتصاف فیما تضمنه الکشاف من الاعتزال، علی ھامش تفسیر الکشاف للزمخشری، مطبعة مصطفی البابی الحلبی و اولادہ مصر، ۱۳۹۲ھ/۱۹۷۲ء

۷- ابو السعود: ابو السعود محمد بن محمد بن مصطفی العمادی الحنفی (م۹۸۲ھ) ارشاد العقل السلیم الٰی مزایا الکتاب الکریم، علی ھامش التفسیر الکبیر للرازی، المطبعة العامرۃ الشرقیة، مصر۔ ۱۳۰۸ھ

۸- بغوی: ابو محمد الحسین بن مسعود الفرّاء البغوی (م۵۱۶ھ) معالم التنزیل، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان۔ ۱۹۹۵ء

۹- بیضاوی: القاضی ناصر الدین عبد اللّٰه بن عمر البیضاوی الشافعی (م۶۸۵ھ) انوار التنزیل و اسرار التاویل، دار الکتب العلمیة بیروت، ۱۹۸۸ء

۱۰- پانی پتی: القاضی محمد ثناء الله العثمانی المظھری البانی بتی الحنفی (م۱۲۲۵ھ) التفسیر المظھری، مطبع ندوۃ المصنفین، دھلی

۱۱- تھانوی: محمد أشرف علی تھانوی (م۱۳۶۲ھ) بیان القرآن، تاج پبلشرز دھلی، ۱۹۷۸ء

۱۲- جصّاص: ابو بکر احمد بن علی الجصّاص الرازی الحنفی (م ۳۷۰ھ) أحکام القرآن، تخریج: عبد السلام، محمد علی شاھین، دار الکتب العلمیة، بیروت لبنان. ۱۹۹۴ء

۱۳- خازن: علاء الدین علی بن محمد بن ابراھیم البغدادی الشافعی المعروف بالخازن (م۷۴۱ھ) لباب التاویل فی معانی التنزیل، المطبوع مع معالم التنزیل للبغوی، مطبعة التقدم العلمیة مصر ۱۳۴۹ھ، دار الکتب العلمیة، بیروت لبنان، ۱۹۹۵ء

۱۴- رازی: فخر الدین محمد بن عمر بن الحسین بن الحسن بن علی التمیمی

البکری الرازی الشافعی (م ۶۰۶ھ) مفاتیح الغیب المعروف بالتفسیر الکبیر، دار الکتب العلمیة، بیروت ۱۹۹۰ء.

۱۵- زمخشری: ابو القاسم جار الله محمود بن عمر الزمخشری (م۵۳۸ھ) الکشاف عن حقائق التنزیل و عیون الأقاویل فی وجوه التاویل، تحقیق: محمد عبد السلام شاهین، دار الکتب العلمیة، بیروت لبنان ۱۹۹۵ء

۱۶- شربینی: شمس الدین محمد بن محمد الخطیب الشربینی القاهری الشافعی (م ۹۷۷ھ) السراج المنیر فی الاعانة علی معرفة بعض معانی کلام ربنا الحکیم الخبیر، مطبع منشی نول کشور، لکھنؤ

۱۷- شوکانی: محمد بن علی بن محمد الشوکانی الصنعانی (م ۱۲۵۰ھ) فتح القدیر الجامع بین فنی الروایة والدرایة من علم التفسیر، تحقیق: احمد عبد السلام، دار الکتب العلمیة، بیروت ۱۴۱۵ھ/ ۱۹۹۴ء

۱۸- طبری: ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (م ۳۱۰ھ) جامع البیان عن تاویل آی القرانٰ، دار المعرفة بیروت، لبنان (۱۳۹۸ھ/۱۹۷۸ء) تحقیق: محمود محمد شاکر و احمد محمد شاکر، دار المعارف مصر ۱۹۶۹ء (ابتدائی سوله جلدیں)

۱۹- قرطبی: ابو عبد اللّٰه محمد بن احمد بن ابی بکر بن فرح الاَنصاری القرطبی (م۶۷۱ھ) الجامع لاحکام القرآن، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان ۱۹۸۸ء

۲۰- محمد علیان: حاشیة علی تفسیر الکشاف، المطبوع بدار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء

حدیث وعلوم حدیث

۲۱- ابن ماجه: ابو عبد الله محمد بن یزید بن عبد اللّٰه بن ماجه القزوینی (م۲۷۳ھ) سنن ابن ماجه

۲۲- ابوداؤد: ابو داؤد سلیمان بن الأشعث السجستانی (م۲۷۹ھ) سنن ابی داؤد.

۲۳- أبو یوسف: القاضی ابو یوسف یعقوب بن ابراهیم بن حبیب الکوفی البغدادی

(م۱۸۲ھ) کتاب الآثار، لجنة احیاء المعارف النعمانیة، حیدرآباد الدکن ۱۳۵۵ھ، الطبعة الأولی۔

۲۴- احمد: أحمد بن حنبل الشیبانی (م۲۴۱ھ) المسند، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۹۴ء

۲۵- بخاری: ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل البخاری (م۲۵۶ھ) الجامع الصحیح المسند من احادیث رسول اللہ و سننہ و ایامہ (صحیح بخاری)

۲۶- بخاری: الأدب المفرد مع فضل اللہ الصمد للشیخ فضل اللہ الجیلانی، المطبعة السلفیة و مکتبتها، القاهرة، ۱۳۷۸ھ۔

۲۷- بیهقی: ابو بکر احمد بن الحسین بن علی الیبهقی (م۴۵۸ھ) السنن الکبریٰ، تحقیق: محمد عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان۔

۲۸- ترمذی: ابو عیسٰی محمد بن عیسٰی الترمذی (م۲۷۹ھ) جامع الترمذی

۲۹- حاکم: ابو عبد اللہ محمد بن عبد اللہ المعروف بالحاکم النیسا بوری (م۴۰۵ھ) المستدرک علی الصحیحین، تحقیق: مصطفٰی عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان۔

۳۰- خطیب: ولی الدین محمد بن عبد اللہ الخطیب التبریزی (م۷۳۷ھ) مشکٰوة المصابیح، تحقیق: سعید محمد اللحام، مطبع: دار الفکر، الطبعة الأولی، ۱۴۱۱ھ/ ۱۹۹۱ء۔

۳۱- دار قطنی: علی بن عمر الدار قطنی (م ۳۸۵ھ) السنن، مطبع فاروقی، دهلی

۳۲- دارمی: عبد اللہ بن عبد الرحمن الدارمی السمرقندی (م۲۵۵ھ) سنن الدارمی، دار الکتاب العربی، بیروت، لبنان ۱۹۸۷ھ

۳۳- ذهبی: شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذهبی (م۷۴۸ھ) تلخیص المستدرک (المطبوع مع المستدرک) دائرة المعارف النظامیة حیدر آباد الدکن، ۱۳۴۲ھ۔

۳۴- طبرانی: ابو القاسم سلیمان بن احمد بن أیوب بن مطیر اللخمی الشامی الطبرانی (م۳۶۰ھ) المعجم الصغیر، طبع هند۔

۳۵- مالک: مالک بن أنس الأصبحی (م۱۷۹ھ) المؤطاّ.
۳۶- مسلم: ابو الحسین مسلم بن حجاج القشیری النیسا بوری (م ۲۶۱ھ)، صحیح مسلم
۳۷- منذری: زکی الدین عبد العظیم بن عبد القوی المنذری (م۶۵۶ھ) الترغیب والترهیب من الحدیث الشریف، تحقیق: ابراهیم شمس الدین، طبع بیروت لبنان، ۱۹۹۶ء.
۳۸- نسائی: ابو عبد الرحمن احمد بن شعیب بن علی النسائی (م۳۰۳ھ) سنن النسائی.

شروح حدیث

۳۹- ابن الترکمانی: علاء الدین، الجوهر النقی علی السنن الکبری للبیهقی، علی هامش السنن الکبری المطبوع بدائرة المعارف العثمانیة، حیدرآباد الدکن، ۱۳۵۵ھ.
۴۰- ابن حجر: الحافظ شهاب الدین ابو الفضل احمد بن علی بن حجر العسقلانی (م۸۵۲ھ) فتح الباری بشرح صحیح البخاری، تحقیق:عبد العزیز بن عبد الله بن باز، دار الفکر للطباعة والنشر و التوزیع، بیروت، لبنان، ۱۹۹۳ء.
۴۱- البانی: محمد ناصر الدین الالبانی (م۱۴۲۰ھ) سلسلة الأحادیث الصحیحة و شیء من فقهها و فوائدها مکتبة المعارف للنشر والتوزیع، الریاض. ۱۴۱۵ھ/۱۹۹۵ء.
۴۲- البانی: سلسلة الأحادیث الضعیفة والموضوعة و أثرها السیء فی الأمة، المکتب الاسلامی، بیروت،لبنان، ۱۴۰۵ھ/۱۹۸۵ء
۴۳- جیلانی: فضل الله الجیلانی (م ھ) فضل الله الصمد فی توضیح الأدب المفرد، المطبعة السلفیة القاهرة، ۱۳۷۸ھ
۴۴- خطیب: ابو بکر احمد بن علی بن ثابت الخطیب البغدادی (م ۴۶۳ھ) الکفایة فی علم الروایة، دائرة المعارف العثمانیة، حیدر آباد الدکن، ۱۳۵۷ھ

۴۵- دهلوی: الشیخ عبد الحق بن سیف الدین المُحدث الدهلوی (م ۱۰۵۲ھ) أشعة اللمعات شرح مشکٰوة (فارسی) مطبع نامی منشی تیج کمار، لکھنؤ، ۱۹۶۳ء

۴۶- سهارن فور: الشیخ خلیل احمد بن مجید علی الأنصاری السهارن فوری (م۱۳۴۶ھ) بذل المَجهود فی حل أبی داؤد. دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان.

۴۷- طحاوی: ابو جعفر احمد بن محمد سلامة بن سلمة الطحاوی الأزدی المصری الحنفی (م۳۲۱ھ) مشکل الأثار، دائرة المعارف النظامیة، حیدر آباد الدکن، ۱۳۳۳ھ

۴۸- عظیم آبادی: ابو الطیب محمد أشرف بن أمیر بن علی بن حیدر الصدیقی العظیم آبادی (م بعد ۱۳۱۰ھ) عون المعبود شرح سنن أبی داؤد، مطبع انصاری دهلی، ۱۳۲۳ھ

۴۹- مناوی: محمد المدعو بعبد الرؤف المناوی (م۱۰۳۱ھ) التیسیر بشرح الجامع الصغیر، دار الطباعة العامرة مصر، ۱۳۸۲ھ

۵۰- نووی: محی الدین ابو زکریا یحیٰ بن شرف النووی الدمشقی الشافعی (م۶۷۷ھ) شرح صحیح مسلم، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء

سیرت نبوی و سیرت صحابہ وصحابیات

۵۱-ابن اثیر: عز الدین ابو الحسن علی بن محمد بن الأثیر الجزری (م۶۳۰ھ) أسد الغابة فی معرفة الصحابة، تحقیق: الشیخ علی محمد معوض وغیره، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان ۱۹۹۴ء، دار الشعب القاهرة، ۱۳۹۰ھ/۱۹۷۰.

۵۲- ابن حجر: أحمد بن علی بن حجر العسقلانی (م۸۵۲ھ) الاِصابة فی تمییز الصحابة، تحقیق: الشیخ عادل احمد عبد الموجود وغیره، دارالکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ۱۹۹۵ء

۵۳- ابن سعد: ابو عبد الله محمد بن سعد بن منیع الزهری (م۲۳۰ھ) الطبقات الکبریٰ، دار صادر، بیروت، لبنان.

۵۴- ابن عبد البر: ابو عمر یوسف بن عبد الله بن محمد بن عبد البر القرطبی المالکی (م۴۶۳ھ) الاستیعاب فی معرفة الأصحاب، تحقیق: الشیخ علی محمد معوض وغیرہ، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان ۱۹۹۵ء۔

۵۵- ابن قیم: شمس الدین ابو عبد الله محمد بن أبی بکر بن القیم الحنبلی الدمشقی (م۷۵۱ھ) زاد المعاد فی ھدی خیر العباد، تحقیق: شعیب الأرناوؤط، عبد القادر الأرناوؤط، مؤسسة الرسالة، بیروت، لبنان ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ھ، الطبعة/ ۱۵

۵۶- ابن ھشام: ابو محمد عبد الملک بن ھشام (م۲۱۸ھ) السیرة النبویة، تحقیق: مصطفی السقا وغیرہ، دار احیاء التراث العربی، بیروت، لبنان، ۱۹۹۴ء۔

۵۷- حلبی: ابو الفرج نور الدین علی بن برھان الدین ابراھیم بن احمد الحلبی (م۱۰۴۴ھ) انسان العیون فی سیرة الأمین المامون المعروف بالسیرة الحلبیة۔

۵۸- طبری: ابو العباس محب الدین احمد بن عبد الله بن محمد الطبری (۶۹۴ھ)۔ الدر الثمین فی مناقب أمھات المؤمنین۔

اسماء الرجال

۵۹- ابن حجر: أحمد بن علی بن حجر العسقلانی (م۸۵۲ھ) تھذیب التھذیب، تحقیق: مصطفٰی عبد القادر عطا، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان۔ ۱۹۹۴ء۔

۶۰- ابن حجر: لسان المیزان، دائرة المعارف النظامیة، حیدر آباد الدکن، ۱۳۲۹-۱۳۳۱ھ۔

۶۱- ذھبی: شمس الدین محمد بن احمد بن عثمان الذھبی (م۷۴۸ھ) تذکرة الحفاظ، دائرة المعارف النظامیة، حیدر آباد الدکن، ۱۳۳۳ھ

۶۲- ذھبی: میزان الاعتدال، مطبعة السعادة مصر، ۱۳۲۵ھ

تاریخ وسوانح

۶۳- ابن أثیر: عز الدین ابو الحسن علی بن محمد بن الأثیر الجزری (م۶۳۰ھ)

الکامل فی التاریخ، تحقیق: ابو الفداء عبد الله القاضی، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، الطبعة الثانیة، ۱۹۹۵ء۔
۶۴- ابن خلکان: ابو العباس، شمس الدین احمد بن محمد بن ابی بکر بن خلکان (م۶۸۱ھ) وفیات الأعیان، تحقیق: محمد محی الدین عبد الحمید، مطبعة السعادة مصر، المطبعة المیمنیة، مصر
۶۵- ابن عساکر: ابو القاسم علی بن الحسن بن عساکر الدمشقی (م۵۷۱ھ) تاریخ دمشق۔
۶۶- ابن العماد: شهاب الدین ابو الفلاّح عبد الحی احمد بن محمد بن العماد العکری الحنبلی (م۱۰۸۹ھ) شذرات الذهب فی اخبار من ذهب، تحقیق: عبد القادر الأرناؤط، محمود الأرناوؤط، دار ابن کثیر للطباعة والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان، ۱۹۸۶ء، مکتبة القدسی، القاهرة، ۱۳۵۰ھ۔
۶۷- ابن قتیبة: عبد اللّٰه بن مسلم بن قتیبة (م۲۷۶ھ) الإمامة والسیاسة، مطبع مصطفی البابی والحلبی و اولاَده، مصر، ۱۳۵۶ھ/۱۹۳۷ء
۶۸- ابن قتیبة: عیون الأخبار، المؤسسة المصریة العامة للتألیف والترجمة والطباعة والنشر، سن طباعت درج نہیں۔
۶۹- ابن کثیر: ابو الفداء عماد الدین اسماعیل بن کثیر الدمشقی (م۷۷۴ھ) البدایة والنهایة، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، الطبعة الاولٰی، ۱۹۹۴ء۔
۷۰- خضری: الشیخ محمد بن عفیفی الباجوری الخضری (م۱۳۴۵ھ)، محاضرات فی تاریخ الأُمم الإسلامیة، دار احیاء الکتب العربیة، مصر، ۱۳۴۹ھ/۱۹۳۰ء
۷۱- دهلوی: الشیخ احمد بن عبد الرحیم المعروف بالشاه ولی اللّٰه الدهلوی (م۱۱۷۶ھ) ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء، سهیل اکادمی، لاهور
۷۲- سمهودی: نور الدین ابو الحسن علی بن عبد الله بن احمد الحسینی الشافعی السمهودی (م۹۱۱ھ) وفاء الوفاء بأخبار دار المصطفٰی، مطبع...
۷۳- طبری: ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (م۳۱۰ھ) تاریخ الأُمم و الملوک،

دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، ١٩٩٧ء.

٧۴– عبد الله: عبد الله بن عبد الحكم (م۲۱۴ھ) سيرة عمر بن عبد العزيز

٧۵– نووی: ابو زكريا محى الــدين يحيى بن شـرف النووى (م٦٧٧ھ) تهذيب الأسماء واللغات، ادارة الطباعة المنيرية، مصر

فقہ، اصولِ فقہ، فتاویٰ

٧٦– ابن تيمية: تقى الدين ابو العباس احمد بن تيمية الحرّانى (م٧٢٨ھ) اقامة الدليل على ابطال التحليل، المطبوع مع المُجلد الثالث من مجموع فتاوى شيخ الاِسلام ابن تيمية، مطبعة كردستان العلمية، القاهرة، مصر، ١٣٢٨ھ

٧٧– ابن تيمية: مجموع فتاوى شيخ الاِسلام، جمع و ترتيب: عبد الرحمن بن محمد بن قاسم العاصمى، دار العربية، بيروت، لبنان ١٣٩٨ھ.

٧٨– ابن حزم: أبو محمد على بن أحمد بن سعيد بن حزم الأُندلسى (م۴۵٦ھ) اَلْمحلّى، دار الآفاق الجديدة، بيروت، لبنان

٧٩– ابن رشد: ابو الوليد محمد بن أحمد بن محمد بن أحمد بن رشد القرطبى الأُندلسى (م۵۹۵ھ) المقدمات الممهدات لبيان ما اقتضته رسوم المدونة من الأحكام الشرعيات، المطبوع مع المدونة الكبرى، المطبعة الخيرية مصر، ١٣٢۴ھ

٨٠– ابن عابدين: محمد أمين بن عمر بن عبد العزيز عابدين الدمشقى (م١٢۵٢ھ) ردّ المُحتار مع الدُّرّ المختار، تحقيق: عادل احمد عبد الموجود و الشيخ علىٰ محمد معوض، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، ١٩٩۴ء.

٨١– ابن قيم: شمس الدين ابو عبد الله محمد بن أبى بكر بن القيم الحنبلى الدمشقى (م ٧۵١ھ) اعلام الموقعين عن رب العلمين، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان ١٩٩٦ء

٨٢–ابن قيم: الطرق الحكمية فى السياسة الشرعية، مطبعة الآداب والمؤيد مصر، ١٣١٧ھ

۸۳- ابن نجیم: الشیخ زین الدین بن ابراهیم بن محمد المعروف بابن نجیم (م۹۷۰ھ) الأشباه والنظائر
۸۴- ابن نجیم: البحر الرائق، دار الکتب العربیة الکبریٰ، مصر.
۸۵- ابن الهمام: کمال الـدین محمد بن عبد الواحـد بن الهمـام السیواسی ثم السکندری الحنفی (م۸۶۱ھ) فتح القدیر للعاجز الفقیر، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان ۱۹۹۵ھ.
المطبعة الکبریٰ الأمیریة، بولاَق مصر، ۱۳۱۵ھ.
۸۶- بابرتی: أکمل الدین محمد بن محمود البابرتی (م۱۳۸۴ھ) العنایة علی الهدایة، المطبوع علی حاشیة فتح القدیر.
۸۷- الجزیری: عبد الرحمن الجزیری، الفقه علی المذاهب الأربعة، مطبعة الاِستقامة، القاهرة.
۸۸- حصکفی: علاء الدین محمد بن علی بن محمد الحصنی الحصکفی (م۱۰۸۸ھ) الدر المختار فی شرح تنویر الأبصار، المطبوع مع ردّ المُحتار، مطبع: دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، الطبعة الاولیٰ، ۱۹۹۴ء.
۸۹- حموی: احمد بن محمد الحنفی الحموی، غمز عیون البصائر شرح کتاب الأشباه والنظائر لابن نجیم، دار الکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ۱۹۸۵ء.
۹۰- دمشقی: علاء الدین ابو الحسن علی الـدمشقی، الاِختیـارات العلمیة فی اختیارات شیخ الاِسلام ابن تیمیة، المطبوع مع المُجلد الرابع من مجموع فتاویٰ شیخ الاِسلام ابن تیمیة، مطبعة کردستان العلمیة القاهرة، مصر، ۱۳۲۹ھ
۹۱- سیوطی: الحافظ ابو بکر جلال الدین عبـد الرحمن بن ابی بکر السیوطی (م۹۱۱ھ) الأشباه والنظائر فی قواعد و فروع فقه الشافعیة، دارالکتب العلمیة، بیروت، لبنان، ۱۹۸۳ء.
۹۲- شافعی: ابو عبد اللّٰه محمد بن ادریس الشافعی (م۲۰۴ھ) کتاب الأم، المطبعة الکبریٰ الأمیریة، بولاق، مصر، ۱۳۲۵ھ.

۹۳– قاضی خان: فخر الدین حسن بن منصور بن ابی القاسم محمود بن عبد العزیز بقاضی خان الاوزجندی الفرغانی (م۵۹۲ھ) فتاویٰ المطبوع علی الفتاوی عالمگیریة، المطبعة الکبریٰ الامیریة، مصر (۱۳۱۰ھ)

۹۴– کاسانی: علاء الدین أبوبکر بن مسعود الکاسانی الحنفی (م۵۸۷ھ) بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع، دار الفکر للطباعة والنشر والتوزیع، بیروت، لبنان.

۹۵– مالک: الإمام مالک بن انس الاصبحی (م۱۷۹ھ) المدونة الکبریٰ بروایة سحنون بن سعید التنوخی، المطبعة الخیریة، مصر، ۱۳۲۴ھ، الطبعة الأولیٰ.

۹۶– مرغینانی: برهان الدین أبو الحسن علی بن ابی بکر المرغینانی (م۵۹۳ھ) هدایة شرح بدایة المبتدی (مختصر القدوری) مع فتح القدیر، المطبعة الکبری الأمیریة، مصر،
دار الکتب العربیة، بیروت، لبنان ۱۹۹۴ء.

عقائد، فلسفہ، فرق

۹۷– ابن تیمیة: تقی الدین ابو العباس أحمد بن تیمیة الحرانی (م۷۲۸ھ) منهاج السنة النبویة فی الرد علی الشیعة والقدریة، المطبعة الکبریٰ الأمیریة، بولاَق، مصر، ۱۳۲۱ھ الطبعة الأولیٰ

۹۸– ابن الحاج: ابو عبد الله محمد بن محمد بن محمد بن الحاج العبدری الفاسی المکی (م۷۳۷ھ) المدخل الی تنمیة الأعمال بتحسین النیات، المطبعة الأمیریة، مصر ۱۳۴۸ھ.

۹۹– ابن حزم: ابو محمد علی بن أحمد بن سعید بن حزم الأندلسی (م۴۵۶ھ) الفِصَل فی الملل والأهواء والنحل، المطبعة الأدبیة، مصر، ۱۳۱۷ھ، الطبعة الاولیٰ.

۱۰۰– تفتازانی: سعد الدین مسعود بن عمر بن عبد الله التفتازانی (م۷۹۳ھ)، شرح مقاصد الطالبین، دار الطباعة العامرة، ترکی، ۱۲۷۷ھ.

۱۰۱– جرجانی: علی بن محمد بن علی المعروف بالشریف الجرجانی (م۸۱۶ھ) شرح مواقف الایجی مطبعة السعادة مصر، ۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء

لغت

۱۰۲– ابن منظور: ابو الفضل جمال الدین محمد بن مکرم بن منظور الافریقی المصری (م ۷۱۱ھ) دار بیروت للطباعة والنشر، بیروت،لبنان، ۱۳۷۴ھ/ ۱۹۵۵ء

ادب

۱۰۳– ابن عبد ربّہ: ابو عمر أحمد بن محمد بن عبد ربه الأندلسی (۳۲۸ھ) العقد الفرید، مطبع لجنة التألیف والترجمة والنشر، القاهرة، ۱۳۸۸ھ/ ۱۹۶۸ء.

۱۰۴– جاحظ: ابو عثمان عمر وبن بحر بن محبوب الکتابی اللیثی الشهیر الجاحظ (م۲۵۵ھ) البیـان و التبیـین، تحقیق و شـــرح: حسن السندوبی، المکتبة التجاریـــة الکبریٰ مصر، ۱۳۶۶ھ/ ۱۹۴۷ء

متفرقات

۱۰۵– ابن الجوزی: ابو الفرج جمال الدین عبد الرحمن بن علی بن محمد الجوزی القرشی البغدادی (م۵۹۷ھ)، نقد العلم والعلماء او تلبیس ابلیس، مطبعة السعادة، مصر، ۱۳۴۰ھ، الطبعة الأولیٰ.

۱۰۶– عظیم آبادی: الشیخ شمس الحق العظیم آبادی، عقود الجمان فی جواز تعلیم الکتابة للنسوان. (یہ رسالہ فارسی میں ہے)

۱۰۷– اکبر شاہ نجیب آبادی: نظام سلطنت.

۱۰۸– الگزس کیرل: انسان نا معلوم (Man the Unknown)

۱۰۹– انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا

۱۱۰– پٹریم سارو گن: امریکی جنسی انقلاب

۱۱۱– لیمبروس گنا: روح نسوانیت

۱۱۲– لیکی: تاریخ اخلاق یورپ

۱۱۳– مارسل سیکوٹ: عصمت فروشی

۱۱۴– مل (Mill): محکومیت نسواں

۱۱۵– منو سمرتی

۱۱۶– ھیو لاک ایلس: مرد و عورت

مصنف کی کتابیں، جن کا کتاب میں حوالہ دیا گیا ہے

۱۱۷– اسلام کا عائلی نظام

۱۱۸– تحقیقاتِ اسلامی کے فقہی مباحث

۱۱۹– صحت و مرض اور اسلامی تعلیمات

۱۲۰– عورت اور اسلام

۱۲۱– مسلمان خواتین کی ذمے داریاں

۱۲۲– مسلمان عورت کے حقوق اور ان پر اعتراضات کا جائزہ

